تذکرۂ معاصرین

۳

مالک رام

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

تذکرۂ معاصرین

تذکرۂ معاصرین

۱۹۷۴ء اور ۱۹۷۵ء میں وفات پانے والے

ادبار کے حالات اور کلام

۳

مالک رام

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر، نئی دلی 110025

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار، دلی 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ، بمبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ 202001

پہلی بار جون ۱۹۷۸ء قیمت -/۲۲

(جمال پرنٹنگ پریس دہلی)

ڈاکٹر سیّد عابد حسین

کی نذر

نشانِ سجدۂ من نیز ہم بر آستاں بینی

تعارف

تذکرۂ معاصرین کی اس جلد میں ان ۵۶ ادیبوں، شاعروں، صحافیوں کے حالات شائع کیے جا رہے ہیں، جو ۱۹۷۴ء اور ۱۹۷۵ء کے دو برسوں میں ہم سے جدا ہوئے۔ وہ اس جگہ گئے، جہاں ہم میں سے ہر ایک آگے پیچھے پہنچنے والا ہے۔ اِنّا لِلّٰہ وَ اِنّا اِلَیہِ راجِعُون۔ دیکھنا یہ ہے کہ انھوں نے اپنی حیاتِ مستعار میں کیا کیا! قدرت نے انھیں جو صلاحیتیں ودیعت کی تھیں، کیا انھوں نے ان کا اپنی بساط بھر ٹھیک استعمال کیا! کیا انھوں نے اپنے دل دماغ کی خداداد قوتوں کو اپنے ہموطنوں اور بنی نوعِ انسان کی بھلائی اور بہتری کی راہ میں صرف کیا! کسی زندگی کی کامیابی اور ناکامی کا یہی معیار رہا ہے، اور یہی آیندہ بھی رہیگا۔ اگر ان سوالات کا جواب اثبات میں ہے، تو بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے امانت میں خیانت نہیں کی، اور کم و بیش کامیاب زندگی گزاری۔

ان میں سے بعض اصحاب اس پایے کے تھے کہ کوئی مؤرخِ ادبِ اردو انھیں نظر انداز نہیں کر سکتا۔ انھوں نے اپنے پیچھے ایسے اَمِٹ آثار چھوڑے ہیں، اور اپنے بعد کے آنے والوں کی راہ اس حد تک ہموار کر دی ہے کہ اردو کا ہر ایک طالب علم ان کا ممنون رہیگا۔

حالات کی فراہمی میں طریقہ، کار وہی رہا ہے، جس کی طرف اس سے پہلے اشارہ کر چکا ہوں۔ جن اصحاب سے میرے طویل زمانے تک ذاتی تعلقات رہے، یا جن کے لواحقین اور متعلقین نے معلومات مہیا کرنے میں مستعدی دکھائی، ان کے حالات بھی مفصل اور بڑی حد تک مکمل ہیں؛ دوسروں کے نسبتاً تشنہ ہیں، اگرچہ یہاں بھی بنیادی اور اہم کوائف بہرحال محفوظ ہو گئے ہیں۔ موجودہ حالات میں ان سے زیادہ معلومات حاصل کرنا دشوار تھا۔

یہاں ایک اور بات کی طرف اشارہ کرنا بےمحل نہیں ہوگا:
بعض اوقات ایک صاحب کے ترجمے میں، کسی دوسرے شخص کے حالات بھی جمع ہو گئے ہیں۔ ممکن ہے، کسی کے نزدیک یہ غیر ضروری ہو؛ میں یہ بات اہم خیال کرتا ہوں کہ حتی الامکان

ہر ایک ادیب یا شاعر کے خاندان کا حال معلوم ہونا چاہیے، تاکہ ہم دیکھ سکیں کہ اس کا پس منظر کیا تھا، وہ کس ماحول میں پیدا ہوا، بڑا ہوا۔ پھر اس کا استاد کون تھا، جس سے ہم اس کی تعلیم و تربیت کا کچھ اندازہ کر سکیں۔ اس سے ہمارے لیے یہ فیصلہ کرنا آسان ہو جائیگا کہ اس کی کونسی صلاحیت موروثی تھی اور کونسی اس کے اپنے زورِ بازو کا نتیجہ۔ اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ان تفصیلات میں جانے کا باعث ہوئی ہے۔ اپنی جستجو اور پوچھ گچھ کے دوران میں میرے سامنے کئی ایسی باتیں آجاتی ہیں، جن سے متعلق کسی نے کچھ نہیں لکھا۔ چونکہ حسنِ اتفاق سے یہ معلومات حاصل ہو گئی ہیں، چاہتا ہوں کہ وہ محفوظ ہو جائیں، ورنہ بعد کو کوئی اتنا بتانے والا بھی نہیں ہوگا اور وہ کاوشِ گردۂ خفا میں چلی جائینگی، میرے خیال میں یہ علم کا ناقابلِ تلافی نقصان ہوگا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کل کسی کو ان کی ضرورت نہیں پیش آئیگی۔

جب بھی ان اموات کی فہرست اور ان کے حالات پر نظر ڈالتا ہوں، تو رہ رہ کے ایک بات ذہن میں آتی ہے کہ سفینے بھر رہے ہیں اور سینے خالی ہوتے جا رہے ہیں۔ ہر روز بیشمار نئی کتابیں شائع ہو رہی ہیں، لیکن علم کم ہو رہا ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ مستقبل کی طرف سے مایوس ہو جانا، قوانینِ فطرت کی صداقت سے انکار کا مرادف ہوگا، لیکن اتنا تو ہر کوئی محسوس کر سکتا ہے کہ ہماری نئی نسل کو بزرگوں کی جلائی ہوئی شمعِ علم و معرفت روشن رکھنے کے لیے بہت کوشش کرنا پڑیگی۔

آخر میں ایک مرتبہ پھر ان احباب کا شکریہ ادا کرتا ہوں، جنھوں نے حالات کی فراہمی میں مدد کی، کلام کے مجموعے مہیا کیے، یا دوسری مطبوعات مستعار دیں۔ میں ان سب کا شکریہ فرداً فرداً پہلے بھی ادا کر چکا ہوں، اب پھر مجموعی طور پر اس کا اعادہ کرتا ہوں۔

فجزاہم اللہ احسن الجزاء

نئی دلّی
۲۰ اپریل ۱۹۷۸ء

مالک رام

فہرست

بہ ترتیبِ حروفِ تہجی

فہرست

بترتیب تاریخ وفات

ثاقب عظیم آبادی، سیّد حسن رضا

پٹنے کے علمی و ادبی حلقے کی معروف شخصیت تھے۔ ان کے والد منشی سیّد علی حسن عظیم آبادی وہاں کے مشہور اور ماہر خوشنویس تھے اور شہر میں "بڑے منشی صاحب" کے لقب سے معروف تھے۔ وہ اس فن میں باقر عظیم آبادی کے شاگرد تھے۔

ثاقب کی ولادت ۱۹۰۵ء میں ہوئی، ابتدائی تعلیم نجی طور پر گھر کے بزرگوں سے پائی۔ اس کے بعد شہر کے مسلّمہ استاد عالم مولانا نالاڈلے صاحب سے منطق، فلسفہ، طب، فقہ، حدیث وغیرہ حاصل کیے۔ ۱۹۲۶ء میں مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ سے "عالم" کی سند لی اور ۱۹۲۷ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے "فاضل ادب" کی۔ پھر ۱۹۳۰ء میں انگریزی کے دسویں درجہ کا امتحان بھی پاس کر لیا، حال آنکہ وہ خود اس زمانے میں سرکاری اسکول، پٹنہ میں عربی اور فارسی کے معلم رہتے۔ مختلف اسکولوں میں کام کرنے کے بعد بالآخر ۱۹۶۵ء میں پنشن پر سبکدوش ہوئے۔

اس صدی کے اوائل میں پٹنہ سٹی، جہاں ان کی سکونت تھی، علم و ادب اور شعر و سخن کا مرکز تھا۔ شاد عظیم آبادی (ف: جنوری ۱۹۲۷ء) عبدالحمید پریشان (ف: اگست ۱۹۰۵ء) تمنا عمادی (ف: نومبر ۱۹۷۲ء) اور کئی دوسرے حضرات اسی نواح کے رہنے والے تھے۔ غرض پوری فضا شعر و نغمہ سے معمور تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ثاقب بھی بچپن سے شعر گوئی کی طرف مائل ہو گئے۔ آغاز میں انھوں نے میر باقر عظیم آبادی اور ان کے شاگرد رشید وحیدالدین وحید الٰہ آبادی سے مشورہ کیا۔ فنِ خطاطی اور خوشنویسی میں بھی میر باقر ہی کے شاگرد تھے ان دونوں سے اپنے استفادے کا ذکر ایک مقطع میں کرتے ہیں:

یہی ہے راہنمائی سخن کی، اے ثاقب! جو کھینچنا ہو، تو نقشِ وحید و باقر کھینچ

ایک اور مقطع ہے:

بے فیضِ حضرتِ باقرؔ سے اتباعِ وحید
کہ جن کے رنگ کا ثاقبؔ جواب ہو نہ سکا

افسوس کہ ان کا شعری مجموعہ ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا۔ اسے ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے سید سعید رضا گہر عظیم آبادی نے "سرمایۂ نشاط" کے عنوان سے مرتب کر کے شائع کیا (پٹنہ: ۱۹۷۷ء) دو نثری کتابیں "عظیم آبادی کی گزشتہ ادبی محفلیں" اور "یادگارِ عشق" (سوانحِ عمری شاہ رکن الدین عشق دہلوی ثم عظیم آبادی) ان کی حیات میں چھپ گئی تھیں۔ پہلی کتاب پر بہار ایجوکیشن بورڈ نے ایک ہزار روپیہ انعام بھی دیا۔

ان کے گیارہ اولادیں ہوئیں لیکن بد قسمتی سے نو بچے ان کی زندگی ہی میں داغِ مفارقت دے گئے۔ ان پے در پے حادثات نے ان کا دماغی توازن مختل کر دیا۔ بہت دن کے علاج معالجے کے بعد یہ توازن بحال ہوا تھا کہ اپنے چل چلاؤ کا زمانہ آگیا۔ ۱۹ جنوری ۱۹۷۴ء کو دن کے دس بجے پٹنے میں رحلت کی۔ اِنّا للہ و اِنّا الیہ راجعون۔ محلہ "شاہ کی املی" میں مغل مسجد کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

حضرت قتیل داناپوری نے تاریخِ وفات کہی:

ایں غلط ثابت آمدہ، صد حیف	قطبِ جیند نہ اے قتیلؔ از جائے
بہرِ تاریخِ او، ندا آمد	"آہ ثاقبؔ، صد آہ، حسرت ہائے"

(۱۳۹۳)

سید محمد یوسف کے طویل قطعۂ تاریخ کا آخری شعر ہے:

رحلت کا سن ہے بے سرِ آہ	"ثاقب سوئے جنت روانہ"

(۱۳۹۴-۱=۱۳۹۳)

ان کا کلام پختہ اور بے عیب ہے۔ مضمون آفرینی کی کوشش نمایاں ہے۔ غزل کے

علاوہ نظم بھی کہتے تھے۔ چنانچہ مجموعے میں چند نظمیں بھی شامل ہیں۔ نمونہ کے طور پر چند شعر ملاحظہ ہوں:

کل کہتے ہیں وہ ہر دن، کل آج نہیں ہوتا
ہے وعدۂ فردا بھی فردائے قیامت کا
یہ رات مصیبت کی ٹالے بھی نہیں ٹلتی
کٹ جاتا ہے باتوں میں، دن عیش و مسرت کا

نہ دیکھا مجھے آنکھ اٹھا کر، تو کیا غم
شرف تو ملا بزم کی حاضری کا

ٹھہری جو دیر کعبہ میں تھی، پستیِ نگاہ
منزل نہیں تھی وہ، جسے منزل بنا دیا

گرتے ہیں زرد پتے کہ شاخیں ہوں سبز پھر
پیغام دے رہی ہے خزاں بھی بہار کا

اپنا بھی آشیانہ کبھی شاخ گل پہ تھا
میں نے بھی لطف اٹھایا ہے فصل بہار کا

مرے گناہ ہیں پھر بھی شمار کے اندر
ترے کرم کا تو کوئی حساب ہو نہ سکا

وقت یہ کیسا آگیا، نام خلوص مٹ گیا
غیر تو غیر ہی ہوئے، دیتے ہیں آشنا فریب

ہیں مسحور کیوں اپنے جلووں سے خود
چلے کیا ہیں آئینہ خانے سے آپ

کہتے ہو، کیوں نظر آتا ہوں پریشان بہت
جان کر تم تو بنا کرتے ہو انجان بہت

فریب دینے لگی انتظار کی آہٹ
سمجھ رہا ہوں، جسے پائے یار کی آہٹ

ہے کاروان عجب سعی کیا سبک رفتار
کہ پیدلوں سے ملی ہے سوار کی آہٹ

چلی ہی آتی ہے پیری جواب دبے پاؤں
ہے یہ عیبیوں کو یہ روز شمار کی آہٹ

ساقی! ترے کرم کی حلاوت بھی ہے عجیب
کل جو شراب تلخ تھی، وہ انگبیں ہے آج

تقدیر بگڑتی ہے تو ساحل پہ ہے طوفاں
اللہ نگہباں ہے، تو طوفاں بھی ہے ساحل

عرش بریں سے روز پلٹتی ہے نامراد — ہے شکوہ سنج ہم سے فغاں اور فغاں سے ہم

زندگی ہو گئی کس طرح بسر، یاد نہیں — روز و شب یاد نہیں، شام و سحر یاد نہیں
لٹ گیا کیسے محبت میں یہ گھر، یاد نہیں — کیسے برباد ہوئے قلب و جگر، یاد نہیں

جب چاک گریباں ہو کلی آتی ہے خوشبو — تخریب کے پردے میں ہے تعمیر کا پہلو

زمین و آسمان کا فرق ان دونوں میں ہے پھر بھی
غم جاناں سے ہوتا ہے، غم دوراں کا اندازہ

کسی کا ایک دروازہ خدا جب بند کرتا ہے
اسی کے فضل سے کھلتا ہے کوئی اور دروازہ

دنیا کے مال و زر کی حقیقت ہی کیا رہے — رشتہ جو استوار ہو ثاقب! خدا کے ساتھ

خدا کا شکر ہے وحشت نے رکھ لی آبرو دل کی
دگرنہ ہم زمانے بھر کو سمجھانے کہاں جاتے

فرمائیے، کس کس سے کوئی دل کو بچائے — انداز سے، شوخی سے، تبسم سے، حیا سے
جب کچھ نہ رہا جامہ دری کو، تو یہ سوجھی — دو چار گرہ کم کر دوں زاہد کی عبا سے
ہے شمع بجھی خاموش، پتنگوں کو جلا کر — سچ ہے کہ برے کام کا انجام برا ہے
جس حال میں وہ رکھے، اسی حال میں خوش ہو — بندہ وہی اچھا ہے، جو راضی بہ رضا ہے

داغ عاشقی، چشم تمنا، قلب وارفتہ — انھیں لفظوں سے ہم شرح کتاب زندگی سمجھے
بہار گلشن ہستی خزاں کے ساتھ ہے ثاقب! — جو دیکھے گریۂ شبنم، وہ پھولوں کی ہنسی سمجھے

دبے پاؤں نسیم آ کے کہہ جاتی ہے کچھ سب سے
چمن کی جو کلی ہے، راز داں معلوم ہوتی ہے

چبھا تلوے میں کانٹا، اور خلش دل میں ہوئی پیدا
کہاں تکلیف پہنچی ہے، کہاں معلوم ہوتی ہے

نہ کیجے اور کوئی ذکر، باتیں ہوں تو ان کی ہوں
یہی اک داستاں سنیے، یہی اک داستاں کہیے

رسوا ہوئے تھے کل تو بہت، اے خرابِ دل!
پھر اس گلی میں جانے کو تیار کیوں ہوئے؟

دیکھتے ہیں جو تمہارے گیسو و رخ کی بہار
صبح ان کی صبح ہے اور شام ان کی شام ہے

کیا بتاؤں آپ کو تاریکیِ روزِ فراق
صبح سے معلوم ہوتا تھا کہ وقتِ شام ہے

ماتھے کا بل سمجھتے ہیں، جس پیچ و تاب کو
زینت ہے گیسوؤں کی اسی پیچ و تاب سے

اکمل جالندھری، رام پرتاپ

اگرچہ ان کا خاندان مشرقی پنجاب کے شہر جالندھر کا رہنے والا تھا، مگر چونکہ ان کے والد پنڈت کھڑگ جیت رام (ف: اگست ۱۹۳۹ء) لکشمی جنگ فیکٹری، کھنہ (ضلع کرنال) میں ملازم تھے، اور اسی سلسلے میں یہاں مقیم تھے۔ اس لیے رام پرتاپ کی ولادت یہیں کھنہ میں ۳ فروری ۱۹۰۷ء کو ہوئی۔

ابتدائی تعلیم کے بعد ڈی اے، وی کالج، لاہور میں داخلہ لے لیا، لیکن انٹر کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا اور انھوں نے اکتوبر ۱۹۲۷ء میں ریلوے کے محکمے میں ملازمت اختیار کر لی۔ یہیں شعرگوئی کے شوق کو فروغ ہوا جس کی طرف رجحان طالبعلمی کے زمانے ہی سے نمایاں تھا۔ ان کے ابتدائی اسکول میں پنڈت یوگ راج نظر سوہانوی بھی مدرس تھے نظر اچھے شاعر تھے۔ وہ زیادہ تر مذہبی مضامین لکھتے تھے؛ ان کا گیتا کا منظوم ترجمہ چھپ چکا ہے۔ اسی باعث مشہور سیاسی لیڈر پنڈت مدن موہن مالویہ ان کے بڑے مداح تھے۔ نظر نے نوجوان رام پرتاپ کا میلانِ طبع دیکھ کر ان کی حوصلہ افزائی کی، اکمل تخلص بھی انھیں کا عطیہ تھا۔

ملازمت کے بعد باقاعدہ شعر کہنے کا موقع ملا، تو انھوں نے رضا علی خان رضا اٹاوی سے اصلاح لینا شروع کی جو انھیں کی طرح ریلوے ہی میں ملازم تھے۔ حسن اتفاق سے اس زمانے میں، ریلوے کے اس دفتر میں کئی شاعروں کا اجتماع ہو گیا تھا۔ مثلاً عبدالخالق نہال سیوہاروی بھی یہیں تھے اور اکمل سے ان کی گاڑھی چھنتی تھی۔ نہال بہت اچھا کہتے تھے، اور ان کا سائل دہلوی کے ممتاز شاگردوں میں شمار ہوتا تھا۔ وہ بادلِ ناخواستہ تقسیمِ ملک کے بعد پاکستان گئے تھے اور وہیں کراچی میں جنوری ۱۹۵۲ء میں ان کا انتقال

ہوا۔ منور لکھنوی بھی اس زمانے میں یہیں تھے۔
پوری عمر ریلوے کی ملازمت میں گزری۔ یہیں سے ۴ فروری ۱۹۶۷ء کو سبکدوش ہوئے۔
اس کے بعد بسر اوقات کے لیے دلّی کی ایک ٹرانسپورٹ کمپنی میں ملازم ہو گئے تھے۔
انوار ۲۰ جنوری ۱۹۷۴ء کو انتقال ہوا اور ۲۱ جنوری کو جسدِ خاکی نذرِ آتش کر دیا گیا۔
اولاد میں صرف ایک بیٹا رگھو بیر نندن چھوڑا۔ یہ سیکنڈری فیکٹری میں ملازم ہیں۔
انتخابِ کلام "بوئے گل" ان کی زندگی میں چھپ گیا تھا (دلّی ۱۹۵۶ء) وہ غالب کے شعر کا تلازمہ پورا کرنے کو دو اور مجموعے "نالۂ دل" اور "دودِ چراغ" بھی شائع کرنا چاہتے تھے، لیکن یہ آرزو پوری نہ ہو سکی، حال آں کہ دونوں مرتب ہو چکے تھے۔
ان کے کلام میں کلاسیکی رچاؤ اور صحتِ زبان کے ساتھ جدید رجحانات کا پتا بھی چلتا ہے۔ وہ فطری شاعر تھے اور اگر زمانہ ساز گار رہتا، تو یقیناً اس سے کہیں زیادہ شہرت حاصل کرتے جو انھیں نصیب ہوئی۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

جب آشیاں ہی اپنا چمن زار میں نہیں — کیا شاخ سے غرض ہمیں مطلب ثمر سے کیا
میں ناشناسِ عظمتِ دیر و حرم نہیں — نسبت انھیں مگر ہے ترے سنگِ در سے کیا

ہمیں کیا، گر خزاں کا دور ہو یا موسمِ گل ہو
خزاں کا غم تو ان کو ہو، جو کھیلے ہوں بہاروں سے

اب اس پہ بھی کوئی بھٹکے، تو کچھ علاج نہیں — چراغِ راہ تری رہگزر ہوئی تو ہے
کرم نہیں، نہ سہی، میں کرم سے درگزرا — یہ کیا ستم پہ بھی مائلِ ستم شعار نہیں

طریقِ عشق میں جب سرفروشی شرطِ اول ہے
تو پھر عشاق کا منزل بمنزل امتحاں کیوں ہو!

یہ مانا نغمہ زن ہو تم، مرے سازِ تصور میں
مگر سازِ تصور کا بھی پردہ درمیاں کیوں ہو!

ہزار داغ ہیں، اور ان میں دل ہے یوں جیسے
کئی جنازوں میں اک سوگوار کا عالم

گزر جاتا ہے اب دامن بچا کر ہر بشر مجھ سے　　زمانہ پھر گیا، کیا پھیر لی تم نے نظر مجھ سے
مرے دم سے جہانِ زندگی میں زندگی سی ہے　　خدا شاہد کہ ہے، یہ رونقِ شام و سحر مجھ سے

زبان و دل میں یہ کیا تفرقہ ڈالا محبت نے　　کہ دل کچھ اور کہتا ہے، زباں کچھ اور کہتی ہے

کچھ تم پہ نہیں موقوف، کوئی دنیا میں ہمارا ہو نہ سکا
تم ہم سے کنارا کر بیٹھے، ہم سے تو کنارا ہو نہ سکا

جمالِ انگڑائیاں لینے لگا ہے　　ہمارا دل ہمارا اور کب تک!

بجز اس کے کیا ہیں یہ اشک اور آہیں　　وہ آنکھوں کا قصہ، یہ غم کی کہانی
دوش پر بکھری ہوئی زلفِ پریشاں دیکھیے　　پھر ہوئے میری پریشانی کے ساماں دیکھیے

بسنت

لیس کر دیں وہ اشہبِ لیل و نہار نے　　فطرت چلی ہے رنگِ جہاں کو نکھارنے
الٹا نقاب رُخ سے عروسِ بہار نے　　جلوہ دکھا دیا کسی رنگیں عذار نے
ہر شاخ، ہر شجر کی ادائیں بدل گئیں
پلٹا وہ رُخ فضا نے، ہوائیں بدل گئیں

ہر پھول، ہر کلی میں لطافت کا جوش ہے　　ہر نخلِ گلستانِ جہاں سبز پوش ہے
صحنِ چمن میں بادِ صبا میفروش ہے　　غرقِ مئے نشاط ہے، جس کو بھی ہوش ہے
ہر سمت فیضِ ساقیِ محبوب عام ہے
ہر چشمِ مست بادۂ گلگوں کا جام ہے

صہبائے رنگ و بو میں ہے ڈوبا ہوا جہاں　　موجِ ہوا میں کیف مئے ناب ہے رواں
ایسی بہار خُلد میں رنگینیاں کہاں　　جو گلستانِ ہند کے پھولوں میں ہیں نہاں
ہر ذرّہ آفتاب ہے اس سرزمین کا
کیا حسن لاجواب ہے اس نازنین کا

دنیا نہیں، یہ گلشنِ جنّت ہے ہو بہو　　ہر سمت ہے تلاطمِ امواجِ رنگ و بو

ہر لب پہ بسنتیوں کے ترانے ہیں چار سُو گانے لگے بسنت، جوانانِ خوش گُلو

بزمِ جہاں میں عیش و طرب کا ہجوم ہے
دیکھو جدھر، بسنت کے آنے کی دھوم ہے

یہ دَور ہے عجیب، سماں لاجواب ہے احباب میگسار ہیں شغلِ شراب ہے
ہر جام میں تجلّیِ صہبائے ناب ہے ہر دل بقدرِ ذوقِ طلب فیضیاب ہے

اُتنی ملی ہے مَے، جسے جتنی امنگ ہے
اس حسنِ امتیاز پہ ہر شخص دنگ ہے

ہے دیدنی جو رُخ پہ بسنتوں کے نور ہے جس ماہوش کو دیکھیے، وہ رشکِ حُور ہے
مستانہ انکھڑیوں میں وہ کیف و سرور ہے گویا نشے میں حُسن کے، خود حسن چُور ہے

ہر ایک نازنیں ہے بسنتی لباس میں
مَے جیسے زعفراں کی بھری ہو گلاس میں

جوان سندیلوی، منّی لال

۱۸۸۹ء میں سندیلہ (ضلع ہردوئی) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد گلاب رام شاہ تجارت پیشہ تھے۔ منّی لال نے بمشکل آٹھویں درجے تک تعلیم پائی تھی کہ اس کے بعد اپنے والد کے شیرہ کے کاروبار میں ہاتھ بٹانے لگے۔ جب والد نے نقل مکان کر کے لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی، تو یہ بھی ان کے ساتھ چلے گئے۔ اس کے بعد نجی طور پر اردو اور فارسی میں کچھ مہارت پیدا کر لی تھی۔

انھوں نے ۱۹۰۵ء میں شعر کہنا شروع کیا۔ شروع میں میر منصب علی، منیر سندیلوی سے مشورہ کرتے رہے اور ان کے انتقال کے بعد انور حسین آرزو لکھنوی (ف: اپریل ۱۹۵۱ء) کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ یہ تعلق محض حسنِ اتفاق سے پیدا ہو گیا۔ سندیلہ میں منشی فضل رسول واسطی سندیلوی کا سالانہ عرس بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا اس کے ساتھ ایک مجلسِ مشاعرہ بھی منعقد ہوتی، جس میں شرکت کے لیے دور دور سے شعرا حضرات بلائے جاتے۔ ایک مشاعرے میں سید انور حسین آرزو بھی آئے۔ مشاعرے کے اختتام پر سید التفات رسول ہاشمی تعلقہ دار نے ان کا تلمذ اختیار کیا اور انھیں اپنے پاس روک لیا۔ اس کے بعد آرزو متواتر گیارہ برس تک ہاشمی صاحب کے دامن سے وابستہ رہے۔ سندیلہ میں ان کے قیام کے زمانے میں یہاں کے بہت اصحاب نے ان سے اصلاح لینا شروع کی۔ ان میں جوان بھی تھے۔ ۱۹۲۰ء میں سید التفات رسول ہاشمی کے انتقال کے بعد آرزو سندیلہ سے نکلے اور بعض فلم سازوں کی دعوت پر مستقلاً کلکتہ میں مقیم ہو گئے۔ اس پر جوان نے بھی وہیں کی سکونت اختیار کر لی،

تاکہ استاد سے پورے طور پر استفادہ کر سکیں۔ کلکتے میں بھی انھوں نے تجارت ہی کو اپنی بسر اوقات کا ذریعہ بنایا۔ وہ ۱۹۶۱ء میں کلکتے سے لکھنؤ واپس آئے۔
آرزو کی زبان و بیان اور عروض سے ماہرانہ واقفیت زبان زدِ خاص و عام ہے۔ ان علوم میں بھی جوان اپنے استاد کے شاگردِ رشید ثابت ہوئے۔ چنانچہ بعد کو بہت شاگردوں نے ان سے بھی فیضان حاصل کیا۔
بروز جمعہ ۲۵ جنوری ۱۹۷۴ء کو شام کے چھ بجے اپنے مکان محلہ حسن گنج، لکھنؤ میں انتقال کیا۔
جوان کی شادی شاہجہانپور میں شریمتی برج رانی سے ہوئی تھی جن کا ۱۳ اپریل ۱۹۷۰ء کو بعارضۂ فالج لکھنؤ میں انتقال ہوا۔ ان کے پانچ اولادیں ہوئیں، لیکن چار بچے ان کی زندگی میں فوت ہو گئے تھے۔ ایک بیٹا شری آنند بہاری لال گپتا اپنی جسمانی یادگار چھوڑا ہے۔ یہ یوپی حکومت کے محکمۂ مالیات میں ملازم ہیں۔
کلام کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں: کلیاتِ جوان حصہ اول عرف حسین چراغاں (۱۹۶۳ء)؛ کلیاتِ جوان حصہ دوم عرف شوخ غنچہ (۱۹۶۴ء)؛ کلیاتِ جوان حصہ سوم عرف چراغ قاف (۱۹۶۶ء)؛ سوزِ دل (دس نظمیں)؛ رباعیاتِ جوان؛ خوش رنگ پھول (غالب اور آرزو کے اشعار کی تضمین)؛ فریاد و جوابِ فریاد (بطرز شکوہ و جوابِ شکوہ از اقبال) مع غزلیات؛ رام بن باس وغیرہ۔
انھوں نے چار مرثیے بھی کہے تھے۔ شہادتِ امام حسین علیہ السلام؛ در مدح حضرت عون و محمد؛ در مدح حضرت عباس علمدار؛ در مدحِ حضرت علی اصغر۔ یہ بھی شائع ہو چکے ہیں۔
تفصیلِ زحافات اور آئینۂ بحور (کلکتہ ۱۹۵۸ء) اپنے شاگردوں کے لیے نثر میں لکھی تھیں۔ اسی سلسلے کی ایک مختصر چیز "حضرت آرزو کی اصلاحیں" (شاگردوں کے کلام پر) ہے۔ بعض چیزیں بچوں کے لیے بھی ہندی اور اردو میں شائع کی تھیں۔
آخری عمر میں مالی حالت کچھ کمزور ہو گئی، تو حکومتِ یوپی نے ان کا ۶۰ روپے ماہانہ

ادبی وظیفہ مقرر کر دیا تھا، جو موت تک ملتا رہا۔
کلام پختہ اور بے عیب ہے۔ چند شعر درج ذیل ہیں۔ ان کی ذات سے ایک خوش خُلق، منکسر مزاج اور وضعدار شخص اٹھ گیا۔

پروانہ بن کے کام کسی کے نہ آ سکا
مانندِ شمع رونقِ محفل نہیں ہوں میں

کلیم و طور کا افسانہ سن کر بھی وہی دُھن ہے
جوان! ہشیار ہونے پر بھی نادانی نہیں جاتی

ابھی تو، موسیٰ! غشی کا شکوہ، پلک جھپکنے ہی کا گلہ ہے
جواب تک پردہ کسی نے اُٹھا، تو یہ سمجھ لو کہ فیصلہ ہے

جنونِ عشق کی کارفرمائی نہاں ہے خندۂ گل میں
گریباں سے عیاں ہوتے گریباں ہم نے دیکھا ہے

دیوانۂ الفت کی، جواں! شان یہی ہے
ہاتھوں میں ہے پتھر، تو لہو بہتا ہے سر سے

اُدھر یہ فکر کہ محوِ جمال ہو کوئی
اِدھر یہ فکر، نگاہوں کا اعتبار رہے

ہم بھی کسی کے ساتھ بدلتے رہے مزاج
چلنا پڑا زمانے کی رفتار دیکھ کر

باز ہیں جب سے زورِ رہائی کا آ گیا
آتی ہے شرم خود کو گرفتار دیکھ کر

مرنا قبول، بات سے پھرنا نہیں قبول
آگے بڑھیں گے ہم رسن و دار دیکھ کر

گزر جا اپنی حد سے اس طرح، اے جذبۂ الفت
بنائے جو ہمیں مجبور، خود مجبور ہو جائے

اس طرح جنوں کی جانچ کرے، دنیا یہ نہیں فرزانے کو
سب تو تو سہی، کیا کرتے ہو، دیتے ہو چھری دیوانے کو

گھٹا ہے، چمن ہے، بہاریں ہیں، پھر بھی
جو ہم چاہتے ہیں، وہ ساماں نہیں ہے

محبت کر کے انجامِ محبت پر نظر کیسی!
یہ اب کیوں پوچھتا ہے، اے دل! کام کیا ہوگا؟

خطا دنیا میں کی تھی، روزِ محشر تذکرہ کیوں ہے؟
کہاں کی بات پوچھی جا رہی ہے اب کہاں مجھ سے

قیس کوٹوی، نور محمد

کوٹہ (راجستھان) کے ایک غریب گھرانے میں ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے۔ گھر کے حالات بہت ناتسلی بخش تھے۔ ان کے والد نے جب دیکھا کہ کوٹہ میں ذرائع بسر اوقات کی بہتری کا امکان نہیں، تو ہجرت کر کے موضع "بوڑادیت" چلے گئے، جو کوٹہ سے ۳۴ میل دور نسبتاً خوشحال جگہ ہے۔ بیوی اپنے چاروں بچوں کے ساتھ کوٹہ ہی میں مقیم رہیں لیکن بدقسمتی گھات میں تھی۔ کوٹہ میں ہیضہ وبائی صورت میں پھوٹ پڑا۔ اس میں قیس کی والدہ اور دو بھائی رحلت کر گئے۔ اس وقت قیس بمشکل دس برس کے ہونگے۔

اس حادثہ کی خبر بوڑادیت پہنچی، تو ان کے والد کوٹہ آئے اور بقیۃ السیف خاندان کو اپنے ساتھ لے گئے۔ یہاں قیس کو ایک مقامی سرکاری ہندی اسکول میں داخل کیا گیا، جہاں انھوں نے ہندی میں کچھ شدبد حاصل کر لی۔ اس کے بعد وہ ہندی میں دوہے، چوپائیاں وغیرہ لکھنے لگے۔ اس زمانے میں وہ نور تخلص کرتے تھے۔ اسی زمانے میں انھوں نے اپنے طور پر اردو پڑھنے کا کچھ انتظام کر لیا۔ اسی دوران میں شادی بھی ہو گئی۔

وہ ۳۰ برس کے تھے کہ بوڑادیت سے اپنے مسقط الراس کوٹہ واپس چلے آئے۔ لیکن اصلی مسئلہ روزگار کا تھا، یہ نہ بوڑادیت میں ملا، نہ کوٹہ میں۔

۱۹۳۴ء میں افضل حسین ثابت لکھنوی کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہو گئے۔ ثابت اہل زبان اور صاحب فن استاد تھے۔ انھوں نے ان کا تخلص نور بدل کر قیس کر دیا۔ قیس کو ان سے مشورہ کرنے سے بہت فائدہ ہوا۔ ان کی تعلیم ناقص تھی؛ اور شاعری علم و فن

کے بغیر ناممکن ہے۔ ثابت نے قیس کی یہ کمی پوری کرنے میں جو محنت کی، اس سے انکار ممکن نہیں۔ ۱۹۴۱ء میں ثابت کا انتقال ہوگیا، تو ۱۹۴۳ء میں قیس نے سیماب اکبرآبادی کا دامن تھاما اور ان کی وفات (جنوری ۱۹۵۱ء) تک انھیں سے وابستہ رہے۔ ان اساتذہ کی تربیت پھل لائی۔ ۲۸۔۲۹ اپریل ۱۹۶۵ء کو مقامی اربابِ اردو نے کوٹہ میں شاندار پیمانے پر جشنِ قیس منایا، اُردو کے مشہور و معروف شاعر پنڈت آنند نرائن مُلّا نے اس تقریب کی صدارت کی۔ اس موقع پر گیارہ سو روپے کی تھیلی بھی قیس کی خدمت میں پیش کی گئی تھی۔

بیروزگاری بدستور قائم رہی۔ اس پر احتجاج ہا۔ اہنیہ اکاڈمی نے ان کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ یہ بھی صرف دو تین برس ملا۔

آخری ایام میں کوٹہ سے ۴۰۔۴۵ میل دور ایک مقام سکیت میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ وہیں بروز ہفتہ ۲۶ جنوری ۱۹۷۴ء (یکم محرم ۱۳۹۴ھ) کو پیام مرگ آپہنچا۔ ان کے استاد بھائی مفتون کوٹوی نے قطعۂ تاریخ وفات کہا:-

ہوا ہے دل کو بہت ہجرِ قیس کا صدمہ — مجھے جو یہ خبرِ مرگ بہرِ ملال ملی
"شہیدِ عشقِ خدا" "مخزنِ تواضع" بھی — صفاتِ قیس سے تاریخِ انتقال ملی

(۱۳۹۴ھ) (۱۹۷۴ء)

خانگی زندگی بھی کچھ اطمینان بخش نہ تھی، بلکہ ایک مرتبہ انھوں نے اسے "نہایت تلخ" کہا تھا۔ اولاد میں تین بیٹے (محمد اسحاق، نہیم احمد فہمی، ریاض احمد ریاض) اور ایک بیٹی اپنی جسمانی یادگار چھوڑے۔

قیس خالصاً غزل کے شاعر تھے۔ اگرچہ انھوں نے کچھ نظمیں بھی کہی ہیں، لیکن سچ یہ ہے کہ ان میں وہ کیف نہیں، جو ان کی غزل کا حصّہ ہے۔ افسوس کہ ان کا مجموعۂ کلام شائع نہیں ہوا۔ بعض رسائل میں جو کچھ ملا، اس کا انتخاب پیش کر رہا ہوں:

قیس! میری زندگی و موت بھی، ہے اک سراب
جیتے جینے، مرتے مرتے، ہی پریشاں ہوگیا

سجودِ شوق میں دیر و حرم کے ہیں فسانے دو
زہے قسمت کہ میرا ایک سر ہے، آستانے دو

فسانہ ختم ہوگا وعدۂ فردا پہ کل اپنا قضائے ناگہانی کو ابھی دو دن نہ آنے دو

نشیمن میں کیا تھا کہ برقِ تجلی گری، اور پھر آسماں تک نہ پہنچی

ختم ہے قیس! جنوں، وحشت و سودا مجھ پر کون پوچھیگا مرے بعد بیابانوں کو!

دیکھنا، قیس بھی مجنوں نہ کہیں ہو جائیں اس کے کوچے میں پھرا کرتے ہیں دیوانے سے

جدھر جاتے ہو تم، اے قیس! سب مجنوں سمجھتے ہیں
ذرا اہلِ نظر کی قدردانی دیکھتے جاؤ

سوزِ غمِ حیات سے اپنا پتا ملا دل کیا ملا کہ محرمِ رازِ بقا ملا

آغازِ عشق بھی یہی، انجامِ عشق بھی یہی پہلے بھی انتظار تھا، اب بھی ہوں انتظار میں

آ نہیں سکتی کبھی پھر اس گلستاں میں بہار جو خزاں آنے سے پہلے ہی بیاباں ہو چکا

شمس و قمر میں ہو، تو کرے سجدے کائنات رخشندگی جو ذرۂ خاکِ بشر میں ہے

یہ بھی اظہارِ محبت کا ہے اندازِ عجیب میں اِدھر خاموش ہوں، اور وہ اُدھر خاموش ہیں

نقشِ قدم، نہ نقشِ جبیں کا ہے امتیاز اب کیا بتاؤں، کون تری رہگذر میں ہے

طُور کے انوار اب بھی ہیں نگاہِ حسن میں جس طرف دیکھا نظر بھر کر، چراغاں ہو گیا

نہ جانے کیا تھا مرے سجدۂ جبیں میں نہاں
ہنوز دیکھ رہے ہیں وہ آستانے کو

لحد تک بعد مرنے کے پہنچتا اپنے قدموں سے یہاں بھی کاش میرے ساتھ بختِ نارسا ہوتا

بکھر جاتے ہیں جب آئینۂ تصویر کے ٹکڑے تو چن لیتا ہے گردوں، حسن کی تنویر کے ٹکڑے

میں حیراں ہوں کہ یکجا کس طرح کر لوں سرِ مقتل
اِدھر ہیں دل کے ٹکڑے، اور اُدھر شمشیر کے ٹکڑے

یہ جن سے گردشِ ایام بنتی ہے، بگڑتی ہے درخشاں ہیں فلک پہ وہ مری تقدیر کے ٹکڑے

امجد نجمی، محمد امجد، شیخ

کٹک کے ایک آسودہ حال خاندان کے فرد تھے۔ ان کے والد محمد یوسف صاحب کا اپنے زمانے کے عمائد میں شمار ہوتا تھا۔ پہلے وہ یکے بعد دیگرے اڑیسہ کی تین ریاستوں نیلگری، ڈھنکا نال، تالچیر میں نائب دیوان کے عہدے پر فائز رہے۔ تالچیر کے بعد ریاست پال لہڑا میں مقرر ہوئے تھے کہ ڈیڑھ ایک سال بعد فالج کا حملہ ہوا، جس سے جسم کا بایاں حصہ بیکار ہو گیا، اور وہ کام کاج سے محروم ہو گئے۔ بارہ برس بسترِ علالت پر رہنے کے بعد ان کا ۱۹۲۴ء میں انتقال ہوا۔

محمد یوسف صاحب اڑیا کے علاوہ اردو فارسی اور انگریزی میں بھی اچھی استعداد کے مالک تھے۔ اردو میں شعر بھی کہتے اور یوسف تخلص کرتے تھے۔ وہ داغ اور اس کے طرزِ کلام کے عاشقِ زار تھے۔ مدتوں ان کا کلام "دامنِ گلچیں" اور "پیامِ یار" میں چھپتا رہا۔ مجموعہ بھی "نکہتِ یوسف" کے نام سے مرتب کر لیا تھا۔ لیکن آخری ایام کی طویل علالت اور بےچارگی کے دوران میں یہ ضائع ہو گیا۔

نجمی انھیں محمد یوسف کے دوسرے بیٹے تھے۔ ان کے بڑے بھائی کا نام محمد احمد تھا۔ نجمی ۲۹ اکتوبر ۱۸۹۹ء کو کٹک میں اپنے آبائی مکان (محلہ بخشی بازار) میں پیدا ہوئے، جو بعد کو ان کے والد کی علالت کے زمانے میں خالصے لگ گیا۔ جب سنِ شعور کو پہنچے، تو حسبِ معمول بڑے لاڈ چاؤ سے بسم اللہ ہوئی۔ پھر مدرسہ اسلامیہ میں گئے اور اس کے بعد مقامی ریوِمن کینتھو تک مڈل اسکول میں داخلہ لے لیا۔

دسویں کے امتحان کے لیے پیاری موہن اکیڈمی، کٹک میں داخل ہو گئے۔ اسی زمانے میں

طبیعت شعر گوئی کی طرف مائل ہوئی۔ اولاً زیادہ تر توجہ غزل پر مرکوز رہی اور اس میں اپنے محلّے کی پلٹن مسجد کے پیش امام محمد حبیب اللہ تسنیم جیلپوری سے مشورہ کرنے لگے۔ شروع میں تخلص امجد تھا، اب تسنیم کے کہنے پر اسے ترک کرکے نجمی رکھ لیا۔ کوئی سال بھر بعد تسنیم نے پیش امامت چھوڑ دی اور تجارت کا پیشہ اختیار کرلیا اور اسی سلسلے میں رنگون چلے گئے۔

نجمی کو اقبال سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ بذریعہ خط وکتابت ان سے اپنے کلام پر اصلاح لیں۔ لیکن اقبال نے حسب معمول ٹال دیا اور لکھا کہ سب سے بہتر استاد اساتذہ کے کلام کا مطالعہ ہے، آپ بھی یہی کریں۔ اب نجمی نے اپنا نام صیغۂ راز میں رکھ کر اپنے والد سے اصلاح لینا شروع کی۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانے میں انھوں نے مولوی رحمت علی رحمت (والد کرامت علی کرامت ؛ ف: ۱۹۶۳ء) سے بھی کچھ استفادہ کیا۔ بعد کو جب فارسی میں کہنے کا شوق ہوا، تو اس میں حافظ شمس الدین احمد منیری شمس (ف: ۱۹۷۵ء) سے مشورہ رہا، جو اس زمانے میں راونشا کالج، کٹک میں قانون کے مدرس تھے۔

ان کی تعلیم ہنوز مکمل نہیں ہوئی تھی کہ ترک موالات اور سرکاری اسکولوں اور کالجوں کے بائیکاٹ اور ہڑتالوں کا دور شروع ہوا۔ یہ بھی اسی ریلے میں بہ گئے اور جلسوں میں اپنی اور دوسروں کی سیاسی نظمیں سنانے لگے۔ بکرے کی ماں کب تک خیر مناتی، آخر گرفتار ہوئے اور جیل کی ہوا کھانا پڑی۔ جب رہا ہوئے، تو اُن کے والد نے انھیں اپنے چھوٹے بھائی شیخ محمد محمود شریف کے پاس رانچی بھیج دیا، جو وہاں کسی دفتر میں ہیڈ کلرک تھے۔ اس کے علاوہ ان کی اسٹیشنری کی دکان بھی تھی۔

۱۹۲۲ء میں رانچی سے واپس آئے، تو انھیں کٹک میں ریلوے کے محکمے میں ملازمت مل گئی۔ یہاں انھوں نے "بزم ادب" کی تشکیل کی اور اس کے اہتمام میں مشاعرے کرتے رہے۔ پھر لوکو موٹو دفتر، خردہ روڈ، جٹنی تبادلہ ہوگیا، یہاں "ینگ مسلم کلب" قائم کی، اور ڈرامے تمثیل کرنے کی طرح ڈالی۔ اس زمانے میں آغا حشر کا طوطی بولتا تھا۔ چنانچہ پہلے انھوں نے حشر کے متعدد ڈرامے اسٹیج کیے؛ ان میں اداکاری بھی کرتے اور کھیل میں

ہدایت کاری کے فرائض بھی انجام دیتے۔ پھر خود ڈرامے لکھنے لگے۔ انھوں نے چار ڈرامے لکھے، اور انھیں اسٹیج بھی کیا تھا: "بدنصیب بادشاہ"، "کامیاب تلوار"، "کشور کانتا"، "انصاف کا کوڑا" یہ سب ہنوز غیر مطبوعہ ہیں۔

ریلوے کی ملازمت کے سلسلے میں ان کا قیام ۱۹۲۴ء میں گمجھیٹا میں بھی رہا (اسے آج کل گورو ڈی چھاٹیا کہتے ہیں) اور ۱۹۲۶ء میں راج آٹھ گڑھ میں ۱۹۳۰ء میں ان کا دفتر (لوکو موٹو) آندھرا منتقل ہوگیا، اور یوں وہ والٹیئر پہنچ گئے۔ یہاں بھی انھوں نے بعض احباب کے تعاون سے "بزم ادب" قائم کی، جس کا نام بعد کو بدل کر "اردو مجلس" ہوگیا (یہ آج تک قائم ہے) وہ ۱۹۴۱ء سے ۱۹۵۴ء تک اس کے صدر رہے۔ اس مجلس کے زیر اہتمام باقاعدہ مشاعرے ہوا کیے، بلکہ انھوں نے کل ہند اردو کانفرنس بھی کی۔ والٹیئر کے قیام کے دوران ہی میں انھیں فارسی میں شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا، افسانے بھی لکھے اور نثری مضمون بھی۔ ان کا والٹیئر کے قیام کا زمانہ ان کی ادبی تربیت اور کیفیت و کمیت، غرض ہر پہلو سے بہت اہم ہے۔ اکتوبر ۱۹۵۴ء میں ملازمت سے پنشن پر سبکدوش ہوئے، پنشن قلیل تھی؛ اس لیے حکومت اڑیسہ نے انھیں ۵۰ روپے ماہانہ کا ادبی وظیفہ عطا کیا۔ اسی زمانے میں انھوں نے ٹائپ اور اسٹینو گرافی سکھانے کا ایک اسکول جاری کیا، جس کا نام سٹی کمرشیل کالج رکھا تھا۔ اس سے بھی کچھ آمدنی ہوجاتی تھی تنگی ترشی سے گزر بسر ہوتی تھی۔ لیکن اس صورت میں بھی قناعت اور خودداری کا یہ عالم تھا کہ کبھی کسی عزیز سے مدد لینا گوارا نہ کیا۔

جیسا کہ بیان ہوا ان کی تعلیم ناقص رہ گئی تھی۔ لیکن انھوں نے محنت اور مطالعے سے اس کمی کے پورا کرنے کی کوشش کی۔ بعض بزرگوں کی صحبت سے بھی مدد ملی۔ مشق و مزاولت سے انھوں نے اتنی ترقی کرلی کہ بالآخر ان کا اردو کے قادر الکلام شاعروں میں شمار ہونے لگا۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ وہ اس دور میں اڑیسہ کے مسلم الثبوت استاد تھے۔
ان کے کلام کے دو مجموعے شائع ہوچکے ہیں، طلوع سحر (کٹک ۱۹۶۱ء)، جوئے کہکشاں، (کٹک ۱۹۶۹ء) نظم و نثر کا بہت سرمایہ غیر مطبوعہ رہ گیا۔ وہ مدتوں کٹک کے دوماہی شاخسانہ

کے مدیر بھی رہے جسے انھوں نے ۱۹۶۵ء میں جاری کیا تھا۔
انھیں ۱۹۷۱ء سے ضیق النفس کی شکایت تھی، یہ بڑی گھلا دینے والی بیماری ہے۔ اس
سے بہت نحیف و نزار ہو گئے تھے۔ ۲۱ جنوری ۱۹۷۱ء کی شب میں ایک مشاعرے سے
واپس آتے ہوئے سردی لگ گئی۔ جاڑوں کا زمانہ، دمہ کے مریض اور اس پر انفلوئنزا
اور دردِ سر۔ اسی میں بروز جمعہ یکم فروری ۱۹۷۴ء دن کے ٹھیک ایک بجے داعیٔ اجل کو
لبیک کہا۔ جمعہ کی نماز شروع ہونے سے پہلے خطیب نے حاضرین سے ان کی صحت کے لیے
درخواست کی تھی۔ اتنے میں یہ اپنے اللہ کے حضور حاضر ہو گئے، تو نماز کے بعد ان
کی مغفرت کی دعا کے لیے کہا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ جمعہ کی فضیلت
سے فیضیاب ہونے کے لیے فوری تجہیز و تکفین کا انتظام کیا گیا، ان کے سب احباب کو
اطلاع بھی نہیں دی جا سکی۔ اس کے باوجود جنازے کے ساتھ بہت بڑا مجمع تھا۔ قدم
رسول (درگاہ بازار) کٹک میں قبل مغرب دفن ہوئے۔

ان کے کئی احباب نے تاریخ وفات کہی۔ انیس امام کے قطعے کا آخری شعر ہے۔

انیسؔ! کیا کہوں تاریخ پردہ داریٔ دوست
"بڑا ستم ہے حجابِ دلِ و نظر ہونا"
(۱۹۷۴)

فیاض گوالیاری کہتے ہیں:

ہے دعائے مغفرت، فیاض! تاریخِ وفات
"امجد نجمی ہو جزوِ شاخسارِ خلد" کہ

علامہ جمیل مظہری کا قطعہ ہے:

نجمی ضو فشاں! اختر مطلعِ کٹک
جس سے افق تھا تابناک کل ز شمال تا جنوب
کہتی ہے اس کی موت پر تیرگیٔ دیارِ فن
کہیے کہ "آہ آہ آج نجمِ وطن ہوا غروب"
(۱۳۹۴)

ان کی شادی اپنے منجھلے چچا شیخ محمد یعقوب کی صاحبزادی (زیب النسا) سے ہوئی تھی۔ اولاد میں تین بیٹے اور چار بیٹیاں ہوئیں۔ دو چھوٹے بیٹے (محمد رفیع اور محمد وسیع) ان کی زندگی ہی میں انتقال کر گئے تھے۔ سب سے بڑے محمد شفیع اور چاروں لڑکیاں (نجمہ، زینت، سعیدہ، شاہدہ) ماشاء اللہ حیات ہیں۔

نمونے کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

ہائے، اس مہوش کی جلوہ گستری کل رات کو
تھی جنوں آگیں بہارِ دلبری، کل رات کو

اس کے حسنِ ضَو فگن پر اتنی نازاں تھی زمیں
کر رہی تھی آسماں سے ہمسری، کل رات کو

ہائے، وہ بلّور سے ترشا ہوا اس کا بدن
بے حقیقت تھے بتانِ آذری کل رات کو

اس کی آنکھوں میں وہ جادو، اس کے لب پر وہ فسوں
ہو گیا تھا ہیچ سحرِ سامری کل رات کو

تاکتے تھے گلستاں سے لالہ و سرو و سمن
جھانکتی تھی آسماں سے مشتری کل رات کو

تھا لبِ زاہد پہ شورِ وردِ "اسم الصمد"
اور زبانِ برہمن پہ "ہے ہری" کل رات کو

محفلِ انجم میں ڈھلتی تھی شرابِ رنگ و نور
کہکشاں تھی صورتِ تارِ زری کل رات کو

اس کے نیلے جسم پر وہ چودھویں کا چاند، ہائے
بن گیا تھا آسماں نیلم پری، کل رات کو

کلبۂ احزاں مرا، تھا غیرتِ بزمِ طرب
مٹ گئی تھی میری تیرہ اختری کل رات کو

ہو رہی تھی نور کی بارش در و دیوار پر
صحن تھا آئینۂ اسکندری کل رات کو

ہائے نازک پیکروں کی سجدہ ریزیاں کچھ اس طرح
عینِ ایماں بن گئی تھی کافری کل رات کو

جذب یوں آپس میں مل کر ہو گئے تھے حسن و عشق
کچھ نہ تھا "من دیگرم، تو دیگری" کل رات کو

رک گئی تھی اس کی گردش، تھم گئی تھی اس کی چال
تھا مرے قابو میں چرخِ چنبری، کل رات کو

صاف میں نے کر دیا انکار لینے سے اسے
دے رہے تھے مجھ کو تاجِ قیصری کل رات کو

عمر بھر رہ رہ کے یاد آئیگی، اے نجمی مجھے
میری قسمت نے جو کی تھی یاوری کل رات کو

آؤ کیوں بیکار بیٹھیں، کام کی باتیں کریں
کچھ گزشتہ راحت و آرام کی باتیں کریں

یہ اگر سچ ہے کہ ذکر العیش نصف العیش ہے
آؤ، پھر گزرے ہوئے ایام کی باتیں کریں

ابتدائے عشق کی وہ سلسلہ جنبانیاں
آؤ، پھر اس نامہ و پیغام کی باتیں کریں
اک ذرا افسانۂ زلفِ مسلسل چھیڑ کر
آؤ، پھر قیدِ دلِ ناکام کی باتیں کریں
وہ کسی کے وعدۂ جاں بخش پر بیچینیاں
آؤ، پھر اس انتظارِ شام کی باتیں کریں
وہ وفورِ اشتیاقِ دید، وہ ذوقِ نظر
آؤ، پھر ان جلوہ ہائے بام کی باتیں کریں
یاد تو کریں ذرا کنجِ قفس کی راحتیں
آؤ، پھر رنگِ فریبِ دام کی باتیں کریں
وہ مئے رنگیں، وہ بزمِ کیف، وہ سرشاریاں
آؤ، پھر اس ساقیِ گلفام کی باتیں کریں
جذبۂ شوقِ شہادت کی ستائیں عمر گزشت
آؤ، پھر اس تیغِ خون آشام کی باتیں کریں
ماجرا کچھ کہہ کے اپنے عشق کے آغاز کا
آؤ، پھر اس عشق کے انجام کی باتیں کریں
کس طرح ہم نے جلائی تھی یہاں شمعِ امید
آؤ، پھر اس آرزوئے خام کی باتیں کریں

یہ جہاں فانی ہے، نجمی! ہے یہاں کس کو ثبات
آؤ، کچھ اپنے نمود و نام کی باتیں کریں

جب دل ہی نہیں ہے پہلو میں، پھر عشق کا سودا کون کرے
اب ان سے محبت کون کرے، اب ان کی تمنا کون کرے
اب ہجر کے صدمے سہنے کو، پتھر کا کلیجا کون کرے
ان لمبی لمبی راتوں کو مر مر کے سویرا کون کرے
ہم رسمِ دنا کو مانتے ہیں، آدابِ محبت جانتے ہیں
ہم بات کی تہ پہچانتے ہیں، پھر آپ کو رسوا کون کرے
اے جذبۂ الفت! تو ہی بتا، کچھ حد بھی ہے اس ناکامی کی؟
بادیدہ نگاہوں سے ان کا محفل میں نظارا کون کرے
ہم دیکھ چکے، ہاں دیکھ چکے، دستور تمھاری محفل کا
جب شکوہ پہ یہ پابندی ہے، پھر جرأتِ شکوہ کون کرے

سمجھ رہا ہے تو بندوں کو جب یہاں معبود
تو کیوں نہ لطف سے خالی ہو تیرا لطفِ سجود
ہیں تیرے واسطے یہ شش جہات جلوہ بکف
ہے تیرے واسطے فطرت بھی گرمِ رقص و سرود

تو کہہ رہا ہے یہاں، جس کو جنتِ لاحاصل ‏— وہی دکھا گئی انساں کو راہ چرخِ کبود
بلند ہوتی گئی جس قدر نگاہِ بشر ‏— ستارے اور بھی ہوتے گئے غبار آلود
ہے تیرے سینے میں پوشیدہ موجِ طوفاں خیز ‏— مگر تو سمجھا ہے اپنے کو قطرۂ بے بود
یہ زندگی کی کشاکش، یہ سوز و سازِ حیات ‏— جو یہ نہیں، تو سراسر عدم ہے تیرا وجود
تو اس کو پھونک دے، بن کر عمل کی چنگاری ‏— کہ تیرے آگے یہ دنیا ہے تودۂ بارود
کمی نہیں ہے جہاں میں ادا شناسوں کی ‏— سمجھ زمانے کو ہرگز ایاز بے محمود
یہاں تو، تو ہی کلیم و خلیل بن نہ سکا ‏— دگرنہ ہے کوئی فرعون، تو کوئی نمرود

"ہمہ از وست" سمجھ اس کو، یا "ہمہ اوست"
سوا خدا کے یہاں، جو ہے وہ ہے لاموجود

جھکتا ہی نہ تھا، پھر ایسا جھکا، نام اٹھنے کا لیتا ہی نہیں
معلوم نہیں اس سر نے کیا اس سنگِ در میں دیکھ لیا

التفاتِ اولیں کی بات ہی کچھ اور ہے ‏— مجھ تک ان کی بزم میں اب دورِ جام آیا تو کیا

کیوں یہ کہتے ہو: کوئی چاہنے والا ہی نہیں
چاہنے والوں کو تم نے ابھی دیکھا ہی نہیں

بجا ہے فرطِ جنوں نے ہمیں کیا رسوا ‏— جمالِ یار میں آخر یہ دلکشی کیا ہے
گریز کیا میں کروں، ناصحوں کی صحبت سے ‏— جہاں نہ کچھ ہو، یہ صحبت وہاں بری کیا ہے

عزیز جھالاواڑی، محمد عزیز الرحمٰن قریشی

ان کا خاندان ریاست جھالاواڑ کے باعزت ملازموں میں شمار ہوتا رہا ہے۔ ان کے دادا منشی علی بہادر "منصرم کوٹھی دکارخانہ جات" تھے۔ ان کے بعد عزیز کے والد منشی عبداللطیف بھی کارخانہ جات کے منصرم رہے۔ عزیز یہیں جھالاواڑ میں بسنت پنچمی کے دن جمعرات 19 فروری 1885ء کو پیدا ہوئے۔

خاندان میں تمام سہولتیں میسّر تھیں، لہٰذا تعلیم مناسب طریقے پر گھر ہی پر ہوئی، اور اس کی تکمیل کے بعد یہ بھی ریاست کی ملازمت میں لے لیے گئے۔ ترقی کرتے کرتے بالآخر وہ بھی منصرم کے درجے تک پہنچے، جو انگریزی علاقے کے "کمشنر" کے مساوی رہا ہوگا۔ عزیز نے جھالاواڑ کے چار حکمرانوں کا عہد حکومت دیکھا: (۱) راج رانا ظالم سنگھ؛ ان کے زمانے میں ان کا شباب تھا۔ (۲) مہارانا بھوانی سنگھ؛ (۳) مہارانا راجندر سنگھ۔ ان دونوں حکمرانوں کے زمانے میں عزیز مقرب خاص رہے۔ (۴) راج رانا ہریش سنگھ یہاں کے آخری رئیس تھے۔ جب راجستھان کی ریاستیں جمہوریۂ ہند میں ضم ہوگئیں، تو ابتدائی زمانے میں رانا ہریش چندر راجستھان میں وزیر بھی رہے تھے۔ مہارانا بھوانی سنگھ خود صاحب علم اور قدردان علم وادب تھے۔ ان کا انتقال ۱۳ اپریل ۱۹۲۹ء کو جہاز پر ہوا جب وہ علاج کے لیے لندن جا رہے تھے۔ لاش عدن میں سپردِ خاک ہوئی، اور پھول جھالاواڑ آئے، جہاں بقیہ رسوم ادا ہوئیں۔ ان کے زمانے میں ادبی اور ثقافتی قسم کی تمام سرگرمیوں کا اہتمام عزیز کے ذمّے ہوتا تھا۔ عزیز

کے کلام میں جو متعدد نظمیں سالگرہ کی مبارکباد، ہولی، جشنِ غسلِ صحت وغیرہ کے عنوان سے ملتی ہیں، وہ انھوں نے اسی عہد میں کہی تھیں۔

مہاراجا بھوانی سنگھ نے بھوانی ناٹیہ شالہ، ایک ادارہ قائم کیا تھا، جہاں ڈرامے اور ناٹک اور اسی طرح کی دوسری تفریحی اور کلچرل تقاریب منعقد ہوتی تھیں۔ اس ادارے کے مہتمم بھی عزیز ہی تھے۔ ان تقریبوں میں داخلہ بہت محدود ہوتا تھا۔ ان کے جانشین مہاراجا راجندر سنگھ کے تو وہ مصاحبِ خاص اور ہر وقت کے ندیم حاضر باش تھے۔ مہاراجا راجندر سنگھ شعر بھی کہتے؛ اور مخمور تخلص کرتے تھے۔ عزیز جب چھکنے پر آتے تھے، تو ان دونوں حکمرانوں کے عہد کے قصے بیان کرتے اور ان کی علم پروری اور ادب نوازی کے واقعات سنایا کرتے تھے؛ وہ ان دونوں کے ہمیشہ مدّاح رہے۔

عزیز کے مکتبی زمانے کے ایک استاد قاضی قطب الدین تھے۔ وہ کبھی کبھی نعت کہتے تھے۔ انھیں کی دیکھا دیکھی عزیز کو بھی شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا۔ وہ شعر کہنے لگے۔ لیکن قاضی صاحب موصوف سے کبھی اس کا ذکر نہیں آیا۔ سب سے پہلے انھوں نے حکیم عبدالصمد شوق سے اصلاح لی اور انھیں کے کہنے پر مشاعرے میں اپنا کلام سنایا۔ یہ سلسلہ کافی دن تک رہا۔ بعد کو عزیز درباری شاعر جناب افتخار الشعرا مولوی عبدالوحید نیرنگ کاکوروی کے شاگرد ہوگئے۔ یہ تلمذ انھوں نے مہاراجا بھوانی سنگھ کے ایما پر اختیار کیا تھا۔ نیرنگ خود منشی عبدالمجید سحر (ابن غلام ساحر علوی) کے بیٹے اور مشہور نعت گو مولوی محمد محسن کاکوروی (ف: ۲۴ اپریل ۱۹۰۵ء) کے شاگرد تھے۔ نیرنگ ۲۷ ستمبر ۱۸۵۷ء کو کاکوری میں پیدا ہوئے تھے۔ راجستھان میں اردو کے فروغ میں ان کی خدمات بہت قابلِ قدر ہیں۔ بہت ذہین اور طبّاع آدمی تھے۔ تلامذہ کی کثیر تعداد نے ان سے کسبِ فن کیا۔

عزیز قدیم وضع کے بہت پختہ سخنگو تھے۔ ان کا کوئی مجموعہ حین حیات شائع نہیں ہوا۔ دو دیوان غیر مطبوعہ موجود ہیں۔ ایک میں غزلیات ہیں؛ دوسرے میں رباعیات، قطعات،

نظمیں وغیرہ۔

عزیز بہت وضعدار اور رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے۔ مثلاً گھر سے کبھی شیروانی کے بغیر باہر نہیں نکلے۔ پان کی ڈبیہ اور بٹوہ ہمیشہ ساتھ رہتا۔ آخر تک پرانی وضع کا قلمدان استعمال کیا اور نرسل کے قلم سے لکھتے رہے۔ مہمان نواز اور سیر چشم آدمی تھے۔ لیکن بہت محتاط زندگی بسر کی، ہمیشہ اپنی آمدنی اور خرچ کا حساب رکھتے۔ باغبانی کا شوق تھا۔ جھالاواڑ سے باہر سات آٹھ میل دور سکیت کے مقام پر ان کا باغیچہ آج بھی موجود ہے۔ اپنے شہر کے مکان میں بھی ایک پھلواری لگا رکھی تھی۔

ان کا بدھ ۶ فروری ۱۹۷۴ء (۱۲ محرم ۱۳۹۴ھ) کو انتقال ہوا۔ ۸۹ برس کی عمر پائی۔ بیوی سے والہانہ محبت تھی۔ ان کا پانچ چھ سال قبل انتقال ہو گیا، تو وہ بجھ سے گئے۔ اس کے بعد عزیز نے متعدد نظموں میں ان سے اپنی شیفتگی اور جدائی پر رنج و غم کا اظہار کیا۔ دو لڑکے (ڈاکٹر محفوظ الرحمٰن اور محبوب الرحمان) اور دو لڑکیاں یادگار چھوڑی ہیں۔ سب ماشاء اللہ اپنے اپنے گھر بار والے، بلکہ بیٹوں، پوتوں والے اور خوش و خرم ہیں۔

مفتون کوٹوی نے تاریخ وفات کہی:

کر گئی زیر و زبر بزمِ خیال	اطلاعِ ارتحالِ پُر ملال
وہ عزیز خوشنوا رخصت ہوا	تھے جو بزمِ دوستاں میں خوش مقال
جنت الفردوس ان کو ہو نصیب	مغفرت فرمائے ربِّ ذوالجلال
ہے یہ مفتوں! ان کی تاریخِ وفات	"قربِ سبحاں" پاگیا "رنگیں خیال"

(۴۲۳ + ۹۷۱ : ۱۳۹۴)

افسوس کہ ان کے کلام کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ رسائل میں بھی زیادہ نہیں ملتا۔ کیونکہ انھیں اپنی درباری مصروفیتوں سے اتنی فرصت ہی کہاں تھی کہ اسے چھپنے کے لیے بھیجتے۔ چند شعر بعض رسائل سے لیے گئے ہیں جو ہدیۂ ناظرین ہیں:

تری نظر سے نظر مل گئی ہے کیا میری	بلا رہی ہے اشارے سے اب قضا میری

عزیز! عمرِ دو روزہ کٹے نہ راحت سے تو پھر بقا میں ہے یہ بھی کوئی بقا میری!

یہاں کا جس طرح سے کرے میزباں لحاظ ہے لطف اسی طرح سے کرے میہماں لحاظ

بگولوں سے تھی دشت نجد میں امید مجنوں کو کہ اب لیلیٰ کا چہرہ پردہ محمل سے نکلیگا
ہمیں وہ لطفِ بزمِ یار حاصل ہو کہ جیتے جی نہ محفل دل سے نکلیگی، نہ دل محفل سے نکلیگا

ساتھ لایا نہ کرو غیر کو تم محفل میں ورنہ اک روز یہ جھگڑا سرِ محفل ہوگا

تری تصویر مری آنکھوں میں ہر دم پھرتی کچھ عجب لطف ترا ورد وجدائی دیتا

دل میں رہ رہ کے یادِ مژگاں ہے مبتلا ہم ہیں دردِ پیہم میں

جب قلزمِ الفت اُمڈ آیا شبِ معراج
محبوب کو خالق نے بلایا شبِ معراج
قدسی یہی کہتے تھے، عجب شانِ خدا ہے
یہ کس کا قدم عرش پہ آیا شبِ معراج

مسدس کا ایک بند:

حضرتِ یوسف و یعقوب و مسیح و مریم
خضر و الیاس تھے خوش، حوّا، آدم
ہود و ایوب تھے، موسیٰ بھی تھے شاد و خرم
لوط و ادریس خوشی سے تھے بغلگیر بہم
انبیاء سب یہی کہتے تھے خوشی سے پیہم
"عرش پر آئینگے محبوبِ خدا آج کی رات"

مہجور شمسی، سیّد عبدالقیوّم

ضلع روہتاس (بہار) کے تاریخی شہر سہسرام کے رہنے والے تھے جسے شیر شاہ سوری کا مسقط الرّاس ہونے کا فخر حاصل ہے۔ ملازمت کی اسناد کے مطابق وہیں ۱۸ اپریل ۱۹۱۵ء کو پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد "مولوی" محمد ادریس (ف: ۱۹۳۸ یا ۱۹۳۹ء) ریلوے پولیس میں داروغہ تھے۔

ابتدائی تعلیم مدرسۂ خانقاہ کبیریہ، سہسرام میں ہوئی؛ ثانوی مدرسۂ حنفیہ، آرہ میں، اور اعلیٰ کی تکمیل مدرسۂ شمس الہدیٰ، پٹنہ میں کی۔ یہ مدرسۂ شمس الہدیٰ کا تعلق ہی تھا جس کے باعث بعد کو شعر گوئی کے زمانے میں انھوں نے اپنے تخلص مہجور کے ساتھ شمسی کا اضافہ کیا؛ بلکہ بعض غزلوں میں تو انھوں نے "شمسی" بطور تخلص بھی استعمال کیا ہے۔

آخر میں پٹنہ یونیورسٹی سے صرف اردو کے مضمون میں امتحان دے کر بی اے کی سند حاصل کر لی تھی۔ اس کے بعد مدرسی کا پیشہ اختیار کر لیا۔ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۸ء تک ضلع اسکول، گیا میں فارسی اور اردو پڑھاتے رہے۔ اوائل ۱۹۴۸ء میں پلاموں ضلع اسکول، ڈالٹن گنج میں تبادلہ ہو گیا؛ بقیہ ملازمت کا سارا زمانہ یہیں گزرا، اور یہیں سے اوائل ۱۹۷۴ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ اس کے بعد مشکل سے مہینہ بھر گزرا ہو گا کہ جمعہ ۸ فروری ۱۹۷۴ء کو داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ فشارِ دم کا عارضہ پرانا تھا، لیکن موت حرکتِ قلب بند ہو جانے سے ہوئی۔ قسمت

کی ستم ظریفی دیکھیے کہ اسی دن پلاموں نٹ راج کیندران کے ا۔ع۔از میں "شب غزل" منانے والا تھا کہ بعد نماز جمعہ تین بجے سہ پہر کو اچانک قلب کا دورہ پڑا اور آناً فاناً جاں بحق ہو گئے۔ "جشن غزل" "مجلس عزا" میں تبدیل ہو گیا۔ وہ ہزاری باغ اسکول کے نگراں مقرر ہوئے تھے۔ سامان بندھ چکا تھا، اور دو تین دن بعد روانگی طے تھی کہ سفر آخرت پیش آگیا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔ ڈالٹن گنج کے قبرستان میں آخری آرامگاہ نصیب ہوئی۔ ان کے شاگرد مجیب نشتر نے تاریخ کہی :

حضرت مہجور رخصت ہو گئے	مرد کامل، صاحب فن، نغز گو
لوح دل پر کیوں نہ پھر ہر شخص کے	"شاعر شیریں سخن کا نام ہو"

(۱۹۷۴ء)

بہت کم عمری میں شعر و سخن کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ کلام پر مختلف اوقات میں سیماب اکبرآبادی (ف: جنوری ۱۹۵۱ء) ساغر نظامی (ولادت: دسمبر ۱۹۰۵ء) اور آرزو لکھنوی (ف: اپریل ۱۹۵۱ء) سے مشورہ کرتے رہے۔ اگرچہ دوسری اصناف میں بھی کلام موجود ہے، لیکن دراصل غزل کے شاعر تھے، اور وہ بھی روایتی رنگ کے۔ خوش گلو ہونے کے باعث مشاعروں میں بہت مقبول تھے۔ ان کی زندگی ہی میں ان کے شاگردوں نے "بزم مہجور" کے نام سے ایک انجمن قائم کی تھی۔ یہ آج بھی حتی المقدور ادب کی خدمت کر رہی ہے۔ اس کی طرف سے ان کے شاگردوں کا تذکرہ "نقوش مہجور" (پٹنہ ۱۹۷۵ء) بھی چھپ چکا ہے۔

دو مجموعے: پردۂ ساز (ڈالٹن گنج ۱۹۶۶ء) اور نوائے راز (گیا ۱۹۷۳ء) ان کی زندگی میں شائع ہوئے تھے۔ دو اور مجموعے (گل نغمہ و کلام مہجور) بھی مرتب تھے لیکن شائع نہیں ہوئے۔

اپنی عمر میں دو نکاح کیے۔ پہلی شادی سہسرام میں ہوئی۔ ان سے دو بچے ہوئے: ایک لڑکا (محمد مخدوم) اور بیٹی نزہت جہاں۔ دونوں بچے فوت ہو گئے اور بیوی کا بھی انتقال ہو گیا۔ دوسری بیوی سے دو بیٹیاں زندہ ہیں۔

پختہ کلام ہے۔ مضمون آفرینی کی کوشش ہر ایک شعر سے ظاہر ہے۔ اگرچہ وہ کلاسیکی انداز کے سخنور ہیں، لیکن انھوں نے جدید رنگ سے اجتناب کیا، قدیم ہیئت کو قائم رکھتے ہوئے عصرِ حاضر کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی سعی کرتے ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

ہر چند دیکھتا ہوں، یہاں بام و در نہیں
آگے چل، اے جنوں، ہرا صحرا ابھی گھر نہیں

خونِ دل، خونِ جگر، خونِ نظر، سب رہ گئے
ہر سبک رو، آکے، میر کارواں بنتا گیا

بر آستاں سے پہنچنے لگے جبیں کو پیام
مچل گیا مرے سجدوں میں کس کا نام ابھی

یہ کیا جشنِ رہائی ہے، کیسی آزادی
جہانِ فکر و نظر ہیں کہ ہیں غلام ابھی

یہ کیا خبر تھی کہ دستِ وحشت لباسِ ہستی پہ جا پڑے گا
کچھ ایسے عالم میں ہوں کہ اکثر خیال آتا ہے پیرہن کا

کچھ غم نہیں مہجور! کہ اپنا نہیں کوئی
معلوم ہے بیکس کا بہر حال خدا ہے

دہو جو عشق، تو ذرّے نہیں آدمی اٹ جائے
جو ہو، تو وسعتِ کونین میں سما نہ سکے

پھیلا ہی تری جفا کا قصّہ
بات آ ہی گئی مری وفا کی

کہنے کو ہے ابتدائے الفت
اس میں بھی تڑپ ہے انتہا کی

مہجور! ادا کا نام نکلا
اللہ نے زندگی عطا کی

صبح نہ آیا، شام نہ آیا
آج بھی کچھ پیغام نہ آیا

محویتِ آغازِ محبّت
پیشِ نظر انجام نہ آیا

سکوت، آغاز جستجو کا، سکوت انجام گفتگو کا
حدودِ آدابِ بندگی میں، سکوت اک ہے کہ حکمراں ہے

نہ وہ رشکِ طلعت حور ہے، نہ جوابِ جلوۂ طور ہے
مگر ایک بات ضرور ہے، کوئی بات اُس میں ضرور ہے

یہ خار بھی ہیں متاعِ بہار، گل ہی نہیں
نگاہ چاہیے اسرارِ گلستاں کے لیے

جھکا جھکا کے اسے اور پائمال نہ کر
جبیں کو وقف بھی کر ایک آستاں کے لیے

رہروانِ رہِ تسلیم کی منزل ہے وہی — آپ کے گھر سے چلے، آپ کے گھر تک پہنچے

اب شکایتیں بیجا، گردشِ مسلسل کی — اس زمین پہ خود ہم نے آسماں بنائے ہیں

ترے رخ پہ رنگ چھڑکا مرے خونِ آرزو نے
مرے شانۂ جنوں نے تری زلف کو سنوارا

ہنر آتا نہ ہو، تو بندگی بھی ہو نہیں سکتی — خدائی کرنے والے کر گئے، اہلِ ہنر ہو کر

عہد کے مسیحوں نے، وقت کے طبیبوں نے — زندگی کے ماروں کو موت کی دوا دی ہے

سوچ سمجھ کر، سیرِ چمن کر — پھول لگا دیتے ہیں نشتر
پھر لیتا ہے ہاتھ میں ساغر! — بھول گیا، تاریخ کا پتھر؟

آپ کی بزم میں مستِ مے و نغمہ ہی نہیں — وہ بھی ہیں، جو رسن و دار سے ہو گزرے ہیں
خوش نصیبانِ کرم تھے کہ ملی جائے پناہ — ہم بھی اک سایۂ دیوار سے ہو گزرے ہیں

ترے سکوت سے زندہ ہے حسنِ رمزِ کلام — وہ سادہ دل ہیں کہ مرتے ہیں گفتگو کے لیے

اہلِ دل سے زندہ ہے، رسمِ ناصیہ سائی — ورنہ کیا تعلق ہے سر کو آستانے سے!

شرابِ دانشِ حاضر کی سرمستی ارے توبہ! — نظر تک روشنی پہنچی، دلوں تک تیرگی آئی

کچھ تو اہلِ وحشت کا حوصلہ بڑھانا تھا — تم کو اک تبسم سے کیوں حجاب آتا ہے

انور، منوہر سہائے، ڈاکٹر

داغ کے مشہور شاگردوں میں "پروفیسر" نراین پرشاد مہر گوالیاری کا بھی شمار ہوتا ہے۔ وہ قوم کے سکسینہ کائستھ تھے، ان کی "قومی لقب وردما" تھا۔ کسی زمانے میں یہاں دلی کے مضافات (اور شاہدرہ کے نواح) میں ایک مختصر گاؤں "سٹھولی" نام تھا۔ ان کا خاندان وہیں کا رہنے والا تھا، اسی لیے یہ لوگ "سٹھولے" کہلاتے تھے۔

خاندان مغلیہ کے عروج کے زمانے میں ان کے بزرگ شاہی ملازم تھے۔ چنانچہ ان کے مورث اعلیٰ رائے براگ داس اکبر کے عہد میں دیوان بیوتات کے عہدے پر فائز تھے۔ محمد شاہ کے عہد تک ملازمت کا یہ سلسلہ قائم رہا۔ جب سلطنت مغلیہ پر زوال آیا، تو اس خاندان کا شیرازہ بھی بکھرا اور یہ لوگ تلاش معاش میں یوپی کے مختلف شہروں میں منتشر ہو گئے۔ کچھ جا کے سہسوان (ضلع بدایوں) اور اکبرآباد میں بس گئے، کچھ سرکار اودھ اور حکومت انگریزی کے دامن سے وابستہ ہو گئے۔ مہر کے والد منشی کنھیا لال بھی فکر روزگار میں سرگرداں تھے۔ ان کے خسر منشی چھب لال بریلوی، اس وقت بدایوں کی کلکٹری میں ملازم تھے۔ غدر کی افراتفری شروع ہوئی، تو وہ اپنے مرشد پنڈت ہرناتھ، نائب دیوان ریاست گوالیار کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور بعد کو ان کی وساطت سے وہاں قسمت مالوہ میں نائب صوبہ کے عہدے پر متمکن ہو گئے۔ منشی چھب لال کے پاؤں جم گئے، تو انھوں نے اپنے داماد منشی کنھیا لال کو بھی اپنے پاس بلا لیا، اور اپنے اثر سے انھیں ریاست گوالیار کے ضلع شبل گڑھ (موجودہ مدھیہ پردیش) کی تحصیلداری دلوا دی۔ اس کے بعد خاندان نے

یہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ چنانچہ نرائن پرشاد ۱۸۶۸ء میں مبل گڑھ میں پیدا ہوئے۔

اپنے خاندان کی روایت کے مطابق مہرؔ کی تعلیم بھی فارسی اور عربی سے شروع ہوئی۔ پھر الہ آباد یونیورسٹی کے تحت بریلی کالج سے دسویں درجہ کا امتحان اوّل درجے میں پاس کیا۔ بدقسمتی سے درد شقیقہ کے مستقل عارضے کے باعث آگے تعلیم جاری رکھنے سے معذور رہے۔ لہٰذا انگریزی مڈل اسکول، گوالیار (پرانی آبادی) میں مدرّسی اختیار کرلی۔ مختلف جگہوں پر ملازمت کرنے کے بعد ۱۹۱۱ء۔ ۱۹۱۲ء میں عارضی طور پر کمشنر دفتر مردم شماری، گوالیار کے نجی معاون (پرسنل اسسٹنٹ) مقرر ہو گئے۔ یہاں کی خدمات کے صلہ میں کچھ انعام بھی ملا تھا۔ اس دفتر سے فارغ ہوئے، تو ریاست کے سب سے مقتدر اسکول، وکٹوریہ کالجیٹ ہائی اسکول میں اونچے درجوں کے پڑھانے پر مقرر ہو گئے۔ اس اسکول میں ۱۹۳۵ء تک رہے۔ اس اثنا میں عارضی طور پر غالباً ۱۹۳۴ء میں پروفیسر احسن اثر خان ثاقب کے انتقال پر انھیں وکٹوریہ کالج، گوالیار میں انٹر اور بی، اے کے درجوں کو فارسی پڑھانے کا موقع ملا تھا۔ اسی باعث ان کے نام کے ساتھ "پروفیسر" کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ وہ بالآخر ۱۹۳۵ء میں محکمۂ تعلیم کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ اس کے بعد زیادہ وقت مذہبی مطالعے میں گزرا۔

مہرؔ کو شاعری کا شوق ۱۶۔۱۷ برس کی عمر میں ہوا۔ ضیا مرہوی کی وساطت سے داغؔ کی شاگردی اختیار کی، جو ان دنوں رامپور میں مقیم تھے۔ مہرؔ کا دیوان (شعاع مہر) ان کی زندگی میں چھپ گیا تھا۔ (مطبع محمدی، بمبئی: ۱۹۲۷ء) اس کے علاوہ بعض اور کتب بھی موجود ہیں: (۱) رہنمایانِ ہند۔ یہ انگریزی کتاب (Prophets of India) کا ترجمہ ہے۔ اسے انجمن ترقی اُردو نے شائع کیا تھا؛ (۲) سفید جوگی: معاشرتی ناول ہے؛ (۳) نثر ثریا! یہ چھ مضامین کا مجموعہ ہے؛ (۴) رہبر مضمون نگاری: درسی کتاب ہے۔ انھوں نے ایک کتاب "محاورات مہر" بھی مرتب کی تھی۔ اس میں اُردو کے محاورات ردیف وار جمع کر کے ان پر بحث کی تھی۔ یہ ان کی زندگی میں نہیں چھپ سکی تھی۔ نہ جانے، اس کا مسودہ

گیا ہوا!۔
مہر نے ۲۶ جولائی ۱۹۴۳ء کو بوقت صبح اچانک عارضۂ قلب سے انتقال کیا۔ ان کے استاد بھائی نوح ناروی نے تاریخ کہی:

نوح کے دل سے یہ نکلا سال فوت
لکھ! "غروب مہر زرّیں بارگاہ"
(۱۹۴۹ء - ۶ = ۱۹۴۳ء)

داغ ہی کے ایک دوسرے شاگرد حُبّ لال رعد کی تاریخ تھی:

شاعر خوش فکر دنیا سے گیا (۱۹۴۳)

منوہر سہائے انور انھیں نراین پرشاد مہر کے خلف رشید تھے۔ یہ مسل گردھ کی میں یکم جنوری ۱۹۰۱ء بوقت صبح پیدا ہوئے۔ ان سے دو بڑے بھائی پہلے سے موجود تھے۔ اول، رام سروپ عرف رام درما (۱۸۹۵ء - ۱۹۷۰ء)؛ یہ فوج میں کپتان کے عہدے تک پہنچے شکار کے دلدادہ اور ماہر نشانہ باز تھے۔ ان کی عمر کا زیادہ حصہ آگرے میں بسر ہوا۔ دوسرے بھگوان سروپ (۱۸۹۸ء - ۱۹۷۱ء) لکھنؤ میں رہتے تھے۔ موسیقی سے بدرجۂ غایت شغف تھا۔ ۱۹۲۶ء میں لکھنؤ میں بڑے پیمانے پر ایک موسیقی کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ اس میں انھوں نے ایک بصیرت افروز مقالہ پڑھا تھا۔

منوہر سہائے کا اصلی نام لکھی گووند سروپ تھا، جسے بعد کو ننھیال والوں نے تبدیل کر کے منوہر سہائے کر دیا۔ یہ بمشکل سات ماہ کے ہونگے کہ اکتوبر ۱۹۰۱ء میں ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد ان کی پرورش اور تربیت ننھیال میں ہوئی۔ یہ خاندان بھی علم و فضل اور جاہ و مرتبہ میں ممتاز تھا۔ یہ لوگ ریاست ٹونک کے جاگیردار تھے۔ ان کے پرنانا دولن نرنجن سہائے شائق (ف: ۱۹۰۷ء) اور نانا دیو تی سہائے حیفی (ف: ۱۹۱۶ء) دونوں فارسی کے شاعر تھے۔ ان کے فارسی سے شغف کا یہ عالم تھا کہ اُردو کو حقیر زبان سمجھتے اور اس میں معمولی مراسلت تک کو اپنے درجہ و مرتبہ سے دون خیال کرتے تھے۔ ایسے ماحول میں انورکی تعلیم کس نہج پر ہوئی ہوگی، اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ خود بتایا کرتے تھے کہ حروف ہجی

سے بھی قبل مجھے یوسف زلیخائے جامی کے ابتدائی تین صفحات زبانی حفظ کرادیے گئے تھے۔ جب حرف شناس ہو گئے، تو گلستان سعدی سے بسم اللہ ہوئی۔ پھر بوستان اور دوسری ابتدائی اور درمیانی کتابیں اسی طرح گھر پر پڑھیں۔ نانا اور پرنانا ان کے استاد تھے۔ پرنانا کی وفات کے بعد، نانا نے اکیلے پوری توجہ اور دلسوزی سے نواسے کی تعلیم کی نگرانی جاری رکھی۔

۱۹۱۱ء میں انور باقاعدہ اسکول بھیجے گئے۔ ان کی استعداد کے پیش نظر براہ راست ساتویں درجے میں داخلہ ملا۔ اسکول میں اردو اور انگریزی پڑھتے، اور گھر پر فارسی۔ بہرحال فارسی کا درس ۱۳۔۱۴ برس کی عمر تک رہا۔ اس وقت تک انھوں نے فارسی کا بیشتر کلاسیکی ادب ختم کر لیا تھا؛ اور اس سے مزید کی واقعتاً ضرورت بھی نہیں تھی، خصوصاً جب کہ اس سے اسکول کی تعلیم میں بھی حرج ہونے لگا تھا۔ لیکن یہ فارسی کی وسیع واقفیت بعد کے زمانے میں ان کے بہت کام آئی۔

۱۹۱۴ء میں اسکول سے فارغ ہوئے، تو نانا نے اپنے اثر و رسوخ سے انھیں ریاست ٹونک کے محکمۂ پولیس میں ملازمت دلوادی۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہاں انھوں نے جوانی کی ترنگ میں کسی موقع پر ریاست کے نظم و نسق کے بارے میں کچھ اعتراض کر دیے۔ اس زمانے میں ایسی باتیں، اور وہ بھی دیسی ریاستوں میں، بغاوت سے کم تصوّر نہیں کی جاتی تھیں۔ چنانچہ ۱۹۱۹ء میں بیک بینی و دو گوش ملازمت سے برطرف کر دیے گئے۔ اس اثنا میں (۱۹۱۶ء) میں نانا کا بھی انتقال ہو چکا تھا؛ جو ان کے حامی اور سرپرست تھے۔ چونکہ اندیشہ تھا کہ مبادا ریاست ٹونک ان کے خلاف کوئی مقدمہ قائم کر دے، یہ اپنے والد کے پاس گوالیار چلے آئے۔ انور کی والدہ کے انتقال کے بعد مہر نے دوسری شادی کر لی تھی۔ یہ خاتون بھی سہسوان کی تھیں۔ ان سے مہر کے چار بچے پیدا ہوئے۔ ایک بیٹی (برندا رانی) اور تین بیٹے: بدری پرشاد ستھوے (ولادت ۱۹۰۳ء) جگنا تھ پرشاد ستھوے (ولادت ۱۹۰۵) اور سومرنا تھ پرشاد ستھوے پبلسٹی افسر ضلع دتیا (ولادت: ۱۹۱۹ء) تینوں بھائی بفضلہ زندہ موجود ہیں (۱۹۷۷ء)

انور کو یہاں گوالیار کا ماحول راس نہ آیا، اس لیے انھوں نے چندے بعد پھر رخت سفر باندھا۔ اب کے لاہور پہنچے اور منشی محبوب عالم (ف: مئی ۱۹۳۳ء) کے مشہور "پیسہ اخبار" میں مترجم کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔

اس زمانے کا لاہور صحیح معنوں میں اردو علم و ادب اور صحافت کا گہوارہ تھا۔ انور نے محسوس کیا کہ یہاں کے علمی حلقوں میں برابری کی سطح پر باوقار مقام حاصل کرنے کے لیے اشد ضروری ہے کہ نہ صرف اپنی تعلیم کی تکمیل کریں، بلکہ یونیورسٹی کی سند حاصل کریں۔ فارسی کی بنیاد، اور وہ بھی خاصی مضبوط پہلے سے موجود تھی، انھوں نے رفتہ رفتہ ایم اے اور ایم او ایل کی اسناد حاصل کر لیں۔ وہ غالباً واحد ہندستانی تھے، جنھیں تقسیم ملک کے بعد یعنی ۱۹۵۰ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے اپنے مقالے (انگریزی) "سراج الدین علی خان آرزو: حیات و تصانیف" پر پی ایچ ڈی کی سند ملی۔

وہ لاہور کے مشاعروں میں شریک ہوتے، شہر کی گوناگوں ادبی سرگرمیوں میں حصہ لیتے، اور مختلف اوقات میں بعض رسائل و جرائد کے دفتر میں بھی کام کرتے رہے۔ چندے، ڈی اے، وی کالج، لاہور میں فارسی اور اردو کے مدرس (لیکچرر) بھی رہے تھے۔ اس طرح جہاں ان کا حلقۂ احباب وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ وہیں وہ کئی ایسے اصحاب اثر و رسوخ سے بھی متعارف ہو گئے، جو ان کے اردو اور فارسی کے فاضل کی حیثیت سے معترف تھے۔ اس کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ لاہور میں جہاں اس وقت ان دونوں زبانوں کے عالموں اور استادوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ میاں سر فضل حسین (ف: جولائی ۱۹۳۶ء) نے انھیں اپنے بیٹے میاں عظیم حسین (آئی، سی، ایس) کو اردو اور چودھری سر شہاب الدین نے اپنے متبنیٰ میاں ممتاز محمد خان دولتانہ کو فارسی پڑھانے کے لیے مقرر کیا؛ یہ دونوں اس وقت بی اے کے طالب علم تھے۔

۱۹۲۵ء میں، سر سکندر حیات خاں کے مشورے سے انھوں نے پنجاب کے محکمۂ تعلیم میں ملازمت قبول کر لی۔ اس زمانے میں سر شہاب الدین پنجاب کی مجلس واضع قوانین کے صدر تھے۔ ۱۹۲۷ء میں انھوں نے انور صاحب کو مجلس میں مترجم مقرر کرا دیا۔ تقسیم ملک تک وہ اسی جگہ

کام کرتے رہے، اور ۲۱ سالہ ملازمت کے بعد ۱۹۵۵ء میں سپرنٹنڈنٹ کے عہدے سے پنشن پر سبکدوش ہوئے۔ اپنی تعلیمی صلاحیتوں کے پیش نظر اس کے بعد وہ پنجاب یونیورسٹی کیمپ کالج، نئی دلی میں شعبۂ اردو، فارسی، عربی کے صدر بن گئے۔

صحت مدت سے خراب چلی آرہی تھی، فشارِ دم (ہائی بلیڈ پریشر) کی شکایت تھی۔ مارچ ۱۹۷۲ء میں پہلی مرتبہ دل کا دورہ پڑا۔ بادے، دوا دوش سے حالت کچھ سدھر گئی۔ جنوری ۱۹۷۴ء میں دوسری مرتبہ بیمار ہوئے۔ اب کے پھر چند دن اسپتال میں رہنے کے بعد کچھ افاقہ ہو گیا اور وہ مکان پر آگئے۔ یہیں ۱۵ فروری کو طبیعت یکایک پھر خراب ہو گئی اور دو دن بعد ۱۷ فروری ۱۹۷۴ء دوپہر کے وقت روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ اسی شام پونے نو بجے جسدِ خاکی نذرِ آتش کر دیا گیا۔

ان کی پہلی شادی ٹونک کے شری ننجی لال کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ یہ خاتون ایک لڑکی اپنی یادگار چھوڑ کر ۲۳ مئی ۱۹۲۲ء کو رحلت کر گئیں۔ اس کے بعد دوسری شادی مارچ ۱۹۲۳ء میں منشی برج موہن لال کی صاحبزادی شریمتی چاندرانی سے ہوئی۔ منشی صاحب موصوف مین پوری کے رہنے والے اور ریاست جیند میں تحصیلدار تھے، اور ان دنوں سنگرور میں تعینات تھے۔ ان کے بطن سے ماشاء اللہ پانچ بچے ہوئے: چار بیٹے اور ایک بیٹی۔ بفضلہٖ وہ خود بھی موجود ہیں اور سب اولاد بھی خوش و خرم ہے (۱۹۷۷ء)

انھوں نے شعر گوئی بہت کم عمری میں شروع کی۔ اپنے گرد و پیش کے تقاضے سے ان کا سب سے پہلا شعر فارسی میں تھا:

چیزے ز حدیث تو بقرآں نفروشم
کفرے کہ مرا ہست، بایماں نفروشم

پھر اسی زمانے میں اردو میں بھی کہنے لگے، تو کہا:

جواب نامہ لکھا دوست نے، لیکن خفا ہو کر
نوید زندگی آئی ہے پیغام قضا ہو کر

ان کے نانا کو معلوم ہوا، تو فرمایا کہ فارسی کلام میں خود دیکھوں گا، لیکن اردو کلام اصلاح

کے لیے مولانا حالی کے پاس بھیج دو۔ مرحوم کہتے تھے کہ حالی نے مشکل دو تین غزلیں دیکھی ہونگی۔ پھر لکھا کہ "مقدمۂ شعر و شاعری" کو بغور بار بار پڑھیے، اس سے مذاق سخن بھی درست ہوگا اور زبان و بیان کے حسن و قبح کی تمیز بھی پیدا ہوگی۔ افسوس کہ مجموعۂ کلام ان کی زندگی میں شائع نہیں ہو سکا۔ یوں بھی تقسیم ملک تک کا سارا کلام ضائع ہو گیا۔ یہ وہیں لاہور میں رہ گیا تھا۔ بعد کے کلام میں سے ابھی چار ہزار شعر کا انتخاب کیا تھا اور اس کی اشاعت کی فکر میں تھے کہ موت کا بلاوا آگیا۔

انھوں نے متعدد انگریزی کتابوں کے ترجمے بھی لیے تھے، یہ البتہ چھپ چکے ہیں۔ بعض رسائل میں شائع شدہ کچھ غزلوں سے چند شعر نمونۂ کلام کے طور پر درج کر رہا ہوں۔ ان کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ شعر دل سے نہیں دماغ سے کہہ رہے ہیں:

وہ کہتے ہیں: کسی پر مر کے جیتا کیوں رہے کوئی
سمجھنے کے لیے اتنا اشارا کم نہیں ہوتا

نہ کر مجھ کو ملامت، کوئی اپنے آپ، اے ناصح
گرفتارِ کمندِ زلفِ خم در خم نہیں ہوتا

بہارِ جلوہ آرا سے عبث منسوب ہے شورش
جنونِ شور ساماں کا کوئی موسم نہیں ہوتا

وہ آئینگے، نہیں آئے، خط آئیگا، نہیں آیا
غلط نکلی مری تعبیر خواب اول سے آخر تک

محبت کی سکوں ناآشنائی کم نہیں ہوتی
وہی رہتا ہے جوشِ اضطراب اول سے آخر تک

یادش بخیر، زاہدِ مرتاض کے لیے
پندار کی شکست کا ساماں ہے آجکل

گو کفر ہے پرستشِ خوبانِ خود پرست
لیکن یہاں تو کفر ہی ایماں ہے آجکل

دورانِ عیش و گردشِ ساغر، خوشا نصیب
سب راز گردشِ دوراں ہے آجکل

روا یا ناروا، ہوتا ہی کیا ہے!
وہ جو چاہیں، کریں، بیجا ہی کیا ہے!

جھگڑے میں بھی ہے اک لطف، ورنہ
ہمارا آپ کا جھگڑا ہی کیا ہے!

غمِ امروز ہی میں عمر گزری ۔ مرے امروز کا فردا ہی کیا ہے
وہ ہنس دیتے ہیں، میری بات سن کر ۔ نہ ہو یہ بات، تو رونا ہی کیا ہے
"بہت" ہے سرسری سی اک نظر بھی ۔ یہ تھوڑا سا کرم "تھوڑا" ہی کیا ہے
دو عالم کے مزے، ہیں میکدے میں ۔ یہاں جنت بھی ہے، دنیا ہی کیا ہے

کرم ان کا امید افزا نہیں ہے ۔ کبھی ہوتا، کبھی ہوتا نہیں ہے
ہمارے پاس جب ہوتے نہیں وہ ۔ کوئی ان کے سوا ہوتا نہیں ہے
ادھر بھی کچھ نہ کچھ، ہے بیقراری ۔ مگر کچھ اس طرح، گویا نہیں ہے

اٹھتا نہیں نگاہ ملانے سے ڈر مجھے ۔ لگ جائے اے خدا! بتوں کی نظر مجھے
در تک ہزار بار اک امید لے گئی ۔ گھر ہی میں پیش آ گئے کتنے سفر مجھے
اے دوستو! تمھاری عنایت کا شکریہ ۔ کب تھے نصیب رنج والم، اس قدر مجھے
دم بھر کو میری گردشِ تقدیر رک گئی ۔ جب رک گئے وہ خاک بسر دیکھ کر مجھے
اس رشکِ مہر و ماہ کی رخصت کے بعد بھی ۔ لگتا ہے اس کے نور سے معمور گھر مجھے
میں خود کو راز دہر سے کیوں بیخبر کہوں! ۔ کیا کم ہے یہ خبر کہ نہیں کچھ خبر مجھے
افوہ! اگرچہ عشق ہمیشہ کی نباہ کی ۔ پھر بھی نباہنے کا نہ آیا ہنر مجھے

کس موڑ سے گزر اور رہا تھا انھیں خیال ۔ مڑ مڑ کے دیکھتے تھے سرِ رہگزر مجھے
خوش فہم کر دیا تری الفت نے اس قدر ۔ آرام کا گمان ہے آزار پر مجھے

اظہر، احمد الدین[۵] (اے، ڈی اظہر)

سیالکوٹ (پاکستان) کے تاریخی شہر سے دس بارہ کلومیٹر دور ایک چھوٹا سا گاؤں ہے، ڈگرا خرد نام۔ یہاں زمانۂ قدیم سے لہاروں کے بہت خاندان آباد ہیں (یا کم از کم ۴۰ برس اُدھر تک تھے)، اسی لیے بعض اوقات اسے کوٹلی لہاراں بھی کہتے ہیں۔ احمد الدین ۱۹۰۰ میں اسی گاؤں میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد رسمی تعلیم سے بہرہ ور نہیں تھے۔ لیکن آئے دن کا مشاہدہ ہے کہ بعض اوقات بالکل ان پڑھ آدمی بھی علماء و فضلا کی صحبت میں رہتے رہتے نہ صرف خود علمی اور دینی مسائل سے واقف ہو جاتا ہے، بلکہ اس میں زیادہ علم حاصل کرنے کی اور اپنی اولاد کو بھی تعلیم دلانے کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی صورت حال یہاں بھی پیش آئی۔

احمد الدین کی تعلیم کا آغاز گاؤں کی مسجد سے ہوا کیونکہ یہاں کوئی مکتب نہ تھا، نہ اسکول۔ مسجد میں بھلا تعلیم کیا ہوتی! پیش امام صاحب نے نماز یاد کرا دی۔ وضو اور طہارت کی کچھ ابتدائی باتیں بتا دیں۔ اور پھر ناظرہ قرآن پڑھانے لگے۔ البتہ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ وہ اُردو کے اتنے حرف شناس ہو گئے کہ جلد ہی اردو رسم الخط میں لکھی ہوئی پنجابی زبان کے منظوم قصے اور سی حرفیاں روانی سے پڑھنے لگے۔ ان کے والد نے دیکھا کہ لڑکا ہونہار ہے۔ ڈگرا خرد سے چند کوس دور ایک دوسرے گاؤں میں ڈسٹرکٹ بورڈ کا پرائمری مدرسہ تھا؛ انھوں نے احمد الدین کو وہاں بھیج دیا۔ یہ اپنی بستی کے پہلے طالب علم تھے، جو کسی مدرسے میں داخل ہوئے۔ احمد الدین

---

۵ بیشتر اصحاب نے ان کا نام "احمد دین" لکھا ہے؛ ٹھیک اور پورا نام "احمد الدین" تھا۔

نے پرائمری کے چاروں درجے تو مکمل کر لیے، لیکن اس کے بعد، خدا معلوم کیا اُفتاد پڑی کہ بھاگ نکلے۔ ڈیڑھ دو سال تک گاؤں گاؤں چوپالوں میں قصے سناتے اور پھر پڑھتے پھرے، یا پھر اپنے ہم عصر لڑکوں کے ساتھ کھیل کود میں مصروف رہے۔ ان کے والد دل مسوس کر رہ جاتے کہ بیٹا کس راہ پر چل نکلا ہے۔ لیکن آدمی تھے بُردبار اور سمجھدار؛ انھوں نے ڈانٹ ڈپٹ کی جگہ نفسیاتی علاج کا راستہ اختیار کیا۔ ایک مرتبہ اُن کا کسی کام سے سیالکوٹ جانا ہوا۔ واپسی پر بیٹے کے لیے گلستان سعدی اور عربی کی کتاب الصرف اور کتاب النحو کا ایک ایک نسخہ لیتے آئے۔ احمد الدین بھانپ گئے کہ والد کی کیا تمنا ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ پڑھنے لکھنے میں جُٹ گئے؛ اور دم اس وقت لیا، جب مرے کالج، سیالکوٹ سے بی اے کی سند لے لی۔

اسکول اور کالج میں ریاضی اور عربی ان کے خاص مضمون تھے۔ تعلیمی مشاغل کے علاوہ لڑنا بھڑنا اور اپنے احباب کے جھگڑوں میں ان کے لیے ہر موقع پر سینہ سپر ہو جانا اُن کا طرۂ امتیاز تھا۔ اسی لیے اپنے بے تکلف دوستوں کے حلقے میں وہ "جرنیل" کے لقب سے مشہور تھے (اور اس عرف سے وہ آخر تک پکارے گئے)

مرے کالج، سیالکوٹ کی تعلیم کے زمانے میں انھوں نے شمس العلما مولانا سید میر حسن مرحوم (ف: ستمبر ۱۹۲۹ء) سے بھی استفادہ کیا تھا، جن کا نام علامہ اقبال (ف: اپریل ۱۹۳۸ء) کی سوانح عمری میں بہت نمایاں ہے۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد اولاً چندے تدریس کا مشغلہ رہا۔ چونکہ ریاضی اور حساب کتاب سے شغف تھا، اس لیے انڈین آڈٹ اینڈ اکاؤنٹ سروس کے امتحانِ مقابلہ میں بیٹھے اور کامیاب ہو گئے۔ اس کے بعد سب سے پہلا تقرر راولپنڈی کے ملٹری اکاؤنٹس کے دفتر میں ہوا۔ راولپنڈی کے زمانۂ قیام کا ایک لطیفہ قابلِ ذکر ہے:

شہر میں مسلمانوں کا خاصا بڑا جلسہ منعقد ہوا، جس میں تعلیمی، معاشی اور سماجی مسائل پر مختلف اصحاب نے تقریریں کیں۔ جلسے کی صدارت اپنی جوان عمری کے باوجود، اظہر صاحب کے حصے میں آئی۔ ایک پرانی وضع کے مقرر کی جو شامت آئی، انھوں نے اپنی تقریر

میں مختلف جماعتوں کی بےعلمی اور بےحسی پر اعتراض کرنا شروع کر دیے اور چونکہ خود عربی کے عالم تھے، جہاں تہاں اپنی علمیت کا سکہ جمانے کے لیے عربی کے جملے اور اقتباس بھی تضمین کرتے گئے۔ اظہر مقررہ کے لہجے اور خاص اپنے تمام کی تنک سے سخت منغض ہوئے۔ جب جلسے کے اختتام پر وہ صدارتی تقریر کرنے کو اٹھے، تو انھوں نے موصوف کو آڑے ہاتھوں لیا اور ان کی عربی دانی کی دھجیاں بکھیر دیں۔ انھوں نے جو عربی فقرے کہے تھے یا اقتباس سنائے تھے، ان میں صرف و نحو کی غلطیوں کی نشاندہی کی اور کہا کہ اگر دوسروں نے ملی تعلیم کی طرف سے غفلت برتی ہے، تو آپ نے جو تعلیم پائی ہے، اسی میں کونسا سرخاب کا پر حاصل کر لیا!۔

اس کے بعد تو شہر میں اظہر کی دھاک بیٹھ گئی۔ جدھر نکلتے، انگلیاں اٹھتیں کہ دیکھو یہ انگریزی لباس میں، سوٹ بوٹ پہنے افسر، عربی کا اتنا بڑا عالم ہے کہ اس نے فلاں مولوی کی تقریر کی بھرے جلسہ غلطیاں نکالیں"۔

راولپنڈی سے تبدیلی ہوئی، اور یہ حکومت ہند کے سپلائی اور ریلوے کے محکموں میں ڈپٹی فنانشل مشیر کے عہدے پر مقرر ہو کر دلی آ گئے۔ یہاں ان کی علمی اور ادبی سرگرمیاں المضاعف ہو گئیں۔ جب ملک تقسیم ہوا ہے، تو یہ آسٹریلیا میں ہندستان کے ٹریڈ کمشنر (مندوب تجارتی) کی حیثیت سے سڈنی میں متعین تھے۔ انھوں نے اپنی خدمات حکومت پاکستان کو پیش کر دیں، اور وہیں اس ملک کے پہلے مندوب تجارتی بنا دیے گئے۔ وہاں سے ۱۹۴۹ء میں وطن واپس آئے جہاں پہلے مشرقی پاکستان میں تعینات ہوئے۔ قیام چاٹگام میں رہا تھا۔ تین سال بعد وسط ۱۹۵۲ء میں حکومت پنجاب میں سکرٹری مال اور پھر مرکزی حکومت پاکستان میں جائنٹ سکرٹری مقرر ہوئے۔ سب سے آخر ۱۹۵۷ء میں پاکستان کے سفارت خانہ لندن میں مشیر مالیات و وزیر اقتصادیات مقرر ہو کر لندن گئے۔ وہاں سے ۱۹۵۸ء میں کراچی آئے اور جلد بعد ہی یہاں ملازمت سے پنشن پر سبکدوش ہو گئے۔ اس کے بعد کراچی کی ایک تجارتی فرم ڈین اینڈ ویبر کے مینیجنگ ڈائرکٹر مقرر ہو گئے تھے۔

بچپن کا ابتدائی زمانہ چھوڑ کر صحت ہمیشہ قابلِ رشک حد تک اچھی رہی۔ لیکن زندگی کی بے اعتدالیوں نے کہیں کا نہ چھوڑا۔ عارضۂ قلب کا پہلا حملہ مئی ۱۹۵۹ء میں ہوا۔ بارے علاج معالجے سے بچ نکلے۔ لیکن دل کی بیماری ایسی ہے کہ اگر اس میں پوری احتیاط نہ کی جائے، تو یہ بدبخت کام تمام ہی کر کے پیچھا چھوڑتی ہے۔ اپنی فطری "لذتِ آوارگی" اور لاابالیانہ پن کے طفیل، اظہر سے یہ احتیاط ہو نہ سکی اور بالآخر اسی میں ۲۴ فروری ۱۹۷۴ء کو کراچی میں جان بحق ہو گئے۔ کراچی کے فوجیوں کے قبرستان میں آخری آرامگاہ نصیب ہوئی۔

اپنی عربی فارسی کی تعلیم کی بدولت مدتوں ان کا رجحان تحقیق کی طرف رہا۔ اس زمانے میں انھوں نے بعض بلند پایہ علمی مضامین قلمبند کیے، جو مختلف رسائل میں بکھرے ہوئے ہیں۔ انھیں جمع کر دینے کی ضرورت ہے۔ لیکن بنیادی طور پر ان کا مزاج رومان پرور اور شاعرانہ تھا۔ رہی سہی کسر ان کی عیش کوشی اور تن پروری نے پوری کر دی۔ ان کے کلام میں ان کے تعلقاتِ حسن و عشق کی بعض تلمیحات موجود ہیں، جن سے واقفانِ حال بخبیر ہیں۔ کلام کا مختصر مجموعہ "لذتِ آوارگی" ان کی زندگی میں چھپا تھا (لاہور ۱۹۶۱ء) اس میں سب اصنافِ سخن کا کلام موجود ہے۔ اس کے بعد کا کلام بھی چھپ جانا چاہیے، تاکہ ضائع ہونے سے محفوظ ہو جائے۔

عربی فارسی کے بعد ان کا دوسرا موضوعِ مطالعہ مذہبیات تھا؛ اور اس میں بھی اسلام اور عیسائیت کا تقابلی مطالعہ۔ عیسائیت پر ان کی بڑی گہری نظر تھی۔ اس کے عقائد سے لے کر مشنریوں کی تبشیری سرگرمیوں اور دسیسہ کاریوں تک اس کی تاریخ کا کوئی گوشہ ان سے مخفی نہیں تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اہلِ اسلام کو ان کے ہمہ رنگ زمین دام کی موجودگی اور اس کے دور رس نتائج سے خبردار کر دیں۔ اسی مقصد سے انھوں نے انگریزی میں ایک کتاب لکھنا شروع کی تھی:

Christianity in History

خدا معلوم، وہ اسے مکمل کر سکے یا نہیں؟ اور اس کا مسودہ کہاں ہے؟ بڑے کام کی چیز تھی!

نمونہ کے چند شعر دیکھیے:

اک تری بے رخی سے، دوست! کتنے چراغ بجھ گئے
پھول میں رنگ و بو کہاں! چاند میں چاندنی کہاں!

حسن کی ساکھ عارض و زلف ہی سے یہاں نہیں
لاکھ حسیں جہاں میں ہوں، تیری سی دلبری کہاں!

تم نے تو جیسے عمر ہی ہجر کی شب میں ڈھال دی
میری کبھی سنی کہاں! اپنی کبھی کہی کہاں!

چھوڑے جاتے ہو جسے ویرانہ — پھر اسی دل میں بسائینگے تمھیں
کاش! وہ بھی تو کہیں مجھ سے کبھی — روٹھ جاؤ، تو منائینگے تمھیں

مری عاشقی سہی بے اثر، تری دلبری نے بھی کیا کیا
وہی میں رہا، وہی بیدلی، وہی رنگ لیل و نہار ہے

نہیں خوب کچھ، نہیں زشت کچھ، یہ نگاہ و دل کے طلسم ہیں
کبھی ہے چمن کا چمن خزاں، کبھی ایک گل ہی بہار ہے

ہے محبت بھی عجب کھیل کہ اس بازی میں
لطف سے ہے کبھی لذت، کبھی دشنام سے ہے

راہِ الفت میں اک ایسا بھی مقام آتا ہے
کہ جہاں کام نہ آغاز، نہ انجام سے ہے

میں رہِ عشق میں پہنچا ہوں وہاں اب کہ جہاں
حاجتِ راز خود اپنے دلِ ناکام سے ہے

تھا جس پہ ناز کبھی، اب وہ آرزو نہ رہی — نیازِ عشق کی پہلی سی آبرو نہ رہی
تو ایک بار تو آ، دل بھریں تمنا کے — اگرچہ اب وہ تمنا کی آبرو نہ رہی

نشیمن اپنا ہے پھر برق و باد سے سرشار — نئی بہار بھی کیا سازگار گزری ہے
میں اپنے دعویٰ الفت سے آج باز آیا — گزر گئی ہے، مگر شرمسار گزری ہے

وہ کہتے ہیں: اگر تجھ کو جفا راحت نہیں ہوتی
تو الفت چھوڑ دے، اس رنج سے الفت نہیں ہوتی
اک ایسا بھی مقام آتا ہے راہِ عشق میں اظہرؔ
جہاں انجام بینی کے لیے فرصت نہیں ہوتی

اس سے تو ہمیں انکار نہیں، دنیا کی ساکھ کرم سے ہے
لیکن اس الٹی دنیا میں خود ساکھ کرم کی تم سے ہے
تم حسن میں لاثانی ہو، تو کیا؛ سب ہیچ ہے جب تک عشق نہیں
جس حسن کی شان دکھاتے ہو، اس حسن کی آن تو ہم سے ہے
جب آس ہی ٹوٹ گئی اپنی، پھر کون کریگا شکوے گلے!
اس کھیل کا سارا لطف ترے اک لطف و کرم کے بھرم سے ہے
ہم دل کی بات سناتے ہیں، تم دنیا ہمیں جتاتے ہو
تم دنیا والے کیا جانو، یہ دنیا دل کے دم سے ہے
اک عالم جب ہم دیکھ آئے، تب جا کے ہمیں معلوم ہوا
سب رونق اپنے دم سے ہے، عالم کا عالم ہم سے ہے
ہم جن پہ ہر دم مرتے ہیں وہ ہم کو دیکھ کے ڈرتے ہیں
ہے یہ بھی پیار ہی کی صورت، اس حسن کی شان ہی رم سے ہے
تقدیر محبت غم ہی سہی، تسلیم ہمیں، لیکن، اظہرؔ!
اس غم پہ ہزار خوشی قرباں، یہ غم ہے، تو سب کچھ غم سے ہے

اظہرؔ کو سنجیدہ مزاح پر بھی غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ بلکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ ان کی طبعی شگفتگی اور جدت پسندی اور بذلہ سنجی کے پورے جوہر ان کے فکاہی کلام ہی میں کھلتے ہیں۔ ان کے مجموعۂ کلام میں کئی منظومات اس دوسری قبیل کی بھی ملتی ہیں۔ نمونے کے طور پر ایک نظم دیکھیے، جس کا عنوان ہے: ایک دمہ گیر کی دوسری شادی پر۔ اس میں انشا کی مشہور غزل کا تتبع کیا گیا ہے

کراچی میں کمر باندھے ہوئے سب یار بیٹھے ہیں
جو بیاہے جا چکے اک بار، پھر تیار بیٹھے ہیں
جسے دیکھو، وہی ہے دوسری بیوی کے چکر میں
غنیمت ہے موحد جو یہاں دو چار بیٹھے ہیں
نہ چھیڑ اے شیخ! ہم یونہی بھلے، چل راہ لگ اپنی
تجھے تو بیویاں سو بھی ہیں، ہم بیزار بیٹھے ہیں
نہ کریں چار جب تک شیخ جی، کیوں دم لگے لینے
وہ دو کر کے بھی کہتے ہیں کہ ہم بیکار بیٹھے ہیں
کہاں اب چین گھر کا، جب سے بیوی دوسری آئی
"نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار، بیٹھے ہیں"
بلائے ناگہانی ہے، ہوسِ زوجۂ ثانی
جو بیوی جیت کر اٹھے، وزارت ہار بیٹھے ہیں
بھلا اپوا کی لاٹھی چین دیتی ہے کسے؟ اظہرؔ!
سبھی شوہر یہاں بھینس بنے، لاچار بیٹھے ہیں

ہ (All Pakistan Women's Association) APWA ملک میں عورتوں کی سب سے بڑی انجمن۔ کسی زمانے میں اس کا بڑا زور تھا

ساگر نکودری، بلونت کمار

پنجاب کے ضلع جالندھر میں ایک مختصر قصبہ نکودر ہے، وہیں کے رہنے والے تھے۔
تاریخ ولادت ۲۴ دسمبر ۱۹۱۲ء ہے۔ ان کے والد ساور لال نکودر منڈی میں چھوٹا موٹا
کام کرتے تھے۔ چونکہ گھر کے حالات تسلی بخش نہیں تھے، اس لیے بلونت کمار کی تعلیم
خاطر خواہ نہ ہو سکی، بمشکل پرائمری کے درجے پورے کر سکے۔
ہوش سنبھالا تو کسی نہ کسی طرح گھڑی سازی کا کام سیکھ لیا اور اسی کو بسر اوقات کا
ذریعہ بنایا۔ اس سلسلے میں مختلف شہروں میں قیام رہا۔ جب ۱۹۳۰ء میں مہاتما گاندھی
نے نمک ستیہ گرہ شروع کیا، تو یہ بھی میدان میں کود پڑے، پکڑے گئے اور جیل پہنچے۔
یہ تجربہ بعد کو بھی دو ایک مرتبہ ہوا۔
جیل خانے کے زمانے میں انھیں وہاں کے کتابخانے سے استفادے کا موقع ملا، جس
سے استعداد میں معتد بہ اضافہ ہوا۔ اب انھیں شعر گوئی کا شوق چرایا۔ رہا ہوئے،
تو اپنے پڑوس میں روشن لال روشن نکودری کی خدمت میں جانے لگے۔ ان سے مشورہ
کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں شعر کے حسن و قبح کی تمیز ہونے لگی۔ اس پر روشن نے انھیں
اپنے استاد حضرت جوش ملسیانی (ف: جنوری ۱۹۷۶ء) کے حوالے کر دیا؛ یہ ۱۹۳۷ء
کی بات ہے۔ جوش صاحب کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہونے کے بعد انھوں نے پھر
کوئی اور در نہیں دیکھا اور آخر تک انھیں کے دامن سے وابستہ رہے۔ انھیں
جوش صاحب سے طویل استفادے کا موقع ملا۔ شاعری کے علاوہ جوش صاحب کے
دو شوق اور تھے: حقہ اور شطرنج۔ ساگر جب ان کی خدمت میں ہوتے، تو حقہ تازہ

کرنے کی خدمت اکثر ان کے حصّے میں آتی۔ خود ایک شعر میں کہا ہے:۔

مری آتش بیانی کیوں نہ پائے داد اے ساگرؔ!
بھری ہیں میں نے چلمیں جوشؔ سے کامل سخنداں کی

۲۵ فروری ۱۹۷۴ء کو حلق کے کینسر سے جاں بحق ہوئے۔ اولادِ جسمانی سے کوئی نام لیوا اپنی یادگار نہیں چھوڑا۔

اُردو اور ہندی دونوں زبانوں میں معتد بہ کلام موجود ہے ڈرامے اور افسانے بھی لکھے، ہندی میں رامائن ڈراما کی شکل میں "نر لیلا" کے نام سے لکھی تھی "شکنتلا" ناٹک بھی ہندی میں ہے۔ ایک سوشل ڈراما "سودا" نام کا بھی موجود ہے۔ افسوس کہ حالات کی ناسازگاری کے باعث ان کی زندگی میں کوئی چیز شائع نہ ہو سکی۔ اُردو کلام کا انتخاب "مد و جزر" کے عنوان سے ان کی وفات کے بعد شائع ہوا (اکتوبر ۱۹۷۴ء) کلام بے عیب ہے جس کی حضرت جوشؔ ملسیانی کے کسی شاگرد سے توقع ہو سکتی ہے، لیکن اس میں کوئی نمایاں خصوصیت نہیں پائی جاتی۔

چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

دنیا میں خوشی سے وہ بشر رہ نہیں سکتا — دنیا کے جو آزادِ ستم سہ نہیں سکتا
جس کو نہیں کوئی بھی غم، اس کو ہے غم مرگ — آرام سے دنیا میں کوئی رہ نہیں سکتا

مجھ کو سمجھانے سے باز آتا نہیں — کیوں کوئی ناصح کو سمجھاتا نہیں
زندسے کیا نسبت، اے ناصح تجھے — وہ بہک جاتا ہے، بہکاتا نہیں
کس سے پوچھیں حال یارانِ عدم — جو وہاں جاتا ہے، وہ آتا نہیں

اب مصیبت ہے، نہ غم ہے، نہ ہے مشکل کوئی — موت نے آکے دیا خوب سہارا مجھ کو

چارہ سازِ دلِ مضطر ہے یہی، اے ناصح! — کس طرح ترکِ محبت ہو گوارا مجھ کو

زخمِ دل بھی تو چھپکی ہی رہی راہِ محبت میں — مگر دیوانگی بھٹکی، تو وہ منزل پہ جا نکلی

محبت باعثِ آرامِ جاں معلوم ہوتی تھی — مگر اب باعثِ آزار کیوں ہے، ہم نہیں سمجھے

ذوقِ نظر حسیں ہے، تو سب کچھ حسین ہے — جب یہ نہیں، تو کوئی بھی صورت حسیں نہیں

جینا ترے بغیر، تو مرنا ترے حضور — آسان بھی نہیں، مجھے دشوار بھی نہیں

رہبر ہو محبت میں اگر جذبۂ کامل — رہرو کو غمِ دوریِ منزل نہیں ہوتا

یہ آرزو بھی کہ ہم شرحِ آرزو کرتے — زباں نہ چلتی، تو آنکھوں سے گفتگو کرتے
ہمیں تو مل نہ سکی موت بھی محبت میں — حیات کے لیے کیا خاک آرزو کرتے

اس سے بھی آگے ہے کچھ منزل جبینِ شوق کی
کعبہ ہی کافی نہیں ہے سر جھکانے کے لیے

داغِ لالہ، خونِ بلبل، رنگِ گل، نورِ شفق
سو خیال آتے ہیں اک دل کے بہلانے کے لیے

مطرب ہے، مے ہے، صحنِ چمن ہے، بہار ہے — ایسے میں آئیگا نہ وہ جانِ بہار کیا!
یہ کم ہے کیا کہ ان سے ملاقات ہو گئی — اے دل! وہ بات کرتے سرِ رہگزار کیا

ہے تمنا ہی پہ موقوف مدارِ ہستی — یہ جو مر جائے، تو انسان بھی مر جاتا ہے

کچھ مستیِ شباب ہے، کچھ نشۂ شراب — لغزش ہے ان کے پاؤں میں، لکنت زبان میں

میری آنکھوں میں کھٹکتا ہے چمن، تیرے بغیر
ہر گلِ تر مجھے کانٹا سا نظر آتا ہے

کیا لکھا ہے مری قسمت میں، خدا خیر کرے
چہرہ اترا ہوا قاصد کا نظر آتا ہے

آپ کرتے ہیں جو منہ پھیر کے اقرارِ وفا
اس میں بھی صورتِ انکار نظر آتی ہے

موت کے ایک ہی جھونکے سے یہ گر جائیگی
زندگی ریت کی دیوار نظر آتی ہے

چوٹیں بھی سب طرح کی کھاتا ہے دل — صدمے بھی شبِ غم کے اٹھاتا ہے دل
لیکن شیشے سے بھی وہ نازک تر ہے — اک ٹھیس لگے، تو ٹوٹ جاتا ہے دل

حال و ماضی کی، اور مستقبل کی — رہتی ہے خبر اسے ہر اک منزل کی

دنیا کے خیالات کا مرکز دل ہے
دنیا سے مگر جدا ہے دنیا دل کی

آجائیگی جس وقت اجل کیا ہو گا!
اس خدشۂ بیمل کا حل کیا ہو گا!

تو آج کی رات کو تو غم نہیں، نہ بدل
ناداں! کسے معلوم ہے کل کیا ہو گا!

جب غنچہ سرِ شاخ چٹک جاتا ہے
کانٹا سا محبت کا کھٹک جاتا ہے

جو دل پہ گزرتی ہے، نہ پوچھ اے ساگر!
منصور سرِ دار لٹک جاتا ہے

بدنام کی صحبت کا ہے انجام برا
چوری سے بھی چوری کا ہے انجام برا

یہ قول بھی کیا خوب ہے، داناؤں کا
فرماتے ہیں: بد اچھا ہے بدنام بُرا

محمود احمد عبّاسی، امروہوی

ان کے خاندان کا سلسلہ بواسطۂ خلیفۂ عباسی (بغداد) امین الرشید (خلف ہارون رشید)
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ ابن عبدالمطلب تک پہنچتا ہے۔
خلیفہ امین الرشید (۸۰۹ - ۸۱۲ء) حضرت عباسؓ سے نویں پشت میں تھے جب
۱۲۵۸ء میں ہلاکو خان نے بغداد کو تاراج کیا اور آخری خلیفۂ بنی عباس مستعصم باللہ
کو تہ تیغ کر دیا، تو اس خاندان کے اکثر اشخاص جان اور ناموس بچانے کی خاطر
ترکِ وطن پر مجبور ہوئے۔ انھیں خلیفہ امین سے دسویں پشت میں مخدوم زادہ محمد
یوسف بھی تھے، وہ ہندستان چلے آئے۔ یہ سلطان غیاث الدین بلبن کا عہدِ حکومت
تھا۔ سلطان نے ان کی خاندانی عظمت اور علمی حیثیت کے پیشِ نظر انھیں ہاتھوں
ہاتھ لیا، اور شایانِ شان منصب اور عہدہ عطا کیا۔ یہ خاندان ایک صدی تک آرام و
آسایش سے دلّی میں مقیم رہا تھا کہ اتنے میں قہرِ خداوندی امیر تیمور کی شکل میں نازل
ہوا۔ اب مخدوم زادہ محمد یوسف سے چوتھی پشت میں مولانا شمس الدّین یہاں سے
نکل کر پنجاب چلے گئے اور زندگی کے بقیہ ایام انھوں نے وہیں بسر کیے۔ ان کے
پوتے مولانا رکن الدین عبّاسی (ابن مولانا نظام الدّین) سلطان سکندر لودی کے
عہد میں پنجاب سے نقلِ مکان کر کے امروہہ آئے۔ عبّاسیانِ امروہہ انھیں مولانا
رکن الدین کے اخلاف ہیں۔

مولانا رکن الدّین کی نویں پشت میں مولانا سیّد احمد علی شاہ عبّاسی پچھلی صدی کے
صاحبِ صورت و سیرت بزرگ تھے۔ شروع سے خاندانی جاہ و ثروت سے کنارہ کش

اور یادِ اللہ میں مشغول رہے۔ اگرچہ باقاعدہ حضرت حافظ موسیٰ چشتی قادری مانکپوری سے بیعت تھے، لیکن دوسرے سلاسلِ طریقت مثلاً صابریہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ میں بھی خلافت و اجازت سے سرفراز ہوئے۔ تمام وقت مطالعۂ کتبِ دینیہ میں صرف ہوتا یا عبادتِ الٰہی میں۔ پیر کے دن ۲۹ شوال ۱۲۹۷ھ (۴ اکتوبر ۱۸۸۰ء) کو اکیاسی سال کی عمر میں انتقال کیا۔ امروہہ میں شاہ علاؤل کی درگاہ میں، بلکہ انھیں کے پہلو میں دفن ہوئے۔

سید احمد علی شاہ کے اکلوتے فرزند سید علی محمد عبّاسی ۱۲۴۷ھ (۱۸۳۱-۱۸۳۲ء) میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے دینی تعلیم اور درسِ نظامیہ کی تکمیل مختلف اساتذہ سے کی پھر حکومتِ انگریزی میں ملازم ہو گئے۔ اسی اثنا میں وکالت کا امتحان پاس کر کے اسے بطورِ پیشہ اختیار کر لیا۔ پہلے مختلف مقامات پر کام کیا، لیکن بالآخر امروہہ میں مقیم ہو گئے۔ ان کا شہر کے اکابر میں شمار ہوتا تھا۔ انھیں ۱۸۹۷ء میں رحلت کی اور اپنے والد کے پہلو میں جوارِ حضرت شاہ علاؤل میں دفن ہوئے۔

سید علی محمد عبّاسی نے اپنے زندگی میں دو نکاح کیے۔ پہلی بیوی سے دو بیٹیاں اور چار بیٹے ہوئے۔ سب کے نام لکھنا طوالت سے خالی نہیں۔ البتّہ دو قابلِ ذکر ہیں: سب سے بڑے محمد داؤد عبّاسی جو کسی زمانے میں علی گڑھ میں طالبِ علم تھے اور جن کا حالی کے بعض اشعار کی تضمین کے سلسلے میں بہت لوگوں نے ذکر کیا ہے، انھیں سید علی محمد عبّاسی کی پہلی بیوی کے بطن سے تھے۔ وہ ۲۰ رمضان ۱۲۸۰ھ (۲۹ فروری ۱۸۶۴ء) کو امروہہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا بعارضۂ تپِ دق ۲۷ جون کو فتح آباد (ضلع آگرہ) میں انتقال ہوا، اور وہیں احاطۂ عیدگاہ میں دفن ہوئے (خمخانۂ جاوید(۳) میں دونوں تاریخیں غلط ہیں)۔ ان کی مثنوی "لحن داؤدی" محمود احمد عبّاسی نے شائع کی تھی۔ محمد داؤد کے چھوٹے بھائی حکیم فرید احمد عبّاسی کا اپنے عہد کے مشہور طبیبوں میں شمار تھا۔ وہ مدتوں طبیہ کالج، دلّی کے پرنسپل بھی رہے۔

سیّد علی محمد عبّاسی کی دوسری بیوی شیخ غلام محمد صدّیقی کی صاحبزادی (صغیر النساء)

تھیں ۔ ان بیگم سے ایک بیٹی اور چار بیٹے ہوئے ۔ محمود احمد عبّاسی بیٹوں میں سب سے بڑے تھے ؛ یہ گویا محمد داؤد عبّاسی مذکورالصدّر کے علاتی بھائی تھے ۔ وہ منگل کے دن ۱۴ جمادی الثانی ۱۳۰۲ھ (۳۱ مارچ ۱۸۸۵ء) بوقتِ صبح امروہہ میں پیدا ہوئے ۔ بچپن ہی سے وہ اپنے نانا شیخ غلام محمد صدیقی کے زیر اثر آ گئے ، جو ان کے والد ہی کے ساتھ مقیم تھے ۔ وہ انھیں اولیاء اللہ کے واقعات سناتے ؛ اگر کسی درویش کی ملاقات یا بزرگ کی زیارت کو جاتے ، تو انھیں ساتھ لے جاتے ۔ اس سے ان کے دل میں تاریخ اور سیرت اولیا اور تصوّف کا شوق پیدا ہوا ، جس سے گویا بعد کے زمانے کے مطالعے کا رُخ متعیّن ہو گیا ۔

تعلیم کا زمانہ آیا تو امروہہ ہائی اسکول میں داخلہ ملا ۔ یہیں زیر تعلیم تھے کہ ۱۸۹۷ء میں والد کا انتقال ہو گیا ۔ اب یہ اپنے دوسرے علاتی بھائی ڈاکٹر محمد احسن عباسی کے پاس آنولہ اور رائے بریلی میں رہنے لگے ، وہاں میڈیکل افسر کی حیثیت سے تعینات تھے ۔ دسویں درجے تک تعلیم بھی وہیں پائی ۔ اس کے بعد لکھنؤ کالج میں بھیج دیے گئے ۔ وہاں یہ کالج اقامتگاہ سے باہر ایک ذاتی مکان میں رہتے تھے ۔ اور یہی ان کی تعلیم سے بے توجہی کا باعث ثابت ہوا ۔ نواب وقار الملک ، مولوی مشتاق حسین امروہوی ان کے والد کے دوست تھے ۔ اگرچہ انھوں نے لکھنؤ میں اپنے ایک ممتاز دوست کو ان کے حالات کی نگرانی اور تعلیمی رہنمائی پر مقرر کر دیا تھا ، لیکن یہ صاحب اپنا فرض بوجہ احسن بجا نہ لائے ۔ غرض محمود احمد عبّاسی کی تعلیم نامکمل رہ گئی ؛ لیکن ان نگران صاحب کی بدولت ان کا شہر کے متعدّد ادیبوں اور ادبا سے تعارف ہو گیا ۔ انھیں میں شبلی اور شرر بھی تھے ۔ تعلیمی زمانے میں اگر کسی کو مجلس آرائی اور ہنگامہ پروری کا چسکا پڑ جائے ، تو تعلیم کے لیے اس سے زیادہ مہلک اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی ۔ یہاں بھی یہی ہوا ۔

مولانا شبلی اور شرر کے زیر اثر ان کا زیادہ وقت تاریخ و سیر کی کتابوں اور سیاسی اور قومی لٹریچر ، رسائل و جرائد کے مطالعے میں صرف ہونے لگا ، اور وہ نصاب کی طرف سے

بے پروا ہو گئے۔ چنانچہ امتحان میں بار بار ناکام رہے، اور سیاسیات میں روز بروز زیادہ محو رہنے لگے۔

لکھنؤ میں مزید قیام بیکار بھی تھا اور ذریعۂ معاش کے فقدان کے باعث تکلیف دہ بھی۔ چنانچہ مسلم اسکول، بریلی میں مدرس ہو کر چلے گئے۔ اتّفاق سے یہی وہ زمانہ ہے جب مولانا حالی اپنے مرگی کے مریض نواسے عبدالولی کے علاج کے لیے یہاں مقیم تھے۔ جس طرح قیام لکھنؤ کے زمانے میں شبلی اور شرر نے محمود احمد عبّاسی کی حوصلہ افزائی کی تھی، اسی طرح حالی بھی ان کے علمی ذوق اور ادبی رجحان کو دیکھتے ہوئے، ان سے لطف و عنایت سے پیش آئے۔ عبّاسی صاحب نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا؛ ان کا مضمون نگاری کا شوق دراصل ان کی اسی حالی سے ملاقات کا مرہون منّت تھا۔ یوں رسمی تعلیم کا جو سلسلہ منقطع ہو گیا تھا، اس نقصان کی بھی کچھ تلافی ہو گئی۔

حالی ان سے بہت شفقت سے پیش آتے رہے۔ دونوں میں خط و کتابت کا سلسلہ بھی تھا (جیسا کہ مکتوبات حالی میں شائع شدہ خطوط سے ظاہر ہے)۔ آخر کار انھیں کی سفارش پر عبّاسی صاحب کو ۱۹۰۸ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، علیگڑھ کے دفتر میں بطور نجی معاون (پرسنل اسسٹنٹ) ملازمت مل گئی۔ عبّاسی صاحب یہاں ۱۴ برس رہے۔ ان میں سے تقریباً دس برس انھوں نے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں جائنٹ سکرٹری (ف: جنوری ۱۹۳۰ء) کے ماتحت کام کیا۔ وہ ان سے بہت خوش اور مطمئن تھے۔ چنانچہ انھوں نے عبّاسی صاحب کو درجہ بدرجہ ترقی دے کر ادبی معاون اور پھر صدر دفتر کا قائم مقام سپرنٹنڈنٹ بنا دیا۔ جب تک وہ ستمبر ۱۹۱۷ء میں وزیر ہند کی کونسل کے رکن بن کر انگلستان تشریف نہیں لے گئے، یہ بے غل و غش یہاں کام کرتے رہے۔ اور اس زمانے کے تمام اصحاب بجا طور ان کے کام کی تحسین کی۔ صدر یار جنگ) مولانا محمد حبیب الرحمان خاں شروانی (ف: ۱۱ اگست ۱۹۵۰ء) بھی اسی زمانے میں حضور نظام دکن کی خواہش پر صدر الصدور امور مذہبی ہو کر حیدرآباد چلے گئے۔ ان کے بعد جن اصحاب کے ہاتھ میں کانفرنس کی

بانگِ درا آئی، ان سے اختلافات پیدا ہو گئے۔ کانفرنس نے صاحبزادہ صاحب موصوف کی سفارش پر انھیں انگلستان جا کر تعلیمی امور کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے چھ ہزار روپے وظیفہ دینا منظور کیا تھا۔ عبّاسی صاحب نے سفر کے تمام انتظامات مکمل کر لیے تھے۔ لیکن مخالفین کی ریشہ دوانیوں کے باعث نہ صرف یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی، بلکہ انھیں ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اس کے بعد لمبی غیر حاضری کے بعد یہ اپنے وطن امروہہ واپس آ گئے۔

یہ طویل قیام علیگڑھ ان کے دل و دماغ کی صلاحیتوں کی پختگی کے لیے بہت مفید ثابت ہوا۔ کارِ منصبی سے جو وقت بچتا، وہ اسے مطالعے میں صرف کرتے۔ کالج اور کانفرنس کے کتب خانوں میں کتابوں کی کمی نہیں تھی۔ اس پر افسر ایسے ملے، جو کام اور علم کے قدردان تھے۔ عبّاسی صاحب کے دل میں بھی امنگ اور کام کرنے کا ولولہ موجود تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے مختلف موضوعات کے بارے میں وسیع مطالعے سے اپنی معلومات اور لیاقت میں معتد بہ اضافہ کر لیا۔

اب امروہے میں مقیم ہوئے، تو رفاہِ عام کے کاموں میں دلچسپی لینے لگے، لیکن ابنائے وطن کے عدمِ تعاون، بلکہ عملی مخالفت کے باعث اس میں کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ اسی زمانے میں مولانا محمد علی جوہر مرحوم (ف: جنوری ۱۹۳۱ء) نے دلّی سے اپنا مشہور روزنامہ "ہمدرد" جاری کیا۔ انھوں نے عبّاسی صاحب کو بھی اس کے صیغہ، ادارت میں کام کرنے کی دعوت دی، جو انھوں نے قبول کر لی۔ اس سلسلے میں کوئی سال بھر دلّی میں قیام رہا تھا۔

امروہے کے قیام کے زمانے میں انھوں نے "تاریخ امروہہ" (جلد اول) اور پھر "تذکرۃ الکرام" (دوسری جلد) اور "تحقیق الانساب" تین کتابیں تصنیف کیں۔ انھوں نے جو کچھ لکھا تحقیق و تدقیق اور روایت و درایت کی تمام شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے، حق پژوہی اور حق گوئی میں کسی کی رو رعایت ان کے سدِ راہ نہیں ہوئی۔ "تاریخ امروہہ" میں اور پھر "تحقیق انساب" میں کئی خاندانوں کا کچا چٹھا تھا۔ اس

سے فارغ تھا بہت لوگوں کو رنج ہوا اور انھوں نے سخت مخالفت کی عبّاسی صاحب نے تکلیف برداشت کی، نقصان اٹھایا، لیکن جو بات صحیح سمجھی، اس کے اعلان سے باز نہ آئے۔ اس پر مقدمہ بازی ہوئی اور بحیثیت مدّعی اور مدّعا علیہ دونوں میدانوں میں وہ ہر طرح کامیاب رہے۔

انھوں نے ملکی سیاست میں بھی عملی حصّہ لیا۔ ممکن ہے کوئی اور اثر بھی رہا ہو، لیکن وہ غالباً مولانا محمد علی کی صحبت میں کانگریس میں شامل ہوئے۔ بعد کو امروہہ کانگریس کمیٹی کے صدر چنے گئے تھے۔ اور کچھ مدّت وہاں کی میونسپل کمیٹی کے صدر اور آنریری مجسٹریٹ بھی رہے۔ ۱۹۳۶ء کے انتخاب کے سلسلے میں جب جواہر لال نہرو دورے پر امروہے گئے ہیں، تو وہاں جلسے کا انتظام، اور نظم و ضبط کا اہتمام عبّاسی صاحب ہی نے کیا تھا۔

۱۹۴۷ء میں جب ملک کی فضا مکدّر ہوگئی اور امروہے کا قیام غیر محفوظ ہونے لگا، تو وہ عارضی طور پر پاکستان چلے گئے۔ لیکن ان کا ارادہ وہاں مستقل قیام کا نہیں تھا۔ چنانچہ بعد کو جب دونوں حکومتوں کی طرف سے اعلان ہوا کہ اب مہاجرین کو اپنی مستقل حیثیت کا تعین کرنا پڑیگا؛ فلاں تاریخ کے بعد پاسپورٹ اور راہداری کے قواعد نافذ ہو جائینگے، تو وہ ہندستان واپس چلے آئے۔ یہاں ان کی خاصی بڑی جاداد وغیرہ تھی۔ کچھ کتابیں بھی چھپ چکی تھیں۔ اس لیے معقول آمدنی تھی اور بسر اوقات کے لیے کوئی تشویش نہیں تھی۔

ان کا نکاح ملّا امان اللہ کے خاندان میں، ابراہیم علی صدیقی کی صاحبزادی (شکیلہ بیگم) سے ہوا تھا۔ اولاد میں صرف ایک صاحبزادی (مہ جبیں فاطمہ) ہوئیں، جو جناب سبط رسول فاروقی کے حبالۂ عقد میں آئیں۔ پاکستان بننے پر بیٹی اور داماد وہاں چلے گئے تھے۔ جب عبّاسی صاحب تقاضائے عمر سے زیادہ بیمار رہنے لگے، تو ان لوگوں نے اصرار کیا کہ آپ پاکستان چلے آیئے، تاکہ ہم آپ کی دیکھ بھال کر سکیں۔ یوں بھی اب امروہے میں ان کا کون تھا! لہٰذا بیٹی کے بلانے پر وہ ۱۹۵۱ء میں ہجرت

کر کے مستقلاً کراچی چلے گئے۔ جانے سے پہلے انھوں نے یہاں کی بیشتر جاداد فروخت کر دی تھی، بقیہ کے عوض میں شاید وہاں کچھ باغات وغیرہ مل گئے تھے۔ غرض انھیں وہاں بھی مالی پہلو سے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

کراچی کے زمانۂ قیام میں ان کی متعدد کتابیں شائع ہوئیں۔ وہاں پہنچنے کے بعد سب سے پہلے "حقیقت قوم کمبوہ" چھپی جو امروہے ہی میں مکمل ہو چکی تھی، اور جس کا مسودہ وہ اپنے ساتھ لیتے گئے تھے۔ لیکن جس کتاب نے سب سے زیادہ ہنگامہ بپا کیا، وہ "خلافت معاویہ و یزید" ہے! یہ ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی۔ اس میں انھوں نے امیر معاویہ اور ان کے جانشین یزید کو حق بجانب ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ قدرتی بات تھی، شیعی حضرات نے سخت احتجاج کیا۔ حکومت نے عافیت اسی میں دیکھی کہ کتاب کی اشاعت ممنوع قرار دے دی۔ لیکن وہ عباسی صاحب کو خاموش نہ کر سکی، انھوں نے دو سال بعد اپنے نظریے کی تائید میں دوسری کتاب "تحقیق مزید" شائع کی (۱۹۶۰ء)۔ مخالفانہ جلسے وغیرہ اب کے بھی ہوئے، لیکن چونکہ انھوں نے جو کچھ لکھا تھا، اس کی تردید محال تھی، اس لیے مخالفین نے خموشی اختیار کی اور یہ کتاب ضبط نہیں ہوئی۔

انھوں نے شعرائے امروہہ کا ایک تذکرہ بھی مرتب کیا تھا۔ دراصل یہ ان کی تاریخ امروہہ ہی کا ایک حصہ تھا۔ وہ یہ کام مکمل کر چکے تھے اور اس کا مسودہ بھی اپنے ساتھ لیتے گئے تھے لیکن یہ کتاب آج تک شائع نہیں ہوئی۔ اگر ان کے پسماندگان ان کے مسودات کی چھان بین کر کے اسے الگ کریں، اور شائع کر دیں، تو یہ ادب کی مستقل خدمت ہوگی۔

۱۴ مارچ ۱۹۷۴ء کو کراچی میں انتقال ہوا۔ طارق روڈ کراچی پر سوسائٹی کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

مہندر ناتھ

مشہور افسانہ نگار، قوم کے کھتری (چوپڑہ) تھے۔ ان کا خاندان دراصل پنجاب میں وزیرآباد، ضلع گوجرانوالہ (پاکستان) کا رہنے والا تھا۔ ان کے والد گوری شنکر صاحب پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر تھے۔ ان کی اولادیں پانچ بچے پیدا ہوئے: چار بیٹے اور ایک بیٹی۔ ایک بیٹا صغرسنی میں فوت ہو گیا تھا۔ ہماری زبان کے مشہور افسانہ نویس اور ناول نگار کرشن چندر (ف: مارچ ۱۹۷۷ء) ان کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ مہندر ناتھ ان سے نو سال چھوٹے تھے۔ ان سے چھوٹے راجندر ناتھ تھے، جن کا بچپن میں انتقال ہو گیا۔ پھر بہن سرلا دیوی (ف: ۸ مئی ۱۹۷۵ء) جو خود بہت اچھی افسانہ نگار تھیں۔ سب سے چھوٹے اپندر ناتھ ماشاءاللہ سلامت ہیں۔

ڈاکٹر گوری شنکر اسی حیثیت سے ریاست بھرتپور میں ملازم تھے۔ ۱۹۲۳ء میں وہ وہاں کی ملازمت ترک کر کے کشمیر چلے گئے۔ یہاں وہ کشمیر کی ذیلی ریاست پونچھ میں سرکاری اسپتال کے انچارج مقرر ہوئے تھے۔ ان کی عمر کا خاصا بڑا حصہ پونچھ میں گزرا۔ انھیں اس ریاست کی ہر ایک تحصیل میں تین تین چار چار سال قیام کرنا پڑا تھا۔ مہندر ناتھ یہیں پونچھ میں ۱۹۲۳ء میں پیدا ہوئے۔ اس لیے ان کا بچپن بھی کشمیر کی دلفریب وادیوں اور فلک بوس پہاڑیوں، روح پرور نظاروں اور خوبصورت جھیلوں میں گزرا۔ یہی حال بڑے بھائی کرشن چندر کا تھا۔ ان دونوں کی کہانیوں اور ناولوں میں جو فطرت کی نقاشی اور قدرتی حسن کی دلکش تصویریں ملتی ہیں، ان کا پس منظر ان کے بچپن کا یہی ماحول ہے۔

جب تعلیم کا زمانہ آیا، تو کرشن چندر کی طرح انھیں بھی مقامی وکٹوریہ جوبلی ہائی اسکول میں بھیج دیا گیا۔ مہندر ناتھ نے آٹھویں درجے تک یہیں تعلیم پائی۔ کرشن چندر ان سے پہلے دسویں درجے کی سند لے کر فورمین کرسچین کالج لاہور میں داخلہ لے چکے تھے۔ ڈاکٹر گوری شنکر نے خیال کیا کہ اگر مہندر ناتھ بھی لاہور چلے جائیں، تو یہ نہ صرف ان کی تعلیم کے لیے بہتر ہوگا، بلکہ دونوں بھائی ایک ساتھ رہینگے۔ چنانچہ مہندر ناتھ بھی لاہور آ گئے، اور ڈی، اے، وی ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا۔ دسویں کا امتحان انھوں نے اسی اسکول سے پاس کیا۔ اعلیٰ تعلیم انھوں نے بھی فورمین کرسچین کالج ہی میں پائی، جہاں سے انھوں نے بی، اے کی سند حاصل کی۔

کرشن چندر نے ایم اے کے بعد ایل ایل، بی کی سند بھی لی تھی۔ لیکن انھوں نے وکالت کا پیشہ اختیار نہیں کیا۔ بلکہ عملی سیاست (اور وہ بھی پیاری قسم کی) اور تصنیف و تالیف میں لگ گئے۔ سیاست کا خارزار ان کے بس کی بات نہیں تھا، اس لیے انھوں نے یہ بھاری پتھر چوم کر چھوڑ دیا، اور تصنیف و تالیف کو بقیہ زندگی کے لیے اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔

اس زمانے میں سید احمد شاہ بخاری (پطرس) آل انڈیا ریڈیو کے مدیر اعلیٰ (ڈائرکٹر جنرل) تھے اور وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر مستند اور ہونہار ادیبوں اور شاعروں کو ریڈیو میں جمع کر رہے تھے۔ جہاں کوئی جوہر قابل نظر آیا، انھوں نے اسے ریڈیو کی ملازمت کی پیشکش کر دی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ اس زمانے میں آل انڈیا ریڈیو واقعی کان ادب بن گیا، متعدد ادیب اس کے مختلف مراکز میں ملازم ہو گئے۔ کرشن چندر بھی اسی سیلاب میں بہہ گئے۔ ان کا افسانہ (یرقان) ۱۹۳۶ء میں چھپا تھا، جس نے انھیں شہرت کی شاہراہ پر کھڑا کر دیا۔ اس کے بعد اور دو چار چیزیں بھی چھپیں۔ پطرس بڑے ذہین اور مردم شناس آدمی تھے۔ انھوں نے اس نوجوان مصنّف کو ریڈیو میں آنے کی دعوت دی۔ یہ اپنے سیاسی بلکہ انقلابی خیالات کے باعث کچھ دن ٹال مٹول کرتے رہے، لیکن تا کے؟ احتیاج نے تو بڑے بڑے شیروں کو روباہ مزاج بنا دیا، بھلا کرشن چندر کب تک اپنے انکار پر قائم

رہ سکتے تھے!۔ القصہ نومبر ۱۹۳۸ء میں وہ لاہور ریڈیو اسٹیشن میں ملازم ہو گئے۔ سال بھر بعد تبادلہ ہوا تو دلّی پہنچ گئے۔ اور پھر کوئی سال بھر بعد لکھنؤ۔۔

کرشن چندر جہاں بھی گئے، مہندر ناتھ ان کے ساتھ تھے۔ دلّی کے قیام کے زمانے میں مہندر ناتھ بھی شاہد احمد دہلوی سے ملے اور ان کے افسانے بھی ساقی میں شائع ہونے لگے۔ اگر کبھی اردو افسانے کی تاریخ لکھی گئی، تو اس وقت کھلیگا کہ ساقی نے اردو افسانے کے فروغ میں اور خود افسانہ نگاروں کی امداد اور ان کی شہرت میں اضافہ کرنے میں کیا کارہائے نمایاں کیے۔ خیر، یہ دوسرا موضوع ہے۔ بہرحال مہندر ناتھ نے اس زمانے میں افسانے لکھے، اور یہ ساقی کے علاوہ اب دوسرے رسالوں میں بھی چھپنے لگے۔

مہندر ناتھ نے یہاں کئی ڈرامے بھی لکھے تھے، جو دلّی ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوئے ایک مرتبہ یہاں کے قیام کے دوران میں دوستوں کے کہتے سننے سے انھوں نے حکومت ہند کے محکمۂ سپلائی میں ملازمت کا امتحان دے دیا، اور اس میں پاس ہو گئے۔ لیکن جب واقعی حاضری کا سوال آیا، تو انھوں نے جانے سے انکار کر دیا۔

جب کرشن چندر ۱۹۴۱ء میں لکھنؤ گئے تو مہندر ناتھ بھی ان کے ساتھ گئے۔ کرشن چندر پروگرام اسسٹنٹ مقرر ہوئے تھے، اور خاص طور پر ڈراما کا شعبہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ اس زمانے میں شوکت تھانوی وہاں مضمون (اسکرپٹ) لکھنے پر مقرر تھے۔ تھوڑے دن بعد انھوں نے پنچولی آرٹ پروڈکشن، لاہور کی نوکری قبول کر لی، تو ان کی جگہ پر مہندر ناتھ کا تقرر ہو گیا۔

اب دیکھیے، تقدیر کا کرشمہ! ایک دن اچانک کرشن چندر کو مشہور فلم ساز ڈبلیو۔ زیڈ احمد کا پیغام ملا کہ اگر آپ ہماری فلموں کے لیے مکالمے لکھنے کی خدمت قبول کرنا چاہیں، تو چلے آئیے۔ دوستوں نے انھیں سمجھایا کہ جمی جمائی سرکاری نوکری چھوڑ کر شخصی ملازمت قبول کرنا دانشمندی نہیں، لیکن وہ واقعی اس سرکاری نوکری ہی سے بیزار ہو چکے تھے۔ انھوں نے استعفیٰ داخل کر دیا، اور پونا کی راہ لی۔ تصوّر کیا جا سکتا ہے کہ

اس سے اُردو ادب کو کتنا فائدہ پہنچا۔ بہرحال دونوں بھائی ۱۹۴۲ء میں پونا گئے اور دو سال احمد کے ساتھ رہے۔ ۱۹۴۴ء میں کرشن چندر نے بمبئی ٹاکیز سے معاہدہ کر لیا۔ اور ایک سال بعد (۱۹۴۵ء-۱۹۴۶ء) خود نیشنل تھیٹر کے تعاون سے اپنی ایک پرانی کہانی پر مبنی فلم "سرائے کے باہر" بنائی۔ اس میں مہندر ناتھ نے ہیرو کا پارٹ کیا۔ پھر دوسری فلم "دل کی آواز" تیار کی؛ اس میں بھی مہندر ناتھ ہیرو تھے۔ (شمینہ خاتون نے ہیروین کا رول ادا کیا تھا)۔

اس کے بعد زلزلے نے جب فلم کمپنی قائم کی، تو مہندر ناتھ کوئی چار برس تک اس میں مکالمہ نویس رہے۔ اس کمپنی کی ایک فلم "زلزلہ" میں انھوں نے بطور اداکار بھی حصہ لیا تھا۔ خواجہ احمد عباس کی ایک فلم "دھرتی کے لال" میں انھوں نے "سماج سیوک" کا پارٹ ادا کیا تھا۔

اب مہندر ناتھ کی بطور مکالمہ نویس اور افسانہ نگار کے مسلّمہ حیثیت تھی۔ لیکن وہ جو عام مشاہدہ ہے کہ برگد کے درخت کے نیچے اور کوئی چیز اُگ یا پنپ نہیں سکتی، وہی حشر مہندر ناتھ کا کرشن چندر کی وجہ سے ہوا۔ کرشن چندر کی شہرت اور عظمت کے باعث مہندر ناتھ کو احساس ہو گیا تھا کہ لوگ مجھے میرا جائز حق دینے کو تیار نہیں، اس لیے وہ کچھ بے پرواسے ہو گئے۔ ان کے بعض افسانوں میں زبان و بیان کی جو خامیاں نظر آتی ہیں، ان کا اصل سبب یہی ہے۔

ان کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے "فلم رائٹرز ایسوسی ایشن" قائم کی اور فلمسازوں سے فلم لکھنے والوں کے حقوق منوائے اور ان کا حق دلوایا۔ وہ زندگی بھر بلا مقابلہ اس انجمن کے سکریٹری چنے گئے۔ وہ مدّتوں ترقی پسند مصنفین کی تحریک سے بھی وابستہ رہے۔

مہندر ناتھ کے افسانوں کے دس مجموعے چھپ چکے ہیں: (۱) چاندی کے تار؛ (۲) مائی ڈارلنگ ہوٹل؛ (۳) گالی؛ (۴) یہاں سے وہاں تک؛ (۵) پاکستان سے ہندستان تک؛ (۶) جہاں میں رہتا ہوں؛ (۷) برات؛ (۸) نئی بیماری؛ (۹) تنہا تنہا؛ (۱۰) داستان میری، ذکر تیرا۔

ان افسانوں کے مجموعوں کے علاوہ پندرہ ناول ہیں: (۱) آدمی اور سکے؛ (۲) رات اندھیری

ہے ؛ (۳) سوانح، ادبیت اور گناہ ؛ (۴) وعدہ ؛ (۵) پیار کا موسم ؛ (۶) ایک شمع، ہزار پروانے ؛ (۷) منزل ایک، مسافر دو (۸) تیری صورت، میری آنکھیں ؛ (۹) لیڈر ؛ (۱۰) روپا ؛ (۱۱) بچن ؛ (۱۲) زیرو سے ہیرو ؛ (۱۳) درد کا رشتہ ؛ (۱۴) ٹھوکر ؛ (۱۵) ارمانوں کی سیج۔

ان کی متعدد کہانیوں کے تراجم ہندستان کی مختلف زبانوں کے علاوہ روسی اور رومانی زبانوں میں ہوئے ہیں۔ ان کی کہانیوں پر گورکی (روسی) اور موپاساں (فرانسیسی) افسانہ نویسوں کا بہت اثر ہے۔ اور ان ہی کی طرح بھوک اور جنس ان کے خاص موضوع ہیں۔

۲۰ مارچ ۱۹۷۴ء کو بمبئی میں بعارضۂ قلب انتقال کیا۔ لاوارث فوت ہوئے۔

حمید احمد خان، پروفیسر

اردو صحافت کی، اور ہمارے ملک کی تحریکِ آزادی کی کوئی تاریخ، لاہور کے روزنامے زمیندار اور اس کے مدیرِ شہیر مولانا ظفر علی خان (ف: نومبر ۱۹۵۶ء) کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ زمیندار در اصل مولانا ظفر علی خان کے والد مولوی سراج الدین احمد خان (ف: دسمبر ۱۹۰۹ء) نے ہفت روزہ کی شکل میں جاری کیا تھا۔ ان کے زمانے میں یہ واقعی زمینداروں اور کسانوں کے کام کا زراعتی پرچہ تھا۔ اسے سیاسی اور علمی روزنامہ تو ان کی وفات کے بعد مولانا ظفر علی خان نے بنایا۔ لیکن اس وقت مجھے "زمیندار" کی تاریخ لکھنا منظور نہیں۔

مولوی سراج الدین احمد خان کی ساری اولاد ماشاء اللہ ایک سے ایک بڑھ کر ہوئی۔ انھوں نے اپنی زندگی میں دو نکاح کیے۔ بڑی بیگم کے بطن سے تین بیٹے پیدا ہوئے: ظفر علی خان، غلام حیدر خان اور محمد اکبر خان؛ چھوٹی سے بھی تین ہوئے: محمود احمد خان، حامد علی خان اور حمید احمد خان۔ ہر ایک نے اپنے اپنے میدان میں نمایاں خدمات سر انجام دی ہیں اور ہمارے خزینۂ علم و ادب کو مالا مال کیا ہے۔

یہ خاندان در اصل کرم آباد (تحصیل وزیر آباد، ضلع گوجرانوالہ، پنجاب، حال: پاکستان) کا رہنے والا تھا، لیکن حمید احمد خان یکم نومبر ۱۹۰۳ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ دسویں درجے تک ان کی تعلیم چرچ آف اسکاٹ لینڈ مشن ہائی اسکول، وزیر آباد میں ہوئی۔ ایک بات قابلِ ذکر ہے کہ ان کی طالب علمی کے زمانے میں تاریخ ادب اردو (انگریزی) کے مشہور مصنف اور ماہر لسانیات ریورنڈ ڈاکٹر ٹامس گراہم بیلی (ف: ۱۹۴۲ء)

اس اسکول کے مینیجر تھے اور طلبہ کو انگریزی بھی پڑھاتے تھے۔ چنانچہ حمید احمد خاں بھی ان کے شاگردوں میں رہے، بلکہ اپنی انگریزی کی قابلیت کے باعث یہ ان کے چہیتے شاگردوں میں سے تھے۔

۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۴ء تک میں بھی وزیر آباد کے وکٹوریہ ڈائمنڈ جوبلی ہائی اسکول کا طالبعلم رہا ہوں۔ میں نے اسی زمانے میں ڈاکٹر ییلی کو دیکھا تھا۔ چونکہ ذکر آگیا ہے، اس لیے غالباً بیجا نہیں ہوگا، اگر یہاں بطور جملۂ معترضہ ڈاکٹر ییلی کا ایک لطیفہ محفوظ کر دوں:

ڈاکٹر ییلی اپنے طویل قیام پنجاب کے باعث بہت اچھی پنجابی سمجھتے اور بولتے تھے۔ اور انھیں اپنے ملنے والوں اور طلبہ اور طلبہ کے والدین کے ساتھ پنجابی میں گفتگو کرنے میں خاص لطف آتا تھا، بلکہ وہ اس زبان میں مہارت کا مظاہرہ کرکے بجا فخر محسوس کرتے تھے۔ بعد کو انھوں نے ولایت واپسی پر پنجابی زبان سے متعلق متعدد کتابیں شائع کی تھیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلسل مشق اور مزاولت سے ان کی پنجابی سے واقفیت حیرتناک حد تک وسیع ہو گئی تھی، اور وہ اس کے خاص محاورات اور لہجے پر بخوبی قادر تھے۔

ایک مرتبہ کیا ہوا کہ وزیر آباد کے مضافات سے ایک دیہاتی اپنے بیٹے کو مشن اسکول میں داخلہ دلانے کو لایا۔ داخلے کی آخری تاریخ نکل چکی تھی اور درجے میں جتنی جگہیں تھیں، وہ پر ہو گئی تھیں۔ طالب علم کے والد نے بہت منت سماجت کی، لیکن ڈاکٹر ییلی ٹس سے مس نہ ہوئے۔ ان کا کہنا تھا کہ درجے میں جگہ ہی نہیں رہی، ہم داخلہ کیسے منظور کریں! لیکن دیہاتی اس کے باوجود اصرار کیے جا رہا تھا۔ اس پر ڈاکٹر ییلی کو مذاق کی سوجھی۔ فرمایا: اچھا، اگر آپ مجھ سے پنجابی میں کوئی بات ایسی کہیں، جو میری سمجھ میں نہ آئے تو میں لڑکے کو داخلے کی اجازت دے دوں گا (یہ گویا ان کا اپنے پنجابی کے علم پر اعتماد کا اظہار تھا) اس پر لڑکے کے والد کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے بیساختہ کہا: اوے، توں کون ہوناں ایں ایس چھوہرے نوں داخل نا کرن آلا! میں گھسُن مار تیرا بتھن بھن دیوں گا (ارے، تم کون ہوتے ہو اس لڑکے کو داخل نہ کرنے والے! میں گھونسا مار کر تمھارے منہ کا جبڑا توڑ دوں گا) اس فقرے کا پہلا حصہ ایسا مشکل نہیں،

لیکن آخری حصہ واقعی مشکل ہے اور جس شخص کو دیہاتیوں کے ساتھ رہنے اور ان سے مقامی روزمرّے میں بات چیت کرنے کا موقع نہ ملا ہو، اس کے لیے یہ عسیر الفہم ہے۔ پیلی نے جو یہ فقرہ سنا، تو ان کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ لیکن زبان دے چکے تھے، اب وعدہ خلافی کیسے کرتے! کہنے لگے: اچھا صاحب، لڑکا تو داخل ہو گیا، لیکن جو کچھ آپ نے کہا، اب اس کا مطلب بتا دیجیے۔ جب دیہاتی نے معنی بتلائے، تو بہت دیر تک ہنستے رہے (یاد رہے کہ یہ ساری گفتگو پنجابی میں ہوئی تھی)۔

تو خیر، دسویں کی سند لینے کے بعد حمید احمد خان، حیدر آباد (دکن) چلے گئے، جہاں ان کے بھائی جناب محمود احمد خان عثمانیہ یونیورسٹی میں کیمسٹری ڈپارٹمنٹ کے صدر تھے (بعد کو وہ چندے اسی یونیورسٹی میں رجسٹرار بھی رہے)۔ حمید احمد خان نے عثمانیہ میں داخلہ لیا اور تین سال بعد بی اے آنرز کی یہیں سے سند لی۔ وہ اس سال اپنے درجے میں پوری یونیورسٹی میں اوّل آئے اور انھوں نے اول ڈویژن حاصل کی تھی۔ ایم اے (انگریزی) کا امتحان انھوں نے بعد کو گورنمنٹ کالج، لاہور کے طالب علم کی حیثیت سے پنجاب یونیورسٹی سے دیا۔

حمید احمد خان بعد کے زمانے میں عام طور پر کہا کرتے تھے کہ میں حضرت مولانا عبدالباری (ع۔ باری) کا بنایا ہوا ہوں۔ مولانا عبدالباری ندوی (ف: فروری ۱۹۷۶ء) اس زمانے میں جامعہ عثمانیہ میں فلسفے کے پروفیسر تھے اور حمید احمد خان کے استاد۔ ان کے دل و دماغ کی فتوحات اس وقت بھی نمایاں تھیں، اور بعد کو وہ جس مقام پر پہنچے، وہ تو ہم عامیوں کی پرواز خیال سے بھی کہیں بلند تھا۔

حمید احمد خان نے ملازمت کا آغاز اسلامیہ کالج لاہور سے کیا؛ وہ جنوری ۱۹۳۴ء میں یہاں انگریزی کے مدّرس (لیکچرر) مقرر ہو گئے۔ وہ بہت کامیاب معلّم ثابت ہوئے۔ اپنے ہمکار مدّرسین اور اساتذہ اور طلبہ میں وہ یکساں ہر دلعزیز تھے۔ اگرچہ وہ انگریزی پڑھاتے تھے، لیکن اُردو سے محبّت اور اس کی ترقی اور ترویج کا جذبہ انھیں ورثے میں ملا تھا۔ چنانچہ انھوں نے یہاں کالج میں "بزمِ فروغِ اُردو" قائم کی؛ اور کالج کے رسالے کریسنٹ

کے مدیر اعلیٰ بھی رہے۔
اکتوبر ۱۹۴۴ء میں ادارت تعلیم، حکومت سندھ (ڈائرکٹریٹ آف ایجوکیشن) کے ادارے دہلی پالی ٹکنک میں انگریزی کے مدرس مقرر ہو گئے۔ اگلے تین سال ان کا قیام دلّی میں رہا جب آزادی کے ساتھ پاکستان وجود میں آیا، تو اگست ۱۹۴۷ء میں وہ وزارت تعلیم حکومت پاکستان سے وابستہ ہو گئے۔ لیکن یہاں وہ زیادہ دن نہیں رہے؛ فروری ۱۹۴۸ء میں اسلامیہ کالج، لاہور میں انگریزی کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔ جلد ہی انھوں نے محسوس کیا کہ ڈاکٹریٹ کی سند نہ ہونے کے باعث ان کی آیندہ ترقی مشتبہ ہے۔ اس پر وہ ۱۹۵۲ء میں کیمبرج (انگلستان) گئے اور وہاں سے ایم، لٹ (ماسٹر آف لٹریچر) کی سند حاصل کر کے وطن آئے۔ ان کے مقالے کا موضوع تھا: ورڈسورتھ کی شاعری میں شہوانی اور روحانی تصوّرات۔ پروفیسر آربری مرحوم (ف: اکتوبر ۱۹۶۹ء) جو ان کے ٹیوٹر بھی تھے اور ایک ممتحن بھی، چاہتے تھے کہ وہ سال بھر اور رک جائیں اور اپنے مقالے کا دائرہ وسیع تر کر کے اسے از سرِ نو قلمبند کریں، تاکہ انھیں پی ایچ ڈی کی سند دی جا سکے۔ لیکن حمید احمد خاں کے خانگی حالات ان کے مزید قیام انگلستان کے لیے سازگار نہیں تھے؛ انھیں بادلِ ناخواستہ واپس آنا پڑا۔ واپسی پر وہ اپنے اصلی کالج میں شعبۂ انگریزی کے صدر مقرر ہوئے اور چار سال بعد ۱۹۵۸ء میں کالج کے پرنسپل بنا دیے گئے۔ ان کا پانچ سالہ عہدِ ادارت اس کالج کی تاریخ کا زرّین دور ہے۔
ستمبر ۱۹۶۳ء میں انھیں پنجاب یونیورسٹی کا وائس چانسلر (شیخ الجامعہ) بنایا گیا۔ انھوں نے اپنے زمانۂ اقتدار میں پنجاب یونیورسٹی کی کایا پلٹ دی۔ جس جگہ انگریزی کے سوا کوئی اور آواز نہیں سنائی دیتی تھی، وہاں ایک سرے سے دوسرے سرے تک سب کام اردو میں ہونے لگا۔ وہ خود اپنا دفتری کام اردو میں کرتے، مسلوں پر اپنی یادداشتیں اور حکم احکام اردو میں لکھتے، اور دوسروں کو بھی اسی کی ترغیب دیتے۔ اساتذہ کو عام اجازت تھی کہ وہ تمام مضامین اردو میں پڑھائیں۔ طلبہ کو کھلی چھٹی تھی کہ بی اے،

بی ایس سی، ایم اے تک تمام امتحانات کے پرچوں کے جواب اُردو میں لکھیں۔ اور تو اور تمام امتحانات کی اسناد بھی اُردو میں چھپنے لگیں۔ وہ ساری زندگی انگریزی پڑھاتے رہے اور یہاں سے ولایت تک سب معترف ہیں کہ وہ بہت اچھی انگریزی بولتے اور لکھتے تھے۔ لیکن اپنی گفتگو یا اُردو تحریریں، اصطلاحات کے ماسوا، وہ کبھی انگریزی کا لفظ استعمال نہیں کرتے تھے۔ ان کے دماغ میں دونوں زبانوں کے خانے الگ الگ تھے، جب ایک بند ہو جاتا، تو دوسرا کھلتا؛ وہ دونوں کو آپس میں گڈمڈ نہیں کرتے تھے۔

یہ پاکستان کی سیاست کا دورِ ایوبی تھا، اور وہاں ایک نئی قسم کی نوکر شاہی عالمِ وجود میں آ گئی تھی۔ ہر سرکاری دفتر اور ایرا غیرا افسر، ہر ادارے میں دخل در معقولات دینا اپنا پیدائشی حق سمجھتا؛ اِدھر حمید احمد خان ضابطے قانون کے حد درجہ پابند۔ ان کا اصول یہ تھا کہ تعلیم کا درجہ سب سے بلند ہے؛ اور کسی "بیرونی" کا یونیورسٹی کے معاملات میں، ان کی اجازت کے بغیر، دخل دینا کفر کے مرادف۔ وہ خود کسی وزیر یا تدبیر تک کی ملاقات کو تو جاتے نہیں تھے، سکریٹری، نائب سکریٹری کا کیا ذکر ہے! کبھی ضرورت پیش آ گئی، تو ضابطے کا خط پرچہ لکھ کر متعلقہ دفتر میں بھیج دیا۔ جہاں بنیادی اصولوں میں اور طریقۂ کار میں یہ بُعد المشرقین ہو وہاں، بھلا کتنے دن عافیت سے گزر سکتی تھی؟! کمال تو یہ ہے کہ اس پر بھی انھوں نے چھ برس گزار دیے۔ بہر حال اربابِ حکومت کو ان کی آزادہ روی اور بقول شخصے "اکڑ" کھلنے لگی۔ چنانچہ ان کے خلاف طرح طرح کی ریشہ دوانیاں ہونے لگیں۔ اولاً طلبہ کو ان کے خلاف بھڑکانے کی کامیاب کوشش کی گئی۔ پھر ان سے کہا گیا کہ وہ طویل رخصت پر چلے جائیں۔ حمید احمد خان نے دیکھا کہ اس ماحول میں عزتِ نفس اور خودداری کی قربانی دیے بغیر گزارا ممکن نہیں۔ اس پر انھوں نے "عطائے تو، بلقائے تو" کہتے ہوئے، فروری ۱۹۶۹ء میں استعفا دے دیا۔

ابھی وہ اسلامیہ کالج کے پرنسپل تھے کہ حکومت نے مارچ ۱۹۶۲ء میں ان کی علمی اور

تعلیمی خدمات کے اعتراف میں انھیں "ستارۂ امتیاز" کا اعزاز دیا۔ پھر یونیورسٹی کی خدمت کے دوران میں، اگست ۱۹۶۸ء میں، اس سے بھی اعلیٰ "ستارۂ پاکستان" کا نشان عطا کیا۔
جون ۱۹۶۴ء میں جاکارتا (دارالخلافہ انڈونیشیا) میں ایک ایشیائی افریقی اسلامی کانفرنس منعقد ہوئی تھی، اور اس کے اگلے برس مارچ ۱۹۶۵ء میں بانڈونگ میں، دونوں میں وہ پاکستانی وفد کے سربراہ تھے۔ ۱۹۶۵ء میں اس کے مستقل ادارے کے نائب صدر بھی چنے گئے تھے۔ اکتوبر ۱۹۷۰ء کی بانڈونگ کانفرنس میں بھی شریک ہوئے۔
یہ حقیقت ہے کہ یونیورسٹی کی وائس چانسلری کے دوران میں انھوں نے جس فرض شناسی کا ثبوت دیا اور جس محنت اور دلسوزی سے دن رات کام کیا، اس نے ان کی تندرستی کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔ ۱۹۶۹ء میں یہاں سے سبکدوش تو ہو گئے، لیکن اس کے بعد صحت کے پہلو سے کبھی اطمینان نصیب نہ ہوا۔ اس کے باوجود جب حکومت نے انھیں جولائی ۱۹۶۹ء میں ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کا اضافی مدیر (ایڈیشنل ڈائرکٹر) بنانے کی پیشکش کی، تو انھوں نے اسے اس خیال سے قبول کر لیا کہ اس سے ملک و ملت اور زبان کی خدمت کا ایک موقع پیدا ہو گیا تھا۔ سال بھر بعد سید امتیاز علی تاج کی وفات (اپریل ۱۹۷۰ء) پر وہ جولائی ۱۹۷۰ء میں مجلسِ ترقیِ ادب کے ناظم مقرر ہو گئے۔ اپنی وفات تک وہ اسی عہدے پر متمکن تھے۔
انھیں فشارِ دم کا عارضہ تھا۔ اس کا سب سے پہلا حملہ جون ۱۹۷۳ء میں ہوا۔ اس کے بعد طبی ہدایت کے تحت وہ کچھ محتاط تو رہنے لگے، لیکن کام کی وہ بھرمار تھی کہ سکون مفقود تھا۔ ۲۲ مارچ ۱۹۷۴ء صبح دفتر جانے کے لیے تیار ہوئے تھے کہ قے ہوئی۔ چند منٹ آرام کرنے کے بعد پھر جانے کو اٹھے۔ گھر کے لوگوں نے بہت منع کیا کہ آج دفتر نہ جائیے اور ڈاکٹر کو بلا کر اس سے مشورہ کیجیے۔ لیکن ان کا اصرار تھا کہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اتنے میں دوسری مرتبہ قے ہوئی اور ساتھ ہی بیہوش ہو گئے۔ ڈاکٹر آیا، معلوم ہوا کہ دماغ کی رگ پھٹ گئی ہے۔ اسی حالت میں اسپتال پہنچائے گئے۔ جہاں اسی دن شام کے ساڑھے چھ بجے اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

إِنَّا لِلّٰہِ وَإِنَّا إِلَیْہِ رَاجِعُوْن ۔ جنازہ اگلے دن سنیچر ۲۳ مارچ ۱۹۷۴ء کی صبح میں اٹھا اور انھیں گلبرگ کے قبرستان میں (غالب روڈ اور سر سید روڈ کے مابین) سپرد خاک کیا گیا ۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے عفو و کرم کا سلوک کرے ، آمین!

طاہر شادانی نے آہ کے تخرجہ سے تاریخ کہی ہے:

طاہر! اس کے سن رحلت پر کھینچ کے آہ
"زہے جنتیا فردوس" حمید احمد خان

(۱۹۷۴ : ۶-۱۹۸۰)

ان کی شادی ۱۹۴۲ء میں ہوئی تھی ۔ اولاد میں چھ بیٹے اپنی یادگار چھوڑے ۔ سب سے بڑے سعید احمد خان ایم ، ایس سی ، ایم ایس (امریکہ) کیمیکل انجینیر ہیں ۔ ان سے چھوٹے بیٹے خلیل احمد خان بھی انجینیر ہیں ؛ جمیل میاں بنک میں ملازم ہیں ۔ نذکار ، منصور اور ممتاز ابھی طالب علم ہیں ۔ سلّمہم اللہ تعالیٰ ۔

جس طرح وہ بات چیت میں بہت کم گو تھے ، اسی طرح لکھنے میں بھی بہت محتاط اور سست رو تھے ۔ انھوں نے بہت کم لکھا ہے اور اس میں سے بھی بہت کم کتابی صورت میں جمع ہوا ۔ لیکن یہاں سوال مقدار کا نہیں ، بلکہ معیار کا ہے ۔ ۱۹۴۲ء میں انھوں نے ایک انتخاب "سفینۂ ادب" (نظم و نثر) شائع کیا تھا ، جو نصاب کے لیے بہت موزوں ہے ۔ لیکن دراصل ان کی اپنی سب سے پہلی کتاب حضرت رسول کریم صلعم کی مختصر سوانح عمری ہے ، جو ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی تھی ۔

اہل علم جانتے ہیں کہ دیوانِ غالب کا نسخۂ بھوپال ، جو بعد کو نسخۂ حمیدیہ کی بنیاد بنا ، ایک مدت سے غائب ہے اور علمی دنیا اس سے استفادہ کرنے سے محروم ہو گئی ہے ۔ خوش قسمتی سے حمید احمد خان نے اسے اگست ۱۹۳۸ء میں بالاستیعاب دیکھا تھا ، اور اس سے یادداشتیں لے لی تھیں ۔ انھیں کو مرتب کر کے غالب صدی کے موقع پر جولائی ۱۹۶۹ میں "نسخۂ حمیدیہ" شائع کر دیا اور اس طرح یہ دیوان دوبارہ بلکہ زیادہ محکم طور پر ، حمید کے نام سے منسوب ہو گیا ۔

ان کی تیسری کتاب "ارمغانِ حالی" ہے (لاہور، ۱۹۷۰ء) اس میں حالی کی نظم و نثر کا انتخاب ہے۔ اس کے دیباچے کا مطالعہ حالی کے سمجھنے اور اردو ادب میں ان کا مقام متعین کرنے کے لیے ناگزیر ہے۔ ان کی وفات کے وقت دو کتابیں زیرِ طبع تھیں: تعلیم، تہذیب اور اقبال کی شخصیت اور شاعری؛ یہ بعد کو شائع ہوئیں۔

ان کی کئی کتابیں کم و بیش ترتیب و تدوین کے آخری مرحلوں پر تھیں۔ ان میں غالب اور اقبال کے بارے میں بہت کام ہو چکا تھا۔ غالب سے متعلق مضامین مختلف رسائل و جرائد میں منتشر ہیں، ان کا ایک مجلّد شائع ہونا چاہیے۔ انھوں نے اپنے ہمعصروں اور بزرگوں کے حالات میں متعدد مضامین قلمبند کیے تھے، جو اسی زمانے میں چھپے تھے، انھیں بھی جمع کرنا چاہیے۔ غرض کوشش کر کے ان کی تمام اردو اور انگریزی تحریروں کو منظرِ عام پر لانے کی ضرورت ہے۔

افسر میرٹھی، حامد اللہ

میرٹھ میں مفتیوں کا خاندان بہت مشہور رہے، بلکہ وہ محلّہ جہاں ان اصحاب کی سکونت ہے "محلہ مفتی صاحبان" کے نام سے موسوم ہو گیا ہے۔

اس خاندان کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ شاہان مغلیہ کے عہد میں ان کے بزرگوں کو ضلع میرٹھ میں معافی کے چند گانو عطا ہوئے تھے، جس سے انھوں نے میرٹھ میں سکونت اختیار کر لی۔ اس آخر زمانے میں ان کے ایک فرد مفتی محمد عصمت اللہ ہوئے ہیں۔ وہ بھی اپنی خاندانی روایات کے حامل اور زیور علم و فضل سے آراستہ تھے۔ اور طویل مدّت مقامی گورنمنٹ اسکول میں اردو فارسی کے مدرّس رہے۔ ان کے چھ اولادیں ہوئیں: (۱) بلقیس۔ شعر بھی کہتی تھیں اور مقامی طور پر کافی مشہور ہوئیں؛ (۲) شفقت اللہ، (۳) حامد اللہ، (۴) مطیع اللہ۔ انھوں نے گورنمنٹ اسکول میرٹھ سے دسویں درجے کی سند حاصل کی اور اس کے بعد جیپور میں سکونت اختیار کر لی؛ وہاں اسکول میں معلّم ہو گئے تھے۔ نجی مطالعے سے بالآخر ایم اے پاس کر لیا اور اسی اسکول میں ہیڈ ماسٹر مقرر ہو گئے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان چلے گئے تھے؛ غالباً راولپنڈی میں مقیم ہیں۔ شعر بھی کہتے ہیں؛ قمر تخلص ہے (۵) مبشرہ؛ (۶) مومنہ۔

حامد اللہ ۲۹ نومبر ۱۸۹۵ء کو اپنے خاندانی مکان (محلہ مفتی صاحبان) میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کا زمانہ آیا، تو والد نے انھیں خود فارسی اور اردو پڑھانا شروع کی۔ جب کافی استعداد ہو گئی، تو حکم ہوا کہ روزانہ کسی اپنی پسند کے موضوع پر ایک مضمون اردو میں لکھ کر دکھایا کرو۔ موضوع کی قید نہیں تھی؛ یہ کسی برتن، پھول، چارپائی، گائے بھینس

پڑھ سکتا تھا۔ روزانہ نمازِ مغرب کے بعد وہ یہ مضمون دیکھتے، اونچی آواز سے اسے خود پڑھتے اور ہمیشہ اس کی تعریف کرتے۔ سال کے آخر میں یہ ۳۶۵ صفحات مجلد کرا لیے جاتے۔ اب آغاز سال سے دو کام اُن کے ذمے ہو جاتے: ایک نیا مضمون حسب معمول لکھنا، اور دوسرے، پچھلے سال کے اسی تاریخ کے مضمون کی سرخ روشنائی سے اصلاح کرنا۔ مغرب کے بعد وہ یہ دونوں چیزیں والد کی خدمت میں پیش کر دیتے۔ وہ ہمیشہ کی طرح انھیں پڑھتے، تعریف کرتے اور لوٹا دیتے۔ یہ سلسلہ برسوں تک رہا۔

یہاں ایک بات قابلِ ذکر ہے:

اگر کسی دن یہ کسی وجہ سے مضمون نہیں لکھتے تھے، تو والد ناراض نہیں ہوتے تھے، نہ زجر و توبیخ کرتے، بلکہ انھوں نے تنبیہ کا ایک انوکھا طریقہ اختیار کیا تھا۔ شب کا کھانا باپ بیٹے دونوں روزانہ دیوان خانے میں ایک ساتھ کھاتے تھے۔ جس دن یہ مضمون نہ لکھتے، والد اندر کہلا بھیجتے کہ آج کھانا صرف حامد اللہ کے لیے بھیجا جائے، ہم کھانا نہیں کھائیں گے اور کھانا آ جانے پر انھیں حکم ہوتا کہ کھانا کھاؤ۔ یہ ایسی سخت سزا تھی کہ ان کے لیے ناقابلِ برداشت ہو جاتی۔ یہی وجہ تھی کہ تیز سے تیز بخار تک کی حالت میں بھی وہ ایک صفحے کا یہ مضمون ضرور لکھ لیتے تھے۔

رات کو یہ اپنے والد ہی کے پاس دیوان خانے میں سوتے تھے۔ سونے سے پہلے وہ انھیں ملکوں ملکوں کے بڑے بڑے لوگوں کے، خاص طور پر تاریخ اسلام کی برگزیدہ اور ممتاز شخصیتوں کے حالات اور قصے سنایا کرتے تھے۔ جب تک یہ انگریزی اسکول میں داخل نہیں ہوئے، وہ پہلا دستور ایک صفحہ روزانہ لکھنے کا جاری رہا۔ اس کے بعد اس میں ترمیم ہو گئی کہ اب موضوع اپنی پسند کا نہیں بلکہ پچھلی رات جو مشاہیر کے واقعات سنائے گئے تھے، ان میں سے کوئی واقعہ ایک صفحے میں لکھا جائے۔

مفتی محمد عصمت اللہ بیٹے کو فارسی اور عربی کا عالم بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ انھیں مدرسۂ عالیہ، میرٹھ میں داخل کرایا گیا۔ لیکن یہاں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ سال بھر بعد امتحان ہوا تو کسی مضمون میں ممتحن نے انھیں پچاس نمبر کے پرچے میں پچپن نمبر دے دیے۔

جب یہ بات مفتی صاحب کے علم میں آئی تو بہت متعجب ہوئے۔ کہتے: پچاس تک تو خیر غنیمت تھا، یہ پچپن کیسے ہو گئے؛ پانچ فاضل کہاں سے آئے؟ اس پر وہ کچھ بدظن ہو گئے؛ حامد اللہ کو مدرسۂ عالیہ سے اٹھا کر دیوبند بھیج دیا، جہاں کے اکابر سے ان کے ذاتی تعلقات تھے۔ لیکن یہ وہاں سال بھر سے زیادہ نہ رہ سکے۔ ایسے بیمار پڑے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر علاج کے لیے میرٹھ آنا پڑا۔ علاج سے اچھے تو ہو گئے۔ لیکن پھر دیوبند واپس نہ جا سکے۔ اب مفتی صاحب نے خود ہی پڑھانا شروع کیا۔ فارسی کا نصاب ختم کیا، بلکہ اسی زمانے میں یہ فارسی شاعری کرنے لگے۔ پھر ان کے والد بزرگوار نے یہ فیصلہ کیا کہ انھیں عربی کی اعلیٰ تعلیم کے لیے جامعۂ ازہر قاہرہ بھیج دیا جائے۔ چنانچہ اس کا خرچ پورا کرنے کے لیے اپنا ایک مکان بیچنے کی تیاریاں کرنے لگے۔ اور ساتھ ہی سفر کے لیے پاسپورٹ کی درخواست دے دی۔ لیکن عربی کی تکمیل قسمت میں نہیں لکھی تھی۔ پاسپورٹ کی درخواست منظور نہ ہوئی اور یہ مصر نہ جا سکے۔

اس اثنا میں ان کے ایک مکان میں آگرے کے ایک نقشہ نویس کرایہ دار آ گئے۔ ان کا ایک بیٹا اسکول کے ساتویں درجہ میں فارسی میں فیل ہو گیا۔ انھوں نے اپنے بیٹے کو انگریزی اور ریاضی کے مضامین گھر پر نجی طور پر پڑھانے کا انتظام کر رکھا تھا، لیکن فارسی کا کوئی معقول انتظام نہیں ہو سکا تھا۔ انھوں نے مفتی صاحب سے مشورہ کیا، تو انھوں نے حامد اللہ کو بلوایا اور پوچھا کہ انھیں یہ مشکل درپیش ہے، کیا آپ کوئی مدد کر سکتے ہیں؟ یہ اس لڑکے کو فارسی پڑھانے پر آمادہ ہو گئے۔ ایک دن اس لڑکے نے حامد اللہ صاحب سے پوچھا کہ کیا آپ انگریزی نہیں جانتے؟ ان کے نفی میں جواب دینے پر اس نے پیشکش کی کہ میں آپ کو انگریزی پڑھا دیا کروں گا۔ مشکل یہ تھی کہ وہ خود ساتویں درجے میں پڑھتا تھا، اس لیے وہ زیادہ دن تک اُن کا ساتھ نہ دے سکتا تھا۔ بہرحال یہ انگریزی پڑھنے لگے۔ جب ان کے والد مفتی عصمت اللہ کو ان کے نئے شوق کا علم ہوا، تو انھوں نے حوصلہ افزائی کی اور کچھ ابتدائی کتابیں بھی منگوا دیں۔ استادی شاگردی کا یہ

سلسلہ دو برس تک جاری رہا۔ اس کے بعد محض حسن اتفاق سے ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے ان کی زندگی کا رُخ ہی بدل گیا۔ آپ نے ڈپٹی نذیر احمد کے دلی کالج میں داخلے کا قصہ تو پڑھا ہوگا کہ کیونکر داخلے والے دن بھڑ میں ان کا پانو ڈریٹا تھا، جس سے وہ گر گئے، اور پرنسپل نے لپک کر انھیں اٹھایا اور مفتی صدرالدین آزردہ کے حوالے کر دیا اور مفتی صاحب نے ان کا امتحان لے کر انھیں کالج کے عربی درجے میں داخل کر لیا۔ اور یوں وہ کسی مسجد کی پیش امامت سے بال بال بچ گئے۔ حامد اللہ کے ساتھ جو کچھ گزری، وہ اس سے کم دلچسپ نہیں۔

اُن کا وہ فارسی کا شاگرد اب آٹھویں کا امتحان پاس کر کے مقامی گورنمنٹ ہائی اسکول کے نویں درجہ میں داخلہ لینا چاہتا تھا۔ جس دن داخلے کا فیصلہ ہونا تھا، یہ بھی تفریحاً ٹہلتے ٹہلتے اس کے ساتھ اسکول چلے گئے۔ کسی نے بتایا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب سب امیدوار کا خود امتحان لینگے، اور داخلے کا فیصلہ کرینگے۔ اسی سال نئے ہیڈ ماسٹر ولیم فریزر صاحب ولایت سے تشریف لائے تھے۔ سب امیدوار ان کے کمرے کے باہر جمع ہو گئے۔ اتنے میں فریزر صاحب بنگلے سے برآمد ہوئے اور حکم دیا کہ سب طلبا ایک قطار میں کھڑے ہو جائیں۔ اس پر اسکول کے کوئی اور معلم آگے بڑھے، اور بچوں کی قطار بنوانے لگے۔ جب انھوں نے حامد اللہ کو بھی قطار میں کھڑا کرنا چاہا تو انھوں نے کہا کہ میں داخل ہونے کو نہیں آیا۔ استاد نے ان سے جھڑک کر کہا: خاموش رہو اور چپ چاپ قطار میں کھڑے ہو جاؤ۔ اس معلم نے غالباً سُنا بھی نہیں تھا کہ حامد اللہ نے کیا کہا ہے۔ طوعاً و کرہاً یہ قطار میں کھڑے ہو گئے۔ اب ہیڈ ماسٹر صاحب نے آگے بڑھ کر قطار میں سے لڑکوں کا انتخاب شروع کیا۔ وہ جس لڑکے کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیتے تھے، وہ قطار سے الگ ہو جاتا۔ یہ دونوں استاد شاگرد قطار میں ایک دوسرے کے برابر کھڑے تھے۔ ماسٹر صاحب نے حامد اللہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور ان کے شاگرد (یا استاد) کو چھوڑ دیا۔ اب اسکول کے انھی استاد نے ان سے نام، پتا وغیرہ پوچھنا شروع کیا۔ یہ پھر احتجاج کرنے لگے کہ میں نویں درجے میں داخلہ نہیں چاہتا۔ میں اس کے لائق ہی نہیں۔ لیکن وہ اُستاد

بولے کہ جب خود ہیڈ ماسٹر صاحب نے تمھارا نویں کے لیے انتخاب کر لیا ہے، تو تم کون ہوتے ہو انکار کرنے والے تو صاحب، یہ گورنمنٹ ہائی اسکول کے نویں درجہ میں داخل ہو گئے۔
خیر، یہ داخل ہونے کو تو ہو گئے، لیکن اس نعمت غیر مترقبہ کے باعث اچھی خاصی مصیبت میں بھی گرفتار ہو گئے۔ انھوں نے تاریخ، جغرافیہ، ریاضی (حساب، الجبرا، اقلیدس) وغیرہ کا کبھی نام بھی نہیں سنا تھا۔ پہلی سہ ماہی کے اخیر میں اُردو فارسی اور انگریزی میں تو کسی طرح پاس ہو گئے، بقیہ مضامین میں صفر۔ اس پر والد نے ان کے پڑھانے کے لیے خاص استاد کا انتظام کیا۔ ششماہی میں، ریاضی کے علاوہ دوسرے مضامین میں بھی بھلے بُرے پاس ہو گئے۔ اس سے کچھ حوصلہ بڑھا۔ بہر حال سال کے آخر میں ہشتم نہم چل نکلے۔
غرض انھوں نے ۱۹۲۰ء میں میرٹھ کالج سے بی اے کی سند لی۔ اس کے بعد ایم اے اور وکالت کی تعلیم کے لیے علی گڑھ بھیجے گئے۔ لیکن عین امتحان کے زمانہ میں انھیں تپ محرقہ نے آدبوچا۔ میرٹھ چلے آئے اور امتحان میں شریک نہ ہو سکے۔ اس کے بعد تعلیم کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے منقطع ہو گیا۔
علی گڑھ کے قیام کے زمانے میں (۱۹۲۲) میں انھوں نے یونیورسٹی بورڈنگ ہاؤس میں رہنے کے بجائے شہر میں ایک کمرہ کرایے پر لیا تھا۔ یہ کمرہ شہر بھر کے شاعروں کی آماجگاہ بن گیا۔ باہر کے شاعر بھی آکر ان کے وہاں ڈیرا ڈال دیتے۔ جگرؔ اور فانیؔ کئی مرتبہ ان کے مہمان رہے۔ انھوں نے ایک پرچہ "نوبہار" کے نام سے جاری کر دیا جس کے لیے وہ مختلف عنوان خود ہی تجویز کر کے دوستوں سے مضمون لکھواتے رہے۔ اس رسالے کی ایک خصوصیت یہ بھی کہ اس کا ایک حصّہ دوسرے ہندی اور اُردو کے رسائل میں چھپنے والے تمام مقالات کے لیے وقف تھا۔ اس زمانے میں ڈائجسٹ کا یہ تصوّر بالکل نادر تھا۔
جب وہ علی گڑھ سے واپس آکر میرٹھ میں مقیم ہوئے، تو معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں انھوں نے ایک مقامی اخبار الخلیل کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے۔
ان کے دسویں کی سند لینے کے بعد ہی سے والد ان کی ملازمت کے لیے کمشنر میرٹھ کے پاس سفارشیں پہنچا رہے تھے۔ ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ حامد اللہ صاحب نائب تحصیلداری

کے لیے نامزد ہو گئے۔ جب انھیں معلوم ہوا، تو انھوں نے والد سے احتجاج کیا کہ میں اپنی تعلیم جاری رکھنا چاہتا ہوں۔ اس وقت یہ میرٹھ کالج کے انٹرمیڈیٹ درجے کے متعلم تھے۔ والد نے ان کے شوق کے پیش نظر اصرار تو نہ کیا، لیکن ہے یہ کہ اب ان کی مالی حالت اتنی اچھی نہیں تھی کہ وہ اتنے بڑے کنبے کی پرورش کے ساتھ ان کی تعلیم کا خرچ بھی برداشت کر سکتے۔ کالج کے پرنسپل مسٹر جیمیس کو جب معلوم ہوا کہ اس طالب علم نے سرکاری ملازمت پر تعلیم کو ترجیح دی ہے، حالانکہ اس کے گھر کی مالی حالت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ ملازمت قبول کر لیتا، تو وہ بہت خوش ہوئے۔ اس کا اظہار انھوں نے منجملہ اور سہولتوں کے اس طرح سے کیا کہ انھیں ایک انگریز مسٹر نکسن کو اردو فارسی پڑھانے پر مقرر کرا دیا۔ مشاہرہ چالیس روپے مقرر ہوا۔ لیکن ایک مہینا بھی مشکل سے گزرا ہو گا کہ انھوں نے مسٹر نکسن سے کہا کہ میں آپ کو اردو، فارسی پڑھاؤں گا، آپ مجھے انگریزی پڑھا دیا کیجیے؛ اس صورت میں آپ کو مجھے تنخواہ دینے کی ضرورت نہیں۔ تھوڑی سی حیص بیص کے بعد مسٹر نکسن اس انتظام پر راضی ہو گئے، جس سے دونوں کو بہت فائدہ پہنچا۔ چنانچہ ہندستان سے واپس جانے کے بعد نکسن صاحب غالباً لیڈز یونیورسٹی میں فارسی پڑھانے پر مقرر ہو گئے تھے۔ انھوں نے حامد اللہ افسر کی کئی نظموں کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا تھا۔

بی اے کا امتحان پاس کر لینے کے بعد ڈاکٹر ضیاء الدین (ف: دسمبر ۱۹۴۷ء) نے کوشش کی تھی کہ یہ سرکاری ملازمت میں لے لیے جائیں۔ لیکن افسر صاحب نے کہا کہ میں یا تو کتابوں کی اشاعت کا کام کروں گا، یا پھر تعلیمی محکمے میں پڑھانے کا۔ ۱۹۲۶ء میں ان کے والد مفتی محمد عصمت اللہ کا انتقال ہو گیا۔ تعزیت کے لیے آنے والوں میں ان کے والد کے ایک دوست کا یو پی حکومت میں اچھا خاصا اثر و رسوخ تھا۔ ان کی وساطت سے دسمبر ۱۹۲۷ء میں وہ گورنمنٹ جوبلی کالج، لکھنؤ میں اردو پڑھانے پر مقرر ہو گئے۔ یہیں سے ۲۳ برس بعد ۱۹۵۰ء میں سبکدوش ہوئے۔ ملازمت کے آخری زمانے میں وہ کالج کے وائس پرنسپل کے عہدے پر فائز تھے۔

ان کے آخری ایام بہت تکلیف میں بسر ہوئے۔ آمدنی تقریباً مفقود، اسبابِ معیشت کی روز افزوں گرانی، کبر سنی۔ ان سب کے مجموعے نے نڈھال کر دیا تھا۔ تپ دق ہو گئی۔ یو پی حکومت اور یو پی اُردو اکاڈمی نے کچھ مالی امداد دی، لیکن حالت خراب سے خراب تر ہوتی چلی گئی۔ آخر کار بغرضِ علاج لکھنؤ میڈیکل کالج کے تپِ دق کے شعبے میں داخل ہو گئے تھے، لیکن اب حالت علاج کی حدود میں نہیں رہی تھی۔ وہیں ۱۹ اپریل ۱۹۷۴ء سہ پہر میں انتقال ہو گیا۔ تجہیز و تکفین اگلے دن ۲۰ اپریل کو ہوئی۔ قدیم اطبائے لکھنؤ کے خاندانی قبرستان، محلہ جھوائی ٹولہ کی مٹی قسمت میں لکھی تھی۔

افسر نے شعر گوئی بہت جلد شروع کر دی تھی۔ اول اول انھوں نے لوریاں اور گیت لکھے۔ یہ آج سے ۶۰۔ ۶۵ سال پہلے کی بات ہو، جب اُردو والوں کو ان باتوں کا علم بھی نہیں تھا۔ ان کی یہ لوریاں یو پی کے دیہات میں ماِئیں اور بڑی بوڑھیاں آج بھی اپنے بچوں کو سناتی ہیں، اگرچہ یہ کسی کو معلوم نہیں کہ ان کا لکھنے والا کون ہے۔ ان کا ایک مختصر مجموعہ "بچوں کے افسر" کے عنوان سے نور الحسن ہاشمی نے چند سال بیشتر شائع کیا تھا۔ افسر کا نام خاص کر بچوں کے شاعر کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہوا، لیکن انھوں نے نظم و نثر میں خاصا بڑا ذخیرہ اپنی یادگار چھوڑا ہے۔ ان کی سب سے پہلی کتاب "چاد چاند" ہے جس میں چار کہانیاں ہیں۔ یہ کتاب جب پہلی مرتبہ چھپی ہے، تو وہ انٹر کے پہلے سال کے طالب علم تھے۔

اسی زمانے میں ٹیگور کو نوبل انعام ملا، تو مسٹر نکسن نے انھیں مشورہ دیا کہ ٹیگور کی کتاب کریسنٹ مون (ششو) کا اُردو ترجمہ کر دیں۔ چنانچہ انھوں نے ترجمہ کیا اور اس کا نام "ماہِ نو" رکھا (مسٹر نکسن نے "چھوٹی چھوٹی کرنیں" نام تجویز کیا تھا)۔ یہ ترجمہ بہت مقبول ہوا اور اسی کے ساتھ "چاد چاند" بھی جو اب تک گمنام تھی، منظرِ عام پر آگئی۔ دونوں کتابوں کے سال بھر میں کئی ایڈیشن نکل گئے اور ان سے افسر صاحب کو اتنی یافت ہو گئی کہ وہ اپنے تعلیمی اخراجات کی طرف سے بےفکر ہو گئے۔

"ماہِ نو" کے ترجمہ کا شاخسانہ ایک اور طرح نمودار ہوا۔ انگریزی کتاب کے ناشر (میک ملن کمپنی)

نے انھیں ہرجانے کا نوٹس دے دیا کہ تم نے ہماری اجازت کے بغیر ہماری "کاپی رائٹ" کتاب کا ترجمہ کیوں چھاپا ہے؟ یہ بیچارے سیدھے سادے آدمی، بھلا ان قانونی موشگافیوں کو کیا جانیں، کلکتے کا ٹکٹ لیا اور خود ٹیگور کی خدمت میں جا پہنچے۔ ٹیگور نے انھیں اس ضغطے سے نکلنے کی راہ سجھائی۔ کتاب کا ہندی ترجمہ بعنوانِ "شِشو" بھی چھپ چکا تھا اور اس کے جملہ حقوق خود ٹیگور کے پاس تھے۔ ٹیگور نے ان سے کہا کہ تم میک میلن کمپنی کے نوٹس کے جواب میں لکھ دو کہ میں نے اُردو ترجمہ انگریزی سے نہیں، بلکہ ہندی سے کیا ہے۔ یہی انھوں نے لکھ دیا، جس پر انگریزی ناشر خاموش ہو گئے اور یوں یہ بلا ٹل گئی۔ اس کے بعد سے ٹیگور سے عمر بھر کے لیے ذاتی تعلقات قائم ہو گئے۔

ان کی تصانیف کی مختصر فہرست یہ ہے:

۱۔ نظم: پیامِ روح (الہ آباد ۱۹۲۷ء)؛ جوئے روان (لکھنؤ ۱۹۵۴ء) دونوں میں نظمیں اور غزلیں ہیں۔ دوسری کتاب پر حکومت یو پی نے ۵۰۰ روپے انعام دیا تھا۔ حق کی آواز (لکھنؤ ۱۹۴۲ء) دوسری جنگِ عظیم سے متعلق نظمیں۔

۲۔ افسانہ: چار چاند (میرٹھ ۱۹۱۷ء)؛ ڈالی کا جوگ (الہ آباد ۱۹۲۷ء)؛ آنکھ کا نور (لکھنؤ ۱۹۴۰ء)؛ پرچھائیاں (لکھنؤ ۱۹۴۵ء)

۳۔ ڈراما: ہفت منظر (لکھنؤ ۱۹۴۲ء) ایک ایکٹ کے ڈرامے۔

۴۔ تنقید: نقدالادب (لکھنؤ ۱۹۳۵ء)؛ تنقید کی تاریخ اور اس کے اصول؛ کتابوں کی جنگ (لکھنؤ ۱۹۳۸ء)؛ نورس (لکھنؤ ۱۹۳۸ء)؛ تنقیدی اصول اور نظریے (ادارۂ فروغِ اُردو لکھنؤ)

۵۔ ترجمہ: ماہِ نو (میرٹھ ۱۹۱۸ء) ٹیگور کے کریسنٹ مون کا ترجمہ

۶۔ قومیات: ہمارا جھنڈا (لکھنؤ ۱۹۵۸ء)؛ پندرہ اگست (لکھنؤ ۱۹۴۷ء)؛ تاریخ تحریکِ آزادی؛ گاندھی جی کے ساتھ (لکھنؤ ۱۹۶۰ء)؛ گاندھی جی کے اقوال؛ حکایاتِ گاندھی (سنگم، دلی) گاندھی جی کی روزمرہ کی زندگی کے سبق آموز واقعات۔

۷۔ متفرقات: آسمان کا ہمسایہ (الہ آباد ۱۹۵۴ء) ایورسٹ کی کہانی؛ تمدنی

کی راہیں، عملی نفسیات (بچوں کے لیے) جانوروں کی عقلمندی (سنگم، دلّی)، گلیور کا سفر نامہ (بچّوں کے لیے) سوفٹ کی مشہور کتاب کا ترجمہ، مکانوں کی کہانی۔ ان کے علاوہ انھوں نے بچوں کے نصاب کی متعدد کتابیں بھی لکھی تھیں۔ جو برسوں یو پی کے مدارس میں پڑھائی گئیں۔ غیر مطبوعہ کتابوں میں ایک طویل مثنوی "آدم نامہ" ہے، جس میں انسان کی آفرینش کا مقصد بیان کیا ہے۔ ایک مسدّس "رزم آخر" بھی ہے، اس کا موضوع اورنگ زیب۔ اور دارا شکوہ کی جنگ ہے۔ ایک اور کتاب "ذوق ادب کی تربیت" بھی لکھی تھی۔ ۱۹۶۷ء میں انھوں نے اپنی سوانحعمری لکھنا شروع کی تھی۔ خدا معلوم یہ مکمّل ہوئی تھی، یا نہیں۔

اب آخر میں چند شعر ملاحظہ کیجیے۔ پختگی اُن کا طرۂ امتیاز ہے۔ حسنِ فطرت کے دلدادہ اور روحانیت کے علمبردار ہیں۔ محبِّ وطن اور بنی نوعِ انسان کے ہمدرد۔

ہزار نیرنگیوں کے مالک! مجھے بتادے یہ کیا ستم ہے
کہ تیرے کعبے میں رہنے والا، کبھی خدا ہے، کبھی صنم ہے
مجھے بتانا تھا حال کچھ تو، وہ پوچھتے تھے کہ حال کیا ہے
مگر میں بے اختیار، افسرؔ! یہ کہہ اٹھا: "آپ کا کرم ہے"

چاہتے ہیں اب تو یہ سودائیانِ جستجو ۔۔۔ کاش، منزل پر کوئی کہہ دے کہ یہ منزل نہیں

تاروں کا گو شمار میں آنا محال ہے ۔۔۔ لیکن کسی کو نیند نہ آئے، تو کیا کرے

جب دل پہ نہ ہو قابو اپنا، کیا ضبط کریں، کیا صبر کریں!
مجھ جیسے کاش، وہ ہو جائیں جو آ آ کر سمجھاتے ہیں

جب خوشی کا خیال آتا ہے ۔۔۔ دلِ مایوس کانپ جاتا ہے

صدائیں آتی ہیں دھیمے سُروں میں گانے کی ۔۔۔ اب آج پھر نہیں امید نیند آنے کی

کیا پوچھتے ہو، کیا حالت ہے؟ جو پڑتی ہے وہ سہتے ہیں
پھر شام ہوئی، پھر رات ہوئی، یہ دن بھر دھڑکے رہتے ہیں
فطری سہی خاموشی لیکن کچھ چوٹ بھی دل پر کھائی ہے
ہم نے اکثر دیکھا ہے، کچھ افسر چپ چپ رہتے ہیں

یہ بھی اک تماشا ہے کاروبار الفت میں — دل کسی کا ہوتا ہے، بس کسی کا چلتا ہے

اس قدر بھی الفت میں ہو نہ کوئی بے قابو — دل میں سوچتا کیا ہوں، منہ سے کیا نکلتا ہے

انسان وہ ہے جو، اے افسر! ٹھکرائے مصائب کو پیہم

ساحل جسے کہتی ہے دنیا، ہمسایہ ہے طوفانوں کا

حسن ہر ہستی کے اندر بے نقاب — حسن پھر بھی ہے حجاب اندر حجاب

دیر و کعبہ پر حقیقت تو کھلے — اب الٹ ہی دیجیے رخ سے نقاب

جب سفر، افسر! کبھی کرتے نہیں — دیکھتے پھر کیوں ہو تم منزل کے خواب

موت ہے وہ راز جو آخر کھلے گا ایک دن — زندگی ہے وہ معمہ جس کا کوئی حل نہیں

جو جینا ہو تو پہلے زندگی کا مدعا سمجھے — خدا توفیق دے، تو آدمی خود کو خدا سمجھے

ہائے وہ، جس کی امیدیں ہیں خزاں پر موقوف

شاخ گل سوکھ کے گر جائے، تو کاشانہ بنے

کیف ساماں کوئی مجھ سا بھی نہ ہوگا، افسر!

آنکھ جس پھول پہ ڈالی، وہی پیمانہ بنے

شب سے نہیں کم ہجر کے ماروں کی سحر بھی — یعنی وہی غفلت ہے، وہی بےخبری ہے

اب آپ اسے دل کہیں، یا دل کی تمنا — اک آگ سی افسر! مرے سینے میں بھری ہے

جو غم حد سے زیادہ ہو، خوشی نزدیک ہوتی ہے

چمکتے ہیں ستارے، رات جب تاریک ہوتی ہے

ہے زندگی عالم کی عمل ہی سے سرافراز — فطرت کے ہر انداز سے اخفا ہے یہی راز

پرواز سے مل جاتی ہے جگنو کو تب و تاب — تاریک ہے جگنو کا جہاں، گر نہ ہو پرواز

بے روح سی، بے جان سی پھر آج ہے دنیا — ویران ہے، برباد ہے، تاراج ہے دنیا

اب منہ نہیں یزداں سے کُن سننے کا، افسر! — انسان سے کُن سننے کی محتاج ہے دنیا

اثرؔ حیدر آبادی، صدیق احمد

حضرت امیرؔ مینائی (ف: اکتوبر ۱۹۰۰ء) کے شاگردِ رشید فصاحت جنگ جلیلؔ مانکپوری کے نام نامی سے کون اُردو دان واقف نہیں ہوگا! وہ امیر اللغات کی ترتیب و تدوین میں استاد کے دستِ راست تھے۔ ۱۸۹۹ء میں جب نظام دکن میر محبوب علی خان شمالی ہند کی سیر کے لیے تشریف لائے، تو استاد داغؔ (ف: ۱۹۰۵ء) نے امیر مینائی کو، جنھیں وہ اپنے قیام رامپور کے زمانے سے جانتے تھے، بنارس کے مقام پر حضور نظام کی خدمت میں پیش کیا۔ اعلیٰ حضرت نے ایما فرمایا کہ امیر مینائی حیدرآباد آئیں۔ رامپور کی بساط الٹ چکی تھی، اور امیر بہت پریشان حال تھے۔ یہ تھوڑا سا سہارا ملنے پر انھوں نے پیرانہ سالی اور گوناگوں جسمانی عوارض کے باوجود طوعاً و کرہاً دکن کا کالے کوسوں کا سفر گوارا کر لیا۔ لیکن یہ سفر حیدرآباد کا نہیں بلکہ ان کا سفر آخرت ثابت ہوا۔ جہاں حیدرآباد سے ہو کر جانا ان کے مقدر میں لکھا تھا۔ وہاں پہنچنے کے چند ہی ہفتے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

امیر اس سفر میں اپنے چہیتے شاگرد جلیل مانکپوری کو بھی ساتھ لیتے گئے تھے۔ استاد کی وفات کے بعد جلیل حیدرآباد ہی میں مقیم رہے، اور انھوں نے بقیہ زندگی وہیں بسر کر دی۔ داغ نے ۱۹۰۵ء میں رحلت کی، تو ان کے بعد میر محبوب علی خان مرحوم جلیل سے مشورہ کرنے لگے اور جب ۱۹۱۱ء میں خود ان کی رحلت کے بعد اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خان نظام ہفتم ان کے جانشین ہوئے، تو انھوں نے بھی جلیل کی شاگردی اختیار کی۔ اس عہد میں جلیل کو بہت عروج حاصل ہوا۔ قدر دان شاگرد نے جاہ و منصب سے نوازنے میں

کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ جلیل نے یہیں حیدرآباد میں ۶ جنوری ۱۹۴۶ء کو سفرِ آخرت اختیار کیا۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ۔

صدیق احمد اثر انھیں جلیل کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے۔ وہ ۲۴ اگست ۱۸۸۷ء (۴ ذی الحجہ ۱۳۰۴ھ) کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی اور اس کی تکمیل دارالعلوم ندوۃ العلما، لکھنؤ میں کی۔ یہ وہی زمانہ ہے، جب علّامہ سیّد سلیمان ندوی مرحوم (ف: نومبر ۱۹۵۳ء) میں وہاں طالبِ علم تھے، ان دونوں کا یارانہ بھی تھا۔ لکھنؤ سے فارغ ہوئے تو یہ بھی والد کے پاس حیدرآباد چلے گئے۔ وہاں وکالت اور عدلیہ کا امتحان درجۂ اوّل میں پاس کیا۔ (۱۹۱۰ء) اوّلاً کچھ مدت پایگاہ وقارالامرا میں عہدہ دارِ عدالت کے طور پر کام کیا؛ بعد کو ۱۹۱۵ء میں ریاست کی باقاعدہ ملازمت مل گئی اور منصف دیوانی مقرر ہوئے۔ بتدریج ترقی کرکے ناظم ضلع عدالت کے عہدے تک پہنچے اور بالآخر یہیں سے ۱۹۴۴ء میں وظیفہ حسنِ خدمت (پنشن) پر سبکدوش ہوئے۔ وظیفہ پانے کے بعد حضور نظام نے اوّل مہتمم توشہ خانہ مقرر کیا، پھر محکمہ صرفِ خاص (پرائیوٹ پرس) میں منصف بنا دیا۔ وہاں کی میعاد پوری کرنے کے بعد بھی فراغت اور فارغ البالی کی زندگی بسر کی۔

چونکہ لکھنے پڑھنے کا شوق تھا اور اب کوئی دفتری ذمّہ داری حائل نہیں رہی تھی، اس زمانے میں انھوں نے ایک گلدستہ "فصاحت" (ماہانہ) جاری کیا۔ اس میں مشاہیرِ عہد کا کلام شائع ہوتا تھا۔

جلیل کے انتقال (۱۹۴۶ء) کے بعد حضور نظام میر عثمان علی خان مرحوم اپنی وفات (۲۴ فروری ۱۹۶۷ء) تک اثر سے مشورۂ سخن بھی کرتے رہے۔ انھوں نے اپنے کلام کی ترتیب و تدوین اور اشاعت کی نگرانی بھی ان کے سپرد کردی تھی اور اس سلسلے میں احکام بھی جاری ہوگئے تھے۔ ان کی وفات کے بعد نظام ٹرسٹ قائم ہوا، تو مکرّم جاہ بہادر نواب میر برکت علی خان بالقابہ نے اثر کو ادبی ٹرسٹ کا صدر نامزد کردیا۔ چنانچہ نظام ہفتم مرحوم کا کلام مرتب ہوگیا اور اب شاید زیرِ طباعت ہے۔

وفات سے قبل دونوں آنکھوں میں موتیا بند اتر آیا تھا، جس کا آپریشن نہیں ہوسکتا تھا۔

رفتہ رفتہ بینائی بالکل زائل ہو گئی۔ اس کا اثر ان کے دماغ پر پڑا اور توازن قائم نہ رہا، سوجھ بوجھ مطلق نہیں تھی۔ دماغ کا علاج آخر وقت تک جاری رہا۔ اسی حالت میں اپنے مکان جلیل منزل، حیدرآباد میں ہفتے کے دن ۲۷ اپریل ۱۹۷۴ء (۴ ربیع الثانی ۱۳۹۴ھ) فجر سے پہلے چار بجے انتقال کیا؛ ۷۸ برس کی عمر پائی۔

خطۂ صالحین (نام پلّی، حیدرآباد) میں سپردِ خاک ہوئے۔ یہ سرکاری قبرستان ہے۔ اعلیٰحضرت میر عثمان علی خان مرحوم کے عہد میں یہ قبرستان مخصوص بزرگ شخصیتوں اور عمائدِ سلطنت کے دفن کرنے کو استعمال ہوتا تھا، اب یہ بھی نظام چیریٹی ٹرسٹ کی نگرانی میں ہے۔ ان کے والد حضرت جلیل بھی اسی قبرستان میں آسودۂ خواب ہیں۔

کتبۂ مزار کے لیے ان کے برادرِ خرد جناب علی احمد جلیلی نے عیسوی میں تاریخ کہی:

وہ جو تھے صدیق احمد خوش سِیَر کر گئے اس دارِ فانی سے سفر
بائے بسم اللہ سے مصرع ملا فاتحہ پڑھ لو اثر کی قبر ہے
(۲ + ۱۹۷۲ء = ۱۹۷۴ء)

مرحوم صاحبِ فن تھے جلیل کی قدرتِ کلام اور مہارتِ فن ان کے متعدد نظم و نثر کے مجموعوں سے عیاں ہے۔ اثر اپنے والد کے شاگرد اور متبع تھے۔ انھیں کی طرح رموزِ شعر اور نکاتِ عروض گویا ان کی گھٹی میں پڑے تھے۔ جلیل کی وفات کے بعد ان کے اکثر تلامذہ نے اثر سے رجوع کیا۔ اثر کا ضخیم دیوان ان کی زندگی میں مرتب ہو چکا تھا، لیکن افسوس کہ آج تک اس کے شائع ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ چند شعر ملاحظہ ہوں، جو ان کے برادرِ خرد جناب علی احمد جلیلی نے عنایت فرمائے ہیں:

وصل منظور ہو یا قتل نہیں اس سے غرض جان دیتا ہوں میں اس پر کہ مجھے یاد کیا
اس سے ظاہر ہے کہ ہے شاق جدائی میری بال و پر باندھ کے صیاد نے آزاد کیا
تیرے دامن کی ہوا بھی کہ صبا کے جھونکے مجھ کو رسوا صفتِ نکہت برباد کیا

وہ دل لینے کو آئے ہیں، مگر طرفہ تماشا ہے ہجومِ حسرت و رنج و الم میں دل نہیں ملتا
تری تصویر کا رازِ خموشی کیا کوئی جانے! وہ چپ یوں ہے کہ کوئی بات کے قابل نہیں ملتا

کہاں کھویا، کہاں بھولا، خدا جانے کہاں چھوڑا
ترے کوچے میں کب سے ڈھونڈتا ہوں، دل نہیں ملتا
اثرؔ! اشعار تیرے سن کے اہلِ ذوق کہتے ہیں
غنیمت ہے یہ ناقص! جب کوئی کامل نہیں ملتا

حشر کا ہنگامہ کہتے ہیں جسے
وہ ہے میری داستانِ دردِ دل
اُن کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے
سُن رہے تھے جو بیانِ دردِ دل

نہ چھو سکیگی جہنم کی آگ رندوں کو
جو میکدے میں ہے ڈوبا ہوا شراب میں ہے
کہا یہ دیکھنے والوں سے تنگ آئے ہیں
کہ آئینہ بھی وہاں آج کل عتاب میں ہے
ادائیں مست، نظر مست، چال میں مستی
جو میکدے میں ہے عالم، وہی شباب میں ہے

دل جلوں سے بڑھ گئی رونق تمہاری بزم کی
آہ کی چنگاریاں شمعِ شبستاں بن گئیں
تھی ذرا سی مے، مگر تیرے کرم سے ساقیا!
پیاس میں وہ چند بوندیں آبِ حیواں ہوگئیں

کہتا ہے یہ انداز گل و سرو و سمن کا
کیا رنگ پہ جوبن ہے عروسانِ چمن کا
دیرینہ گدائے درِ میخانہ ہوں، ساقی!
ساغر ہو عنایت کوئی صہبائے کہن کا

موسمِ گل میں چمن رشکِ میخانہ ہے
ہر طرف خندۂ گل، خندۂ پیمانہ ہے
وہی اچھا ہے جو ہے بزم و چمن میں آزاد
گل کا بلبل، نہ کسی شمع کا پروانہ ہے

دی صدا آہ نے، جب ناوکِ جلّاد آیا
کہ تجھے اب تو قرار، اے دلِ ناشاد! آیا
اور اک تیر یہ کہہ کر مجھے اس نے مارا
ہو گیا دل جو نشانہ، تو جگر یاد آیا
کیا تواضع ہے جو ہم کوچۂ قاتل کو چلے
پیشوائی کے لیے ناوکِ جلّاد آیا

جام و خم دیتا ہے ہر دم ہے شناسا ساقی
ہیں ہوش میں کب ساقیِ بیگانہ نہیں ہوتا!
کرتا ہے دو عالم میں وہ حشر بپا، لیکن
پردے سے عیاں روئے جانانہ نہیں ہوتا

ترا بھی دور کیا، اے باغباں ہے
قفس آباد، ویراں آشیاں ہے
خیالِ زلف میں بہتے ہیں آنسو
اندھیرے میں رواں یہ کارواں ہے
کہاں پہنچی ہے، مشتِ خاک اڑ کر
زمیں نیچے ہے، اوپر آسماں ہے
سرِ منزل پہنچ کر پوچھتا ہوں
یہ بتلا دو، مری منزل کہاں ہے
چمک اٹھیگی اب قسمت اثرؔ کی
جبیں اس کی ہے، سنگِ آستاں ہے

مے پلائے نگہِ مست، رہیں ہم ہشیار   ظرف اتنا، ترے قرباں! کہاں سے لائیں!

مان لی بات اُن کی دھوکا ہو گیا   مفت میں خونِ تمنّا ہو گیا

حشر کا دن بھی، بڑے خوف کا دن ہے، لیکن
منھ دکھانا نہ، الٰہی! شبِ تنہائی کا

حوصلہ دل کا، نہ دل سے نہ جگر سے نکلا   اشک بن بن کے مرے دیدۂ تر سے نکلا

پھاڑنا جیب و گریباں کا بہار آنے پر   عاشقوں کا یہ طریقہ گلِ تر سے نکلا!

اتنی نسبت مری بخشش کو بہت کافی ہے   تیرا بندہ ہوں، ترا نام لیا کرتا ہوں

خضر تمیمی، مولا بخش

کسی زمانے میں چنیوٹ ضلع جھنگ (پاکستان) میں قصابوں کی برادری بڑی بااثر اور متمول تھی، شاید اب بھی ہو۔ مولا بخش اسی خاندان کے نورِ نظر تھے۔ چنانچہ وہ بھی کبھی ازراہِ تفنن کہا کرتے تھے:

رونقِ دودمانِ قصّابیم

اگرچہ سرکاری اسناد اور کاغذات میں ان کی تاریخ ولادت ۱۱ مارچ ۱۹۰۹ء درج ہے لیکن دراصل یہ یکم جنوری ۱۹۰۸ء تھی۔ خود لکھتے ہیں:

> تاریخ پیدائش (دروغ برگردنِ راوی) یکم جنوری ۱۹۰۸ء ہے۔ ہماری پیدائش کے اعزاز و احترام میں اس روز مسیحی اور پارسی دنیا میں تعطیل منائی جاتی ہے۔ (شعرائے پنجاب ۲۵۰)

ابتدائی تعلیم اپنے وطن چنیوٹ میں پائی۔ انٹر کا امتحان گورنمنٹ کالج، لائل پور (حال فیصل آباد) اور بی اے کا اسلامیہ کالج لاہور سے پاس کیا۔ چونکہ طبیعت میں شعر و ادب کا مذاق تھا، اس کے بعد لاہور کے مختلف روزناموں اور ماہانہ پرچوں میں لکھنے لگے۔ چنانچہ اس زمانے میں انھوں نے روزنامہ احرار اور حریت (۱۹۲۹ - ۱۹۳۱ء) اور اختر شیرانی مرحوم کے ماہانہ رسالوں خیالستان اور رومان میں کام کیا (۱۹۳۱ - ۱۹۳۳ء) اس کے بعد ۱۹۳۶ء میں ایم اے (فارسی) کی سند پرائیویٹ طور پر حاصل کی۔ اس زمانے میں پنجاب یونیورسٹی میں شام کے وقت قانون (لا) کی تعلیم کا انتظام کیا گیا تھا، تاکہ دفتروں کے ملازم وغیرہ اپنے کام کاج سے فارغ ہو کر قانون کے درجوں کی تعلیم

حاصل کر سکیں۔ (خود میں نے وہاں سے ۱۹۳۳ء میں اسی طرح ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا تھا) مولا بخش نے بھی اسی سے فائدہ اٹھایا اور یوں ایم اے، ایل ایل بی ہو گئے۔ اب انھوں نے چنیوٹ میں وکالت شروع کر دی۔ اور رفتہ رفتہ زیادہ تر اپنی برادری کی پشت پناہی اور اثر و رسوخ سے، اور کچھ اپنی محنت اور ریاض کی بدولت، ان کا وہاں کے اچھے وکیلوں میں شمار ہونے لگا۔

چنیوٹ کے اسی قیام کے دوران میں انھوں نے اپنا ذاتی ہفتہ وار پرچہ "جہاں نما" جاری کیا تھا۔ وکالت اور ادبی پرچے کی ادارت، دونوں ایک ساتھ نہیں چل سکے۔ چنانچہ سال بھر کے اندر پرچہ بند کرنا پڑا۔ لیکن ہے یہ کہ درحقیقت کسی مرحلے پر بھی وکالت انھیں راس نہیں آئی۔ شاید چنیوٹ کا دیہاتی ماحول بھی سدِّ راہ رہا ہوگا۔ کچھ ہو، ۱۹۳۶ء میں وہ گورنمنٹ کالج، دھرم سالہ میں اردو فارسی کے مدرّس مقرر ہو گئے۔ مشکل سے سال بھر وہاں گزرا ہوگا کہ مستعفی ہو کر اب کے لاہور میں وکالت شروع کر دی یہاں لاہور میں حکومتِ وقت اور ریڈیو نے ان کی صلاحیتوں کا بھرپور فائدہ اُٹھایا محکمۂ دیہات سدھار و پنچایت نے انھیں اپنا تعلیمی افسر مقرر کر دیا۔ اس میں جہاں انھیں پنجاب کے دیہاتی علاقوں کی خاک چھاننا اور تقریر بازی کرنا پڑی، وہیں محکمے کے اخبار "پنچایت" کی ادارت بھی ان کے سپرد ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ چراغ حسن حسرت (ف: جون ۱۹۵۵ء) کے ہفتہ وار "شیرازہ" اور مجید لاہوری (ف: جون ۱۹۵۷ء) کے "نمکدان" میں مزاحیہ مضامین اور نظمیں بھی لکھتے رہے۔ سیاسی نوعیت کے مضمون "قلندر" کے قلمی نام سے "روزنامہ "نوائے وقت" میں لکھے جاتے تھے۔ یہ سلسلہ ۱۹۵۶ء تک رہا۔ اسی دوران میں ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۷ء تک وہ جز وقتی طور پر یونیورسٹی کالج، لاہور میں لیکچرر بھی رہے۔

آخر میں سب طرف سے فارغ ہو کر پھر لاہور ہائی کورٹ میں وکالت شروع کر دی تھی اور اچھے وکیلوں اور قانون دانوں میں گنے جاتے تھے۔

اپریل ۱۹۷۰ء کو لاہور میں انتقال ہوا۔

ادب اور موسیقی گویا ان کی گھٹی میں پڑے تھے۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ وہ طالب علمی کے زمانے میں بھی طبلہ بجانے میں لاہور کے چوٹی کے طبلہ نوازوں میں سے تھے؛ یہ فن انھوں نے سبقاً سبقاً اساتذۂ وقت سے سیکھا تھا۔ شعر میں زیادہ توجہ طنز و مزاح اور پیروڈی پر مبذول رہی، اگرچہ سنجیدہ کلام بھی مقدار میں کچھ کم نہیں ہے۔ انھیں مکالمہ لکھنے میں خاص مہارت تھی۔

اسی انداز کی ایک نظم "مناظرۂ سارنگی و طبلہ" ملاحظہ ہو، جس میں چودھری خوشی محمد ناظر کی نظم "جوگی (شاعر)" کا اثر نمایاں ہے؛ بحر بھی وہی ہے:

دنیا بھر کے بیفکروں نے کل بزمِ سرور سجائی تھی
کیا دل کو مسلتا تھا طبلہ، کیا سارنگی رنگ لائی تھی

بسمل کی رگِ جاں تنتی تھیں، طاؤس کی ماریں لرزش سے
چائے کا پیالہ دور میں تھا، حقّے نے دھوم مچائی تھی

رندوں نے جھنڈے گاڑے تھے، زاہد نے ڈیرے ڈالے تھے
اس دیر و حرم کی محفل میں، موسیقی گانے آئی تھی

یاں شکوے سے پُر سارنگی، واں پیچ و تاب میں تھا طبلہ
گز بھر کی زباں یاں چلتی تھی، واں ہاتھوں کی بن آئی تھی

واں تھاپ کے ادگر جتے تھے، نغموں کی پھواریں پڑتی تھیں
یاں ہر دل پر موسیقی کے کہرے نے قنات لگائی تھی

اڑتی تھیں فضا بھر میں تانیں، تھی چال صبا کی مستانہ
اس حال میں بیچ بس دونوں کے جا بیٹھا شاعر مستانہ

سارنگی بولی طبلے سے، تم یونہی شور مچاتے ہو
اے منہ پھٹ طبلے دیوانے! کیوں کان ہمارے کھاتے ہو

آواز تمھاری کوے سی، اور شکل چھلاوے سی بتری
ان میٹھی میٹھی تانوں سے، تم رنگ میں بھنگ ملاتے ہو

لعنت ہے تمھارے جینے پر، آرام نہیں عزت بھی نہیں
یں گود وں بیٹھی پلتی ہوں، تم سر اپنا پٹواتے ہو

ہے خام ابھی تک عشق ترا، کچھ صبر نہیں کچھ تاب نہیں
یاں تان اڑی اک میٹھی سی، واں تھام کے دل رہ جاتے ہو

میں راج دلاری البیلی ناری ہوں، پریم کنھیا ہوں
تم ہونڈی کاٹے مردک ہو، ہر جا پر دھکّے کھاتے ہو

تہذیب تمھیں منظور نہیں، اور عقل ترا دستور نہیں
تم بھیم کی تانوں میں باہر کیوں آپے سے ہو جاتے ہو

نازوں سے پلی شہزادی ہوں، میں ناری محلوں والی ہوں
تم حبسِ دوام کے قیدی ہو، صندوقوں میں ڈٹ جاتے ہو

جب سارنگی نے طبلے سے یوں دلشکنی کا کلام کیا
کچھ دیر تو وہ خاموش رہا، پھر بھابی جان کو سلام کیا

یوں کہنے لگا سارنگی سے: جلتی پر تیل گراتی ہو
ہم رنج والم کے مارے ہیں، تم آکر اور ستاتی ہو

عشاق سے یوں منہ پھیرا کیوں، پھر تو نے ہمیں گھیرا کیوں؟
رہنے دو اسے چپ، مجبور اگ کیوں میری زباں کھلواتی ہو

میں زنجیبار کا شہزادہ میدان میں آکر ضیغم سا
جب ایک دہاڑ لگاتا ہوں، تم پردوں میں رہ جاتی ہو

پیمانِ وفا جس سے باندھوں، میں پاس اسی کے رہتا ہوں
تم ہر جائی ہو، ہر اک کے پہلو میں دل بہلاتی ہو

کچھ لطف ہے بیلنہ کو بی میں سر پھوڑنے میں ہم مستوں کو
بی! یہ تو عشق کے زیور ہیں، تم یونہی ہمیں بناتی ہو

عزت پہ ہماری حرف زنی؟ اللہ غنی، اللہ غنی

وہ وقت، بڑی بی! بھول گئیں، جب کان اپنے کھجواتی ہو
تو پریم کنھیا، محفل میں کس بیباکی سے گاتی ہے
گو یوں تم بھولی بھالی ہو، کچھ کہتے بھی شرماتی ہو
میں تیری شمیمِ نغمہ کو، مانندِ نسیم اڑاتا ہوں
یہ میری تھاپ کی برکت ہے، دل بزم میں مسلے جاتی ہو
جب لڑکے مل کر گاتے ہیں، عرفان کی تانیں اڑاتے ہیں
ہاتھوں سے میز بجاتے ہیں، تم یاد کب ان کو آتی ہو!
میں آذرِ عشق کی تابش سے دل محفل کے گرماتا ہوں
طاؤس کو، طنبورے کو، تجھے دن میں تارے دکھلاتا ہوں
یہ سُن کر شمس الدینؔ[۵] ڈرے، تلوار مبادا اجل جائے
اور طبلہ سسکتا رہ جائے، سارنگی روتی رہ جائے
چمکارے سارنگی سے: تم سیدھی سادی بھولی ہو
زیبا نہیں، گر منہ میں ترے گنواروں کی سی بولی ہو
طبلے کے وکیلِ مطلق نے، داں ہاتھ سے اس کو سمجھایا
اچھا نہیں، خوں کی نہروں سے گر محفل بھر میں ہولی ہو
تم زنجبیار کے شہزادے، سارنگی، سارنگی ٹھہری
پھبتی نہیں، گر شہزادوں کی ایسی بولی ٹھولی ہو
خاموش ہوئیں بی سارنگی، اور طبلہ صمٌ بکمٌ تھا
یوں جیسے کسی نے زباں، اپنی آبِ کوثر میں دھولی ہو
القصّہ بچھڑے دوست ملے، نہ جھگڑا تھا، نہ شکوہ تھا
نے تن تنا تن، تن تن تھی، نے تاکڑ تاکڑ دھیّا تھا۔

---

۵ اس زمانے میں لاہور کا مشہور طبلہ بجانے والا تھا۔

نثار اٹاوی، نثار حسین

یکم مارچ ۱۹۱۴ء کو اٹاوہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد اولاد حسین صاحب عطر فروش تھے، اٹاوہ کے محلہ مقصود پورہ میں ان کی دکان تھی۔ اس سلسلے میں ایک لطیفہ بھی ہے۔ کمیٹی کے رجسٹر میں ان کے نام کے ساتھ ولدیت کے خانے میں کھراج (عرف بچھو) لکھا ہے۔ یوں خیال ہوتا ہے کہ کوئی ان پڑھ عورت اندراج کرانے گئی؛ اسے ان کے والد کا نام معلوم نہیں تھا، اس نے ماں کا نام لکھوا دیا۔ مدتوں بعد خود نثار صاحب نے اس کی اصلاح کرائی۔

ابتدائی تعلیم انجمن ہدایت الاسلام جونیر ہائی اسکول میں پائی۔ آٹھویں درجے تک یہاں پڑھے۔ اس کے بعد چونکہ حالات کی عدم موافقت کے باعث مزید تعلیم ممکن نہیں تھی، اپنے اسکول ہی میں بارہ روپلے مشاہرے پر مدرسی قبول کرلی۔ اسی زمانے میں انھوں نے شعر کہنا شروع کیا اور اسکول کے ہیڈ ماسٹر شیدا اٹاوی سے اصلاح لینے لگے۔ اکتوبر ۱۹۳۴ء میں مقامی اسلامیہ اسکول (حال انٹر کالج) میں ایک کل ہند مشاعرہ ہوا تھا۔ حضرت سیماب اکبرآبادی (ف: جنوری ۱۹۵۱ء) بھی اس میں مدعو تھے۔ نثار نے بھی غزل پڑھی۔ سیماب مرحوم اسے سن کر چونکے۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ شیدا کے شاگرد ہیں۔ انھوں نے نثار کو جوہر قابل پاکر انھیں اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ اس کے بعد یہ آخر تک سیماب کے حلقۂ تلامذہ میں شامل رہے۔ استاد نے بھی ان کی تہذیب و تربیت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ ان کا شمار سیماب کے ممتاز فارغ الاصلاح شاگردوں میں ہوتا تھا۔

اس واقعے کے تھوڑے ہی دن بعد وہ نوکری سے الگ ہو گئے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ ان کے پاس ٹریننگ کی سند نہیں تھی، اس لیے جب اسکول کا سالانہ معاینہ ہوا تو سرکل انسپکٹر مدراس نے یہ بات اپنی رپورٹ میں درج کر دی۔ اس سے اسکول کی امدادی رقم میں تخفیف ہو جاتی۔ لہٰذا اسکول والوں نے انھیں نوکری سے برخاست کر دیا۔ اب یہ پریشان حال تھے۔ بارے بیدم شاہ وارثی نے کچھ سہارا دیا۔ وہ خود مفلوک الحال تھے، کتنی مدد دے سکتے تھے! بہرحال اس سے سر چھپانے کا آسرا ہو گیا۔ اس زمانے میں انھوں نے کچھ رقم حاصل کرنے کے لیے ایک ڈراما "سوداگر بچہ" لکھا اور اسے بیس روپے میں فروخت کر دیا۔ اس سے انھیں کچھ جرأت ہوئی اور انھوں نے ایک طویل نظم "سیر پرستان" کہی، اس میں بازارِ حسن اور اس کے مکینوں اور اس سے وابستہ لوگوں کا طنزیہ انداز میں خاکا اڑایا گیا ہے۔ اس پر شہر کی طوائفوں نے بہت ہنگامہ برپا کیا، جس سے واقع ہے کہ شاد صاحب کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ اسی زمانے میں انھیں کچھ عشقِ مجازی کا بھی تجربہ ہوا۔ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں (اگرچہ میں پورا واقعہ جانتا ہوں) ان کے اس زمانے کے کلام میں اس کے نام تک کی تلمیحات موجود ہیں۔ بہرحال یہ طوفان بخیر و خوبی گزر گیا، بعد کے زمانے میں وہ اس پر تعجب کیا کرتے تھے۔

بیدم وارثی صاحب ان کے لیے کوشش کر رہے تھے۔ ان کی وساطت سے بدھونہ تحصیل میں نائب امین کی جگہ پر تقرر ہو گیا۔ لیکن چونکہ اس اسامی کے لیے کچھ زرِ نقد بطور ضمانت جمع کرانا پڑتا ہے، اور اسی کا انتظام نہ ہو سکا، وہ اس موقع سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ اس کے بعد بیدم صاحب ہی نے سفارش کی اور انھیں دوبارہ اپنے اسی پرانے انجمن ہدایت الاسلام اسکول میں عارضی جگہ مل گئی۔ اٹاوہ کا اسلامیہ ہائی اسکول اپنے زمانے میں بہت مشہور تھا۔ اس کے فارغ التحصیل طلبہ میں بعض مشاہیر کے نام ہیں (ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم سابق صدر جمہوریہ ہند بھی ان میں سے تھے) یہاں کے ہیڈ ماسٹر جناب الطاف حسین مرحوم، خدا بخشے، بڑی خوبیوں کے فرشتہ صفت بزرگ تھے۔

انھوں نے نثار کی بے لبسی کا اندازہ لگایا کہ اگر انھیں سہارا نہ ملا تو بے بادبان کی کشتی کی طرح طوفانِ مصائب کا شکار ہو جائینگے ۔ انھوں نے دستگیری کی اور انھیں اپنے اسکول میں جگہ دے دی ۔ یہ گویا ان کے لیے شاہراہِ ترقی پر پہلا قدم تھا ۔ یہیں سے انھوں نے ملازمت کے دوران میں یکے بعد دیگرے انٹر، اور بی اے، اور ایم اے (اردو) کے امتحان ناگپور یونیورسٹی سے پاس کیے ۔ اسکول کے زمانے میں بھی وہ اُردو کے صدر مدرس رہے اور جب یہ ترقی کر کے انٹر کالج بنا ، تو صدر شعبۂ اردو مقرر ہو گئے ۔ اپنی وفات تک وہ اسی عہدے پر قائم رہے ۔

انھوں نے ۶ مئی ۱۹۷۴ء کو گلے کے کینسر سے انتقال کیا ۔ ایک مرحلے پر ان کے کالج کے رفیقوں اور دوستوں نے چندہ جمع کر کے ان کے علاج کی پیشکش کی ، لیکن مرحوم نے اسے قبول نہ کیا ۔ کہا : یہ مرض لاعلاج ہے صحت تو مجھے اب نصیب ہو نہیں سکتی ، آپ حضرات کیوں اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی برباد کریں ! ڈیڑھ برس بیمار رہے اور آخر اسی میں جان بحق ہو گئے ۔

انھوں نے دو نکاح کیے تھے پہلی بیوی موضع ملبھور کی تھیں ۔ ان سے ایک لڑکا ہوا لیکن نہ معلوم کس بات پر اختلاف ہو گیا اور انھوں نے اس بیگم سے علیحدگی اختیار کر لی ۔ اس کے بعد دوسرا نکاح ۱۹۴۴ء میں جالون کے ایک معزز گھرانے میں ہوا ۔ اس سے چھ بچے ہوئے : چار بیٹیاں اور دو بیٹے ۔ ان میں سے صرف بڑی بیٹی (رافعہ) کی شادی اپنی زندگی میں کر سکے تھے ۔ یہ بیگم اور ان کی اولاد ماشاء اللہ اب موجود ہے ۔

اگرچہ نثار صاحب نے شاعری ۱۹۳۰ء میں شروع کی تھی ، لیکن ان کا اصلی دورِ شعر گوئی سیماب کے تلمذ کے بعد شروع ہوا ۔ اب تک وہ صرف غزل کہتے تھے ، اس کے بعد استاد کے کہنے پر انھوں نے نظم پر بھی توجہ کی ۔ ہندی بھی اچھی جانتے تھے (انھوں نے ۱۹۳۵ء میں ہندی کا "وشیش یوگیتا" امتحان پاس کیا تھا) اسی لیے انھوں نے اردو میں ہندی بنگل کے تجربے کیے ۔ ان کا ایک مجموعہ ہندی میں "دھرتی میرے پیار کی" شائع ہو چکا ہے ۔ مدت ہوئی ، اردو کلام کا ایک مختصر انتخاب "ماہ و انجم" کے عنوان سے شائع ہوا تھا (دتی ۱۹۵۲ء) یقیناً بہت کلام غیر مطبوعہ رہ گیا ہوگا ۔ کسی زمانے میں کلام

بڑے دلکش انداز میں پڑھا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ پہلا انداز رخصت ہوگیا، جلد تھک جاتے تھے کسے معلوم تھا کہ یہ گلے کے کینسر کا آغاز ہے۔
کلام پختہ اور فنی پہلو سے بے عیب ہے اور بجا طور پر وہ سیماب کے ارشد تلامذہ میں گنے جاتے تھے۔ نمونے کے چند شعر ملاحظہ ہوں!

کس گوشۂ ظلمت میں نہاں ہے دنیا ہے بھی کہ فقط وہم وگماں ہے دنیا
پیمانے میں تھوڑی سی جگہ ہے اب بھی لانا تو ذرا کوئی، کہاں ہے دنیا

زہاد کی تسبیح ریا چھوٹ پڑی آنکھوں سے امیدوں کی کرن پھوٹ پڑی
گھونگھٹ سے جو مسکرا کے جھانکا اس نے آکاش سے شرما کے دھنک ٹوٹ پڑی

سوچتے ہیں سر منزل، یہ معمّا کیا ہے! جس سے گزرے تھے، اسی راہگذر تک پہنچے
جو لوگ یہاں کچھ کر نہ سکے، دیکھیں گے وہاں کیا کرتے ہیں
امروز پہ جن کا زور نہیں، اندیشۂ فردا کرتے ہیں
ناہید و قمر نے راتوں کے ماحول کو روشن کر تو دیا
وہ دیپ کسی سے جل نہ سکے جو دل میں اجالا کرتے ہیں

بادۂ عشق کو ہے ہمت شرط ہاتھ اگر کانپتا ہو، جام نہ لے
شوق کتنا فریب دنیا ہے مسکرا کر ہمارا نام نہ لے

یہ بھی بجا کہ درد نہ تر اکر سکے تلاش یہ بھی ہوا کہ ہم ترے در سے گزر گئے
بھٹکا سکیں نہ عقل کی منزل فریبیاں گمراہ بن کے راہگذر سے گزر گئے
نالے ہمارے عرش پہ پہنچے تو تھے، مگر بچ کر ذرا مقام اثر سے گزر گئے
رگ رگ میں ہے سرور محبت کا انبساط اب ہم حدود قلب و نظر سے گزر گئے
آنکھوں سے دل کا کام نہ لینا تھا اے کلیم! جلوے تڑپ کے دام نظر سے گزر گئے
ہر لمحہ بڑھ رہی ہیں مرے دل کی دھڑکنیں جیسے ابھی ابھی وہ ادھر سے گزر گئے

حریف جاں سہی وہ، لیکن اس کا کیا کرے کوئی کہ اس کی دشمنی بھی دوستی معلوم ہوتی ہے

ملتا ہے دل کو تیری گلی میں سکوں سا کیا اس زمیں پہ فلک نیلگوں نہیں!

اے عقل! ساتھ رہ کہ پڑیگا تجھی سے کام — راہِ طلب کی منزلِ آخر جنوں نہیں

مجھ کو نشاد! زعمِ نظر نے کیا خراب — جلوے تو ہر قدم پہ بکارے کہ یوں نہیں

ہمیں بدل گئے ہیں کچھ، کہ گلستاں بدل گیا — زمیں وہی، فلک وہی، مگر سماں بدل گیا

موجِ تخیل، گل کا تبسم، پرتوِ شبنم، بجلی کا سایہ

دھوکا ہے دھوکا عہدِ جوانی، اس کو جوانی کوئی نہ سمجھے

اُن کی بھی قسمت، میری بھی قسمت، دونوں میں لیکن کتنا تفاوت

ان کے اشارے دنیا سمجھ لے، میری کہانی کوئی نہ سمجھے

مانا یہ ہم نے دنیا ہے فانی، فانی سمجھنا ہے نادانی

جینے کی دل میں گر ہو تمنّا، دنیا کو فانی کوئی نہ سمجھے

دامن تو یہ رہا، مگر اے موسمِ بہار! — میں سوچتا یہ ہوں کہ مری آستیں بھی تھی

زندگی کی ہائے، وہ راتیں بھی کیا راتیں ہوئیں

ان سے جب چھپ چھپ کے کوٹھے پر ملاقاتیں ہوئیں

لگ گئی جب چپ، تو گھنٹوں بت بنے بیٹھے رہے

چھڑ گئیں باتیں، تو پھر دو دو پہر باتیں ہوئیں

یاد ہے اب تک وہ ملتھے کا پسینا، یاد ہے

اُن سے جب پہلے پہل میری ملاقاتیں ہوئیں

رہ گئے وہ اپنے دانتوں میں دوپٹا داب کر

آنکھوں آنکھوں میں، خدا معلوم، کیا باتیں ہوئیں

ایک بجلی آسماں پر، ایک بجلی گود میں

زندگی میں بارہا ایسی بھی برساتیں ہوئیں

اے نشاد! اب تک مرا ہر سانس ہے مہکا ہوا

مدتوں اس زلف کے سایے میں برساتیں ہوئیں

ہم کو بھی دیوانگی بھاتی نہیں، پر کیا کریں
ہاتھ اگر آجائیں خود اٹھ کر گریبانوں کے پاس

پھر دے گیا فریب تسلی کوئی مجھے
اب صبر آچکا مجھے، موت آچکی مجھے

تمیزِ شمعِ دیر و چراغِ حرم نہیں
پروانہ ہوں، کہیں بھی ملے روشنی مجھے

صبح بچھڑ کر شام کا وعدہ، شام کا ہونا سہل نہیں
ان کی تمنا پھر کرلینا، صبح کو پہلے شام کرو

موسم گل ہے، بادل چھائے، کھنک رہے ہیں پیمانے
کیسی توبہ! توبہ توبہ! توبہ نذرِ جام کرو

پوچھا کسی نے اے نثار! مقصدِ شاعری ہے کیا؟
میں نے کہا حضورِ دوست ایک طریقِ التماس

امجد (مجید امجد) عبدالمجید

۲۹ جون ۱۹۱۴ء کو پنجاب (پاکستان) کے شہر جھنگ مگھیانہ میں پیدا ہوئے۔ جب ان کے والد میاں علی محمد نے دوسری شادی کرلی، تو عبدالمجید کی والدہ اپنے کمسن بیٹے کو ساتھ لے کر میکے چلی گئیں۔ ان کے نانا میاں نور محمد فارسی عربی کے عالم تھے۔ انھیں کی نگرانی میں ان کی تعلیم شروع ہوئی۔ فارسی عربی کے علاوہ کچھ طب بھی پڑھی۔ اس کے بعد رسمی تعلیم شروع ہوئی۔ ۱۹۳۰ء میں مقامی اسلامیہ ہائی اسکول سے دسویں کی سند لی۔ پھر گورنمنٹ انٹر کالج، جھنگ میں داخلہ لیا، اور یہاں سے ۱۹۳۲ء میں انٹر کا امتحان پاس کرکے لاہور چلے آئے۔ ۱۹۳۴ء میں اسلامیہ کالج، لاہور سے بی اے میں کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔
کسب روزگار کا مسئلہ پیش آیا، تو سب سے پہلے ایک قانونگو صاحب کی زیرنگرانی رائے دہندگان کی فہرستیں بنانے کا کام ملا، جو ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کی رو سے انتخاب کے لیے تیار ہو رہی تھیں۔ یہ کام عارضی تھا، اور چند مہینوں میں مکمّل ہوگیا۔ اس کے بعد وہ ایمپائر آف انڈیا انشورنس کمپنی کے ایجنٹ بن گئے۔ لیکن اس کام کے لیے جس محنت مشقت کی ضرورت ہے، وہ ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس میں متواتر سفر ناگزیر تھا۔ صبح کہیں، شام کہیں۔ غرض سال بھر کے اندر اندر وہ اس پیشے سے دست بردار ہوگئے۔
لکھنے پڑھنے کی عادت شروع سے تھی، اور جھنگ کے ادبی حلقوں میں بھی وہ غیر معروف نہیں تھے۔ اسی زمانے میں وہاں ایک نیم سرکاری رسالہ "عروج" جاری ہوا۔ اصحاب مجاز

کی نظر امجد صاحب پر پڑی اور وہ اس کے مدیر مقرر ہو گئے۔ یہاں تقریباً دس برس، ۱۹۴۵ء تک رہے۔ یہ دوسری جنگِ عظیم کا زمانہ تھا۔ حکومت وقت کسی تحریر پر "عروج" سے ناراض ہو گئی؛ نزلہ روایتی عضوِ ضعیف پر گرا، اور مجید امجد کو نوکری سے جواب مل گیا۔

صحافت کے اس تلخ تجربے کے بعد وہ ڈسٹرکٹ بورڈ جھنگ میں بطور کلرک ملازم ہو گئے۔ یہ تعلق چار برس تک رہا۔ ۱۹۴۹ء میں پاکستان کے محکمۂ خوراک (فوڈ ڈپارٹمنٹ) میں جگہ مل گئی۔ وہ ملازمت کے اختتام تک اسی محکمے سے وابستہ رہے؛ اور ۱۹۷۲ء میں اسسٹنٹ فوڈ کنٹرولر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔

ان کی زندگی کے آخری ۲۷-۲۸ سال ساہیوال (سابقاً منٹگمری) میں بسر ہوئے۔ ملازمت کے اختتام کے بعد بھی انھوں نے یہاں کی سکونت ترک نہیں کی۔ ان کے والد کی دوسری شادی سے خاندان کا شیرازہ تو بکھرا ہی تھا، مجید امجد کی زندگی شفقتِ پدری کے فقدان کے باعث محرومی اور تلخی کا نمونہ بن گئی۔ بدقسمتی سے ان کی اپنی ازدواجی زندگی بھی بالکل ناکام رہی۔ ان کی شادی اپنے ماموں کی بیٹی سے ہوئی تھی، لیکن نبھ نہ سکی، اور وہ (طلاق لیے بغیر) ان سے الگ رہنے لگیں۔ ان سے کوئی اولاد بھی نہیں تھی۔ وہ محکمۂ تعلیم میں ملازم تھیں اور کسی ہائی اسکول کی ہیڈ ماسٹری سے ریٹائر ہوئیں۔ آخری زمانے میں ان کی بینائی بالکل ضائع ہو گئی تھی۔

مجید امجد بالکل اکیلے رہتے تھے۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا اور بڑی تنگی ترشی سے گزر بسر ہوتی تھی۔ ایسے جانگسل حالات میں بھی انھوں نے اپنی خودداری کی حفاظت کی، اور کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کیا۔ جو روکھی سوکھی میسّر آ گئی، صبر شکر سے اسی پر گزارا کیا۔ آخر ان کے بعض دوستوں کے توجّہ دلانے پر حکومتِ پاکستان نے مارچ ۱۹۷۴ء میں ان کا پانچ سو روپے ماہانہ ادبی وظیفہ مقرر کر دیا، لیکن اب سفینہ کنارے آ لگا تھا۔ دو مہینے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ یہ حادثہ بھی بڑے المناک حالات میں ہوا۔

ان کے ساتھ ان کی ملازمت کے زمانے کا ایک پرانا چپراسی (علی محمد) رہتا تھا۔ وہ بازار سے سودا سلف لے آتا اور وقت بیوقت ان کا چھوٹا موٹا کام بھی کر دیتا۔ صبح جب وہ اپنے کام پر جاتا، تو مجید امجد کی ہدایت کے مطابق باہر سے "تالا" ڈال دیتا اور واپسی پر اسے کھول دیتا۔ ۱۱ مئی ۱۹۷۴ء کو بھی یہی ہوا۔ ۹ بجے صبح تالا بند کر کے وہ چلا گیا۔ لیکن جب دو بجے واپس آیا، تو اسے ان کی جگہ امجد کی لاش زمین پر پڑی ملی۔ لاش جھنگ گئی اور اگلے دن (۱۲ مئی) وہیں سپردِ خاک ہوئی۔

زمانے کی ستم ظریفی دیکھیے کہ زندگی میں تو کسی نے یہ تک نہ پوچھا کہ کہو بھئی، کیسے بسر ہو رہی ہے؟ مرنے کے بعد ساہیوال کے مشہور باغ "کنعان پارک" اور "ساہیوال ہال" کا نام بدل کر علی الترتیب "امجد پارک" اور "امجد ہال" رکھ دیا گیا۔ ہائے، اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا۔ کسریٰ منہاس نے قطعہ "تاریخ وفات کہا:

موت برحق ہے، مگر اک جوہر قابل کی موت
وائے برمحفل، جدا ہم سے مجید امجد ہوئے

کیسے کیسے دوست، کسریٰ چل دیے منہ پھیر کر
دوستی کے جتنے دعوے تھے، وہ سارے رد ہوئے

چھن لیا دستِ قضا نے ہر گل شاداب کو
زندگی پر، اے فلک تیرے کرم بیحد ہوئے

عجز و ایثار و خلوص و بے ریائی کے قصور
ایک شخص ایسا تھا، جس سے عمر بھر نزد ہوئے

نغمہ جس کا ہر نفس، ہر بات تھی سحر حلال
وہ نشانِ زندگی بھی زینتِ مرقد ہوئے

ایک روشن طبع تھا جس کی بدولت کتنے دوست
محفلِ شعر و ادب میں زینتِ مسند ہوئے

جس کے فن میں وقت کی لے، دل کی دھڑکن بنگئی
اس کے گیتوں میں ڈھلے، جتنے بھی جزر و مد ہوئے

بیسوی میں فرد نکلا مصرعِ سالِ وفات
"داخلِ باغِ جناں عبدالمجید امجد ہوئے"

(۱۹۷۴ء)

وہ بہت کم عمری میں شعر کہنے لگے تھے۔ لیکن حالات کی مجبوری نے اشاعت سے محروم رکھا۔ ایک مختصر انتخاب "شبِ رفتہ" کے عنوان سے ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا تھا۔ بقیہ کلام کا مبسوط مجموعہ ان کی موت کے بعد ۱۹۷۶ء، ۱۹۷۷ء میں منظرِ عام پر آیا۔

اگرچہ انھوں نے غزلیں بھی کہیں، لیکن در اصل وہ نظم کے شاعر ہیں۔ ان کا کلام بہت تہ دار ہے۔ حزن وملال کی زیریں لہر تو ہونا ہی چاہیے کہ خود ان کی اپنی زندگی کہاں کی آرام و آسایش اور مسرت و سرور کی زندگی تھی! لیکن جس انداز سے وہ زندگی اور اس کے مسائل کو دیکھتے ہیں، وہ سراسر ان کا اپنا ہے۔ انھوں نے زبان اور اسلوب میں بھی کئی تجربے کیے۔ افسوس کہ زندگی میں انھیں وہ مقام نہ ملا، جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے۔ اب نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

حسین

وہ شامِ صبح دو عالم تھی، جب بسر حدِ شام
رُکا تھا آ کے ترا قافلہ، ترے خیام
متاعِ کون و مکاں تجھ شہید کا سجدہ
زمینِ کرب و بلا کے نمازیوں کے امام!
یہ نکتہ تو نے بتایا، جہان والوں کو
کہ ہے فرات کے ساحل سے سلسبیل اک گام
سوارِ مرکبِ دوشِ رسولؐ، نورِ بتولؓ
چراغِ محفلِ ایماں، ترا مقدس نام

زینب

وہ قتل گاہ، وہ لاشے، وہ بیکسوں کے خیام
وہ شب، وہ سینۂ کونین میں غموں کے خیام
وہ رات جب تری آنکھوں کے سامنے لرزے
مرے ہوؤں کی صفوں میں ڈرے ہوؤں کے خیام
یہ کون جان سکے، بترے دل پہ کیا گزری
لٹے جب آگ کی آندھی میں غمزدوں کے خیام
ستم کی رات کی کالی قنات کے پیچھے
بڑے ہی خیمۂ دل میں تھے عشرتوں کے خیام
تری ہی برقِ صدا کی کڑک سے کانپ گئے
یہ زیرِ چترِ مطلا، شہنشہوں کے خیام
جہاں پہ سایہ کناں ہے ترے شرف کی ردا
اکھڑ چکے ہیں ترے خیمہ افگنوں کے خیام

کیا کہیے، کیا حجاب حیا کا فسانہ تھا
سب کچھ بس اک نگاہِ کرم کا بہانہ تھا

یہ کون ادھر سے گزرا، میں سمجھا حضور تھے
اک موڑ اور مُڑ کے جو دیکھا، زمانہ تھا

اک چہرہ، اس پہ لاکھ سخن تاب رنگتیں
اے جرأتِ نگہ! تری قسمت میں کیا نہ تھا

اے غم! انیسِ دل! یہ تری دل نوازیاں
ہم کو تری خوشی کے لیے مسکرانا تھا

ہائے، وہ دھڑکنوں سے بھری ساعتیں، مجیدؔ!
میں ان کو دیکھتا تھا، کوئی دیکھتا نہ تھا

اس جلتی دھوپ میں یہ گھنے سایہ دار پیڑ
میں اپنی زندگی انھیں دے دوں، جو بن پڑے

امجدؔ! طریقِ مے میں ہے یہ احتیاط شرط
اک داغ بھی کہیں نہ سرِ پیرہن پڑے

بہار

ہر بار اسی طرح سے دنیا
سونے کی ڈلی سے ڈھالتی ہے
سرسوں کی کلی کی زرد موت
تھاما ہے جسے خنک ہوا نے

ہر بار، اسی طرح سے شاخیں
کھلتی ہوئیں کونپلیں اٹھائے
رستوں کے سلاخچوں سے لگ کر
کیا سوچتی ہیں، یہ کون جانے!

ہر بار، اسی طرح سے بوندیں
پھولوں بھری بدلیوں سے چھن کر
آتی ہیں مسافتوں پہ پھیلے
تانبے کے ورق کو ٹھن ٹھنانے

ہر سال، اسی طرح کا موسم
ہر بار، یہی مہکتی دوری
ہر صبح، یہی کٹھور آنسو
رونے کے کب آئینگے زمانے!

توسیعِ شہر

بیس برس سے کھڑے جو اس گاتی نہر کے دوار
جھومتے کھیتوں کی سرحد پر بانکے پہریدار
گھنے، سہانے، چھاؤں چھڑکتے، بُور لدے چھتنار
بیس ہزار میں بِک گئے سارے ہرے بھرے اشجار

جن کی سانس کا ہر جھونکا تھا ایک عجیب طلسم
قاتل تیشے چیر گئے ان ساونتوں کے جسم

گری دھڑام سے گھائل پیڑوں کی نیلی دیوار
کٹتے ہیکل، جھڑتے پنجر، چھڑتے برگ و بار
سہمی دھوپ کے زرد کفن میں لاشوں کے انبار
آج کھڑا میں سوچتا ہوں اس گاتی نہر کے دوار

اس مقتل میں صرف اک میری سوچ لہکتی ڈال
اس پر بھی اب کاری ضرب اک، اے آدم کی آل

اب یہ مسافت کیسے طے ہو، اے دل تو ہی بتا کتنی عمر اور گھٹتے فاصلے، پھر بھی وہی صحرا
جیت آیا، جیتا ونی بھیجی، اپنا وچن نبھا پَت جھڑ آئی، پتّر کھڑکے، آ جیون بیت چلا

خوشیوں کا مکھ چوم کے دیکھا، دنیا مان بھری — دکھ وہ سجن کٹھور کہ جس کو روح کرے سجدا
اپنا پیکر، اپنا سایہ، کاٹے کوس کٹھن — دوری کی جب شکتی ٹوٹی، کوئی قریب نہ تھا
اپنے گرد، اب اپنے آپ میں گھلتی سوچ بھلی — کس کے دوست اور کیسے دشمن، سب کو دیکھ لیا
کانچ کی اک دیوار زمانہ، آمنے سامنے ہم — نظروں سے نظروں کا بندھن، جسم سے جسم جدا
راہیں دھوپ کہیں، شاخیں کہیں، اک اک منزل — کتنی تیز چلی ہے اب کے دھول بھری دکھنا
دکھڑے کتنے لاکھوں ٹکڑے، کس کس کی سنیے — بولی تو اک اک کی دیسی، بانی سب کی جدا

جنونِ عشق کی رسمِ عجیب، کیا کہنا! — میں ان سے دور، وہ مجھ سے قریب، کیا کہنا

آخر کوئی کنارا، اس سیلِ بیکراں کا — آخر کوئی مداوا، اس دردِ زندگی کا!
شاید ادھر سے گزرے پھر بھی ترا سفینہ — بیٹھا ہوا ہوں ساحل پر تنے بلب کبھی کا

یہ کیا عجیب راز ہے، سمجھ سکوں تو بات ہے — نہ اب وہ ان کی بیرخی، نہ اب وہ التفات ہے
مری تباہیوں کا بھی فسانہ کیا فسانہ ہے! — نہ بجلیوں کا تذکرہ، نہ آشیاں کی بات ہے
چراغ بجھ چکے، پتنگے جل چکے، سحر ہوئی — مگر ابھی مری جدائیوں کی رات، رات ہے

دل سے، ہر گزری بات گزری ہے — کس قیامت کی رات گزری ہے
چاندنی، نیم وا دریچہ، سکوت — آنکھوں آنکھوں میں رات گزری ہے

ریاض انصاری، ریاض الدین، قاضی

ان کا آبائی وطن ضلع بلند شہر (یوپی) کا قصبہ جیور تھا۔ انیسویں صدی میں اس علاقے میں نیل کی کاشت بڑے وسیع پیمانے پر ہوتی تھی، اور یہ بہت نفع مند کاروبار تھا۔ وہاں کے قاضی رفیع الدین صاحب بھی نیل کی آٹھ کوٹھیوں کے مالک اور اپنے علاقے کے متمول زمیندار اور رئیس تھے۔ لیکن یورپ سے مصنوعی نیل کی درآمد شروع ہوئی تو اس دیسی تجارت کو بھی گھن لگنا شروع ہو گیا۔ کساد بازاری کے باعث رفتہ رفتہ ان کی حالت خراب ہونے لگی۔ چنانچہ جب ان کے بیٹے قاضی حسام الدین ان کے وارث ہوئے تو خاندان کی شان و شوکت میں بہت کمی آچکی تھی۔ لیکن وہ منھ میں روایتی چاندی کا چمچہ لیے پیدا ہوئے تھے، اس لیے ان کے لیے بدلے حالات سے سمجھوتا کرنا ممکن نہ ہو سکا۔ رہی سہی کسر شاعری نے پوری کر دی؛ آزاد تخلص کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حسام الدین کا سارا وقت یار باشی میں گزرتا اور ان کی اولاد نے خاندانی عظمت کے افسانوں کے سوائے اور کچھ نہ پایا۔

قاضی ریاض الدین انھیں قاضی حسام الدین کے دوسرے بیٹے تھے۔ ۱۸۹۷ء میں جیور میں پیدا ہوئے۔ عربی اور فارسی کا ابتدائی نصاب وطن میں نجی طور پر پورا کیا۔ گھر کا جو رنگ تھا، اس میں ان کی مزید تعلیم کی طرف کسی کو توجہ نہیں تھی۔ خوش قسمتی سے ان کے بڑے بھائی قاضی عزیز الدین رخشاں جو پہلے سے نقلِ مکان کر کے اپنے ماموں کے پاس گوالیار چلے گئے تھے، جیور آئے اور چھوٹے بھائی کو اپنے

ساتھ بلوالیے گئے۔ اس وقت ان کی عمر ۱۳-۱۴ برس کی ہوگی۔
گوالیار میں انھوں نے ۱۹۱۶ء میں دسویں کی اور ۱۹۱۸ء میں انٹر کی سند حاصل کی۔
پہلی عالمی جنگ کے اختتام کے بعد ۱۹۱۸ء میں اس ملک میں انفلوئنزا وبائی شکل میں پھیل گیا تھا۔ بلا مبالغہ لاکھوں جانیں اس مرض کا شکار ہوگئی تھیں۔ اسی میں واصفی عزیزالدین رخشاں بھی خدا کو پیارے ہو گئے۔ والد کا انتقال اس سے تین چار سال قبل ہوچکا تھا؛ اب بڑے بھائی کی دائمی مفارقت کے بعد وہ بالکل بے یار و مددگار رہ گئے۔ اس لیے آگے تعلیم کا سلسلہ جاری رکھنے کا کیا امکان تھا، بلکہ مرحوم بھائی کے اہل و عیال کی دیکھ بھال کی ذمہ داری بھی ان کے ناتوان کندھوں پر آپڑی، جس نے انھیں ملازمت تلاش کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس پر انھوں نے مقامی گورکھی ہائی اسکول میں اردو فارسی پڑھانے کی ملازمت اختیار کر لی۔ تین چار برس کے علاوہ ان کا سارا زمانہ ملازمت اسی اسکول میں گزرا۔ وہ ۱۹۵۴ء میں سبکدوش ہوئے۔
تعلیم کا سلسلہ انھوں نے حالات کی مجبوری سے منقطع کیا تھا، نہ کہ اپنی خوشی سے۔ جب حالات موافق ہوئے تو انھوں نے اس کمی کے پورا کرنے کی ازسرنو کوشش کی۔ ۱۹۳۰ء میں بلا تنخواہ رخصت لی اور چار سال علی گڑھ یونیورسٹی میں رہ کر بی اے، بی ٹی کر ایم اے (اردو، فارسی) اور بی ٹی ٹی کے امتحان پاس کیے۔
۱۷ برس کی عمر تھی، جب انھوں نے ۱۹۱۴ء میں شعر گوئی شروع کی۔ ان کا پہلا شعر تھا:

بوجھ تم سے جب سنبھل سکتا نہیں تلوار کا
کیا کروگے خون تم دس بیس کا، دو چار کا!

یہی زبان کی طرف رجحان ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ اسی نے انھیں نوح ناروی (ف: اکتوبر ۱۹۶۲ء) کا تلمذ اختیار کرنے پر آمادہ کیا۔ ۶۰ برس کی مشق میں بہت کچھ کہا، لیکن کوئی مجموعۂ کلام شائع نہیں ہوا۔
اردو کے عاشق تھے۔ بزم اردو، گوالیار گویا انھیں کے دم سے زندہ تھی؛ ۱۹۱۹ء

سے ۱۹۷۲ء تک اس کے سکتر رہے۔ اس بزم کے اہتمام میں جو شاندار کل ہند مشاعرے ہوتے، وہ ہمیشہ یادگار رہینگے۔ ان کا انتظام مرحوم خود ہی کیا کرتے تھے۔ ان کی اردو دوستی کا ایک اور واقعہ قابلِ ذکر ہے۔ ان کی طویل اور کامیاب تدریسی کے اعتراف میں ۱۹۴۴ء میں ریاست نے انھیں انسپکٹر مدارس کی اسامی پیش کی مرحوم نے یہ پیشکش قبول کرنے سے اس لیے معذرت کر دی کہ ان کے چلے جانے سے گورکھی اسکول میں اردو پڑھانے کا کوئی انتظام باقی نہیں رہیگا، اور ممکن ہے کہ اس پر یہ درجہ ہی بند کر دیا جائے۔

ان کی بیوی کا جو ان کے اپنے خاندان ہی کی تھیں، ۱۹۷۱ء میں انتقال ہو گیا۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے اولاد سے نہیں نوازا تھا، لیکن میاں بیوی میں مثالی محبت تھی۔ اس کی دائمی جدائی کے بعد بجھ کے رہ گئے۔ مختلف امراض نے آگھیرا۔ دل کا پہلا دورہ ۱۹۷۲ء میں پڑا، اس سے تو بچ نکلے؛ مگر نا بکے؛ ۲۸ جون ۱۹۷۴ء کو اچانک فالج کا حملہ ہوا، اور بایاں حصہ بیکار ہو گیا۔ فشارِ دم کا عارضہ پہلے سے تھا، دماغ کی نس پھٹ گئی۔ بارہ دن تک مقامی جے آر دگیہ اسپتال میں بیہوش رہنے کے بعد ۹ جولائی ۱۹۷۴ء علی الصباح تین بجے جان بحق ہو گئے۔ اسی دن ظہر کے وقت کرنیل حسن خان والے قبرستان، کمپو لشکر گوالیار میں اپنی مرحومہ بیوی کے قریب دفن ہوئے۔

فیاض احمد خان فیاض گوالیاری کے قطعے میں تاریخ کا شعر ہے:

کہا ہاتف نے سینہ چاک کر کے
ریاضِ خلد ہے جاگیر[1] ان کی

(۱۹۷۵ - ۱ = ۱۹۷۴ء)

ان کا کوئی مجموعہ ان کی زندگی میں شائع نہیں ہوا۔ یہ چند شعر مختلف رسالوں میں مطبوعہ غزلوں سے انتخاب کر کے دے رہا ہوں۔ زبان کی شاعری ان کا طرۂ امتیاز ہے:

انھیں دیکھے زمانہ ہو گیا ہے ۔ یہ قصہ اب فسانہ ہو گیا ہے
محبت نے ہماری جان لے لی ۔ قضا کا تو بہانہ ہو گیا ہے

ہجومِ غم نے یوں احساس کو میرے مٹا ڈالا
مصیبت بھی مصیبت اب نہیں معلوم ہوتی ہے

کہا نہ تھا کہ محبّت کا ہے بُرا انجام ۔ بس اب تو اے دلِ خانہ خراب! دیکھ لیا

نہ وہ ہیں، نہ دل ہے، نہ قسمت، نہ دنیا ۔ محبّت میں کوئی ہمارا نہیں ہے
خدائی بھی ان کی، زمانہ بھی ان کا ۔ نہیں ہے تو کوئی ہمارا نہیں ہے
وہ ہُوں نامرادِ تمنا جہاں میں ۔ جسے موت کا بھی سہارا نہیں ہے

کہاں کی دوستی کس کی محبّت، کیسی غمخواری
یہ اندازِ خلوصِ دردمنداں دیکھنے کیا ہو!
نہ کیوں دیکھو خلوصِ باہم اربابِ میخانہ
یہ فرسودہ نزاعِ کفر و ایماں دیکھنے کیا ہو!

حیاتِ غمگیں کی تلخیوں کو اسی طرح خوشگوار کر لوں
خوشی نہیں سازگار مجھ کو، تو غم ہی کو سازگار کر لوں
ارادۂ ترکِ عشق و الفت تو، ہمنشیں! میں ہزار کر لوں
جو یہ مرے اختیار میں ہو، تو میں اسے اختیار کر لوں

آج یہ گھر سے مرے کون ہوا ہے رخصت! ۔ کیوں فسردہ در و دیوار نظر آتے ہیں
تیری جنّت میں، نہ واعظ ہیں، نہ زاہد یارب! ۔ یہ تو دنیا کے گنہگار نظر آتے ہیں

کسی کا سنگِ در ہے، اور میں ہوں ۔ یہ میرا در دِسر ہے، اور میں ہوں
محبّت دیکھ لی، اہلِ وطن کی ۔ ریاض! اب اپنا گھر ہے، اور میں ہوں

یہ دو جملوں میں ہے رودادِ غم بیمارِ الفت کی
جو دن ہے وہ مصیبت کا، جو شب ہے، وہ قیامت کی

بجا ہے تونے جو، اے ناصحِ مشفق! نصیحت کی
مگر جب چین بھی دے بیکلی، دردِ محبت کی
کوئی کمبخت ہی اب رکھ سکیگا دل کو قابو میں
جوانی، وہ بھی ان کی! اور وہ بھی اس قیامت کی!

ریاض! اس کا چھپانا محال ہے کہ یہ عشق نہ راز بن کے رہیگا، نہ راز ہو کے رہا

دنیا ہے الگ اوروں کی، مرے فن کا جہاں اور
رنگ اور، روش اور، بیاں اور، زباں اور
بے اُن کے، نہ رُت وہ، نہ سماں وہ، نہ فضا وہ
وہ تھے تو فضا اور تھی، رُت اور، سماں اور
اقرار میں انکار ہے، انکار میں اقرار
ان شوخ حسینوں کی نہیں اور ہے، ہاں اور

دید ان کی سہل ہی سہی ممکن مگر کہاں!
ذوقِ نظر بھی ہو، تو مجالِ نظر کہاں!
ہر چیز میں ہے پَرتوِ حسن و جمالِ دوست
لیکن ہر اک نگاہِ حقیقت نگر کہاں!
جا تو رہا ہوں جوشِ جنوں میں کہیں، مگر
لے جا رہا ہے جوشِ جنوں، کیا خبر، کہاں!
محوِ طلب کو جوشِ طلب میں کہاں یہ ہوش
منزل کہاں ہے، راہ کدھر، راہبر کہاں!

یہی دنیا، یہی دنیا کے عیشِ بیکراں ہونگے
یہ سب ہوگا مگر اے عمرِ فانی! ہم کہاں ہونگے!
اب آئے ہو تو بیٹھو بھی ذرا، کل کی خبر کیا ہے
نہ جانے تم کہاں ہونگے؛ نہ جانے، ہم کہاں ہونگے

غمِ ہستی، غمِ الفت، غمِ دوراں ہو کر
غم بہ ہر رنگ رہا، زیست کا عنواں ہو کر
کر لیا ضبط غمِ عشق بھی بالفرض، ریاض!
رہ سکو گے غمِ دوراں سے گریزاں ہو کر؟

غمِ دل کا نگہبان ہوا جاتا ہے
ہر ذرّت کا مہمان ہوا جاتا ہے
اس دور کی کشمکش الٰہی! توبہ
انسان، پریشان ہوا جاتا ہے

کوئی ہمدم نہ رہا، کوئی یگانہ نہ رہا
کوئی مسکن نہ رہا، کوئی ٹھکانہ نہ رہا
دن وہی، رات وہی، صبح وہی، شام وہی
ہم وہی ہیں، مگر اپنا وہ زمانہ نہ رہا

نہ امنگیں، نہ ترنگیں، نہ مسرت، نہ امید
یہی جینا ہے، تو اس جینے میں کیا رکھا ہے!
یہی کہتا ہے، ہر اک دیکھ کے صورت میری
تو نے کمبخت! یہ کیا حال بنا رکھا ہے!

محمد حسین حسان

ان کا خاندان دراصل سہسوان کا رہنے والا تھا، لیکن خود ان کی پیدائش ۱۹۰۷ء میں پیلی بھیت میں ہوئی۔ والدین کا بچپن ہیں انتقال ہو گیا تھا۔ والد کا نام محمد نبی جان تھا۔ اردو فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ پھر مدرسۂ اسلامیہ بریلی میں عربی پڑھی اور اس کی تکمیل دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں کی۔ ۱۹۲۷ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ، دلی میں چلے آئے۔ اسی زمانے ہیں انگریزی کی طرف توجہ کی۔ لیکن ۱۹۳۰-۱۹۳۱ء میں کانگریس کی نمک سازی کی تحریک میں شرکت کے باعث جلد ہی یہ سلسلہ منقطع ہو گیا، اور پھر اس طرف توجہ نہ کر سکے۔ بہرحال اتنی قابلیت پیدا کر لی تھی کہ انگریزی کتابوں سے بآسانی استفادہ کر سکتے تھے۔

اسی زمانے ہیں دلی کانگریس نے اُردو، ہندی، انگریزی تینوں زبانوں میں خبرنامے شائع کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ اردو کے نگران اور ذمہ دار شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم (ف: اپریل ۱۹۵۳ء) تھے اور انگریزی کے رگھونندن سرن، بی اے (کینٹب) (ف: دسمبر ۱۹۵۳ء)۔ قدوائی مرحوم نے اردو خبرنامے کی ترتیب و تدوین میں محمد حسین حسان کو اپنا معاون مقرر کیا۔ یہ خبرنامہ کوئی سال بھر شائع ہوتا رہا تھا۔ جب قدوائی صاحب گرفتار ہوئے، اور قید خانے بھیج دیے گئے، تو چند دے بعد خود حسین حسان صاحب بھی گرفتار کر لیے گئے۔ حوالات کے زمانے ہیں پولیس نے ان پر بے پناہ مظالم توڑے۔ مطالبہ یہ تھا کہ بتاؤ، یہ خبرنامے کس چھاپے خانے

میں چھپتے ہیں؟ (یہ ایک الگ دلچسپ داستان ہے کہ رگھونندن سرن صاحب ان کی طباعت کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلتے تھے۔ کیونکہ کوئی مطبع ان کے چھاپنے کا خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھا)۔ حسّان صاحب نے سب سختیاں برداشت کیں لیکن منھ سے ایک لفظ نہیں بولے۔ بالآخر قید کی سزا ہوئی۔

قید سے رہائی کے بعد وہ مکتبۂ جامعہ میں ادبی معاون مقرر ہوتے اور بعد کو "پیامِ تعلیم" کی ترتیب ان کے سپرد کر دی گئی۔ "پیامِ تعلیم" شروع میں بچوں کا رسالہ نہیں تھا۔ اسے مسیح الملک حکیم اجمل خان (ف: دسمبر ۱۹۲۷ء) اور عبدالمجید خواجہ بیرسٹر (ف: دسمبر ۱۹۶۲ء) کے ایما پر ذاکر صاحب مرحوم (ف: مئی ۱۹۶۹ء) اور ڈاکٹر سیّد عابد حسین مدظلہٗ نے ۱۹۲۶ء میں جاری کیا تھا۔ ڈاکٹر سیّد عابد حسین ہی اس کے اڈیٹر مقرر ہوتے تھے۔ اس کا مقصد عوام کو جامعۂ ملّیہ کے کاموں سے باخبر رکھنا اور انھیں نئے نئے تعلیمی مسائل اور تجربات سے مانوس کرنا اور ان کی طرف ترغیب دلانا تھا۔

جب محمد حسین حسّان مدیرِ معاون ہو کر آتے، تو انھوں نے بہت خاموشی سے اسے آہستہ آہستہ بچوں کا پرچہ بنا دیا۔ اس زمانے میں خالص بچوں کے لیے اچھے معیار کا قابلِ مطالعہ مواد بہت کم تھا۔ ذاکر صاحب مرحوم کو بچوں کی تربیت سے جو دلچسپی تھی، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ حامد علی خان (ف: ۱۹۶۳ء) مکتبۂ جامعہ کے منیجر تھے۔ ان کی تجارتی سوجھ بوجھ بلا کی تھی۔ انھوں نے اس خوشگوار تبدیلی کو مالی مفاد کے پہلو سے جانچا۔ غرض دونوں نے محمد حسین حسّان صاحب کے کام کی تحسین کی؛ اور پیامِ تعلیم نے بہت جلد اس صنف کے صفِ اوّل کے پرچوں میں اپنی جگہ بنا لی۔ حیدرآباد اور کشمیر کے محکمۂ تعلیم میں یہ منظور شدہ فہرست میں شامل ہو گیا، اور ان دونوں ریاستوں کے مدارس کے لیے اس کی سرکاری خریداری منظور ہو گئی۔ [illegible] سے اس کی اشاعت کہیں سے کہیں پہنچ گئی؛ اسی کی حامد علی خان مرحوم کو توقع تھی۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس دور میں اس

کے مضمون نگاروں میں خود ذاکر صاحب کے علاوہ، پروفیسر محمد مجیب، پروفیسر رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر سید عابد حسین کے نام بھی ملتے ہیں۔ شفیع الدین نیرؔ کا بچوں کے شاعر کی حیثیت سے نام اسی زمانے میں چمکا۔ آج کے بعض مشہور لکھنے والوں نے مضمون نگاری کی ابتدا پیام تعلیم ہی سے کی تھی۔ اس کے سالناموں اور خاص نمبروں کا بھی اس دور میں بہت شہرہ تھا؛ بلکہ اس کی یہ خصوصیت تو آج تک قابلِ لحاظ ہے۔

محمد حسین حسّان صاحب نے لکھنا دارالعلوم ندوۃ العلماء کی طالب علمی کے زمانے میں شروع کیا، بلکہ شاید اس سے بھی کچھ پہلے۔ مدتوں ان کے مضامین النّاظر (لکھنؤ)، نقیب (بدایوں)، زمانہ (کانپور)، شمع (آگرہ) وغیرہ میں شائع ہوتے رہے۔ شروع میں زیادہ توجہ عربی مضامین کے تراجم پر رہی۔ ان کا ایک طویل مضمون "محمود غزنوی کی بزمِ ادب" بالاقساط جامعہ میں شائع ہوا تھا۔ لیکن ان کے اصلی جوہر پیام تعلیم کی ادارت کے زمانے میں کھلے۔ انھیں سہلِ ممتنع اور سلیس زبان اور روزمرّہ پر حیرتناک قدرت حاصل تھی۔ بچوں کی نفسیات؛ اور ان کی پسند اور ناپسند کا انھیں گہرا شعور تھا۔ اس لیے انھوں نے بچوں کے لیے معلوماتی مضامین اور کہانیاں لکھیں۔ یہ بہت مقبول ہوئیں۔ ان کی سب سے پہلی کتاب آنحضرت صلعم کی سوانحعمری "سرکارِ دو عالم" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ اس کی مقبولیت کا کچھ اندازہ اس سے لگائیے کہ اب تک اس کے ۱۸-۱۹ ایڈیشن چھپ چکے ہیں؛ یہ کسی زمانے میں ریاست میسور کے مدارس کے نصاب میں شامل تھی۔ ان کی دوسری کتاب "دنیا کے بچے" کا بھی یہی حال ہے؛ اس کے بھی ۱۵-۱۶ ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ ایک اور کتاب "نامورانِ اسلام" تھی؛ اس پر انھوں نے بہت محنت کی تھی اور اس کا مواد بڑی تحقیق سے فراہم کیا تھا۔ چھپنے سے پہلے مسوّدہ ڈاکٹر ذاکر صاحب مرحوم اور علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم (ف: نومبر ۱۹۵۳ء) کو دکھا لیا تھا تاکہ اس میں کوئی قابلِ اعتراض بات نہ رہ جائے۔

یہ تقسیم سے کچھ قبل (غالباً ۱۹۴۵ء) میں پہلی بار شائع ہوئی تھی۔ میرے علم میں تقسیم کے بعد اس کا کوئی ایڈیشن شائع نہیں ہوا۔ وہ اس پر نظر ثانی کر رہے تھے۔ اس کا مسودہ یقیناً محفوظ ہوگا۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ اسے دوبارہ شائع کیا جائے۔ یاد آیا، ان کی ایک اور مفید اور معلوماتی کتاب "ہماری زمین" بھی تھی۔ اس میں مختلف ماخذ سے سائنسی کوائف جمع کر کے یکجا کر دیے ہیں، کہانی کے پیرایے میں؛ بڑے کام کی چیز ہے۔

تقسیمِ ملک کے ساتھ مکتبۂ جامعہ پر بھی ابتلا آئی۔ پیامِ تعلیم بند ہو گیا۔ جب جامعۂ ملّیہ کے دفاتر او کھلا آئے، تو انھوں نے کوشش کی کہ اسے دوبارہ جاری کیا جائے، لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ اسی زمانے میں جامعہ نے ایک ادارہ "تعلیم و ترقی" کے نام سے قائم کیا تھا۔ اس کا مقصد بالغوں کے لیے لٹریچر پیدا کرنا تھا۔ حسین حسّان صاحب اس ادارے سے وابستہ ہو گئے۔ اس جگہ انھوں نے جہاں دوسروں کے مسوّدوں پر نظر ثانی کی اور انھیں اشاعت کے لیے تیار کیا، وہیں خود بھی بہت کچھ لکھا۔ اس میں سے کچھ چھپ گیا، کچھ مسوّدوں کی شکل میں رہ گیا (اور اب تک غالباً دیمک کی نذر ہو چکا ہوگا) "الزام کس پر؟" "آستین کا سانپ"؛ "الٹی دوا"؛ "برف کا گھر"؛ "چاند"؛ "تاؤ کے ایڈیشن"؛ "زمانے کے سچائی بہن"؛ "رامو نے پڑھنا سیکھا"؛ "دیمک"؛ "کتنی زمین" وغیرہ یہ کتابیں اسی زمانے میں شائع ہوئیں۔

۱۹۶۳ء میں پیامِ تعلیم دوبارہ شائع ہونا شروع ہوا، تو ترتیب کے لیے قرعۂ فال پھر ان کے نام پڑا۔ وہ آخر تک اس کے مدیر رہے۔

صحت بہت دن سے سقیم چلی آ رہی تھی۔ دمے کا عارضہ تھا۔ بہت ہی نحیف و نزار ہو کے رہ گئے تھے۔ اگر کثیر العیالی اور بنجی مجبوریاں دامنگیر نہ ہوتیں، تو وہ کب کے ان جھمیلوں سے الگ ہو چکے ہوتے۔ لیکن ہندستان کے ادیب کی قسمت میں آرام صرف کنارِ لحد میں لکھا ہے۔ اسی حالت میں ۱۲ جولائی ۱۹۷۴ء

کو انھیں حبسِ بول کی تکلیف لاحق ہو گئی۔ اس پر وہ اسپتال میں داخل ہوئے۔
اگلے دن ۱۳ جولائی ۱۹۷۴ء (دہلی مول چند اسپتال میں) صبح ساڑھے چھ بجے
کے قریب حرکتِ قلب بند ہو جانے سے رحلت کی۔ اسی دن ظہر کے بعد جامعہ
ملیہ کے قبرستان میں سپردِ خاک ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔
میرا ذاتی تعلق ان سے ۱۹۳۶ء سے تھا۔ اور میں نے عربی کا پہلا سبق انھیں
سے پڑھا تھا۔ اس زمانے میں جامعہ ملیہ کے دوسرے عملے کے ساتھ وہ بھی
قرول باغ میں رہتے تھے۔ حسنِ اتفاق سے میں نے بھی کرایے کا مکان اسی
جگہ لے لیا۔ جب ان سے خاصا ربط ضبط پیدا ہو گیا تو ایک دن میں نے ان
سے عربی پڑھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ وہ بعد خندہ پیشانی سے اس پر تیار
ہو گئے۔ چنانچہ میں نے بمبئی سے ابتدائی نصاب کی کتابیں (القرأۃ الرشیدہ
کے چاروں حصے) منگوا لیے۔ ان میں سے پہلے دو یا تین میں نے ۱۹۳۷-۱۹۳۸ء
کے جاڑوں کے چار پانچ مہینوں میں سبقاً ان سے پڑھے تھے۔
پہلی بیوی سے ایک لڑکی یادگار تھی۔ دوسری بیگم سے چار بیٹے (حسیب،
شعیب، نجیب، شکیب) اور تین بیٹیاں (صفیہ، ریحانہ، فرزانہ) ان کے
سوگواروں میں ہیں۔
اب کہاں ملینگے، اس محبت اور ذوقِ علم کے لوگ۔ اللہ تعالیٰ انھیں کروٹ
کروٹ جنت نصیب کرے۔ آمین!

ساغر صدیقی، محمد اختر

ساغر صدیقی نے ایک مرتبہ کہا تھا: "میری ماں دلی کی تھی، باپ پٹیالے کا، پیدا امرتسر میں ہوا، زندگی لاہور میں گزری؛ میں بھی عجیب چوں چوں کا مربہ ہوں۔" اس قول میں صرف ایک معمولی سی غلطی کے سوا اور سب سچ ہے۔
دراصل ان کا خاندان انبالے کا تھا، اور وہ پیدا بھی انبالے میں ہوئے۔ سال ۱۹۲۸ء تھا۔ گھر میں ہر طرف افلاس و نکبت کا دور دورہ تھا۔ ایسے میں تعلیم کا کیا سوال! محلے میں ایک بزرگ حبیب حسن رہتے تھے، انھیں کے پاس جانے آنے لگے۔ جو کچھ پڑھا انھیں سے۔ اس کے بعد شاید ورنیکلر مڈل کے کچھ درجے بھی پاس کر لیے ہوں۔ ایک دن انھوں نے اس ماحول سے تنگ آ کر امرتسر کی راہ لی، اور یہاں ہال بازار میں ایک دوکاندار کے وہاں ملازم ہو گئے، جو لکڑی کی کنگھیاں بنا کر فروخت کرتا تھا۔ انھوں نے بھی یہ کام سیکھ لیا۔ دن بھر کنگھیاں بناتے اور رات کو اسی دوکان کے کسی گوشے میں پڑ رہتے۔ لیکن شعر وہ اسی ۱۴-۱۵ برس کی عمر ہی میں کہنے لگے تھے، اور اپنے بےتکلف دوستوں کی محفل میں سناتے بھی تھے۔ شروع میں تخلص ناصر حجازی تھا۔ لیکن جلد ہی اسے چھوڑ کر ساغر صدیقی ہو گئے۔
ساغر کی شہرت ۱۹۴۴ء میں ہوئی۔ اس سال امرتسر میں ایک اچھے بڑے پیمانے پر مشاعرہ قرار پایا۔ اس میں شرکت کے لیے لاہور کے بعض شاعر بھی مدعو تھے۔

ان میں سے ایک صاحب کو معلوم ہوا کہ یہ "لڑکا" (ساغر صدیقی) بھی شعر کہتا ہے۔ انھوں نے منتظمین سے کہہ کر اسے مشاعرہ میں پڑھنے کا موقع دلوا دیا۔ ساغر کی آواز میں بلا کا سوز تھا اور وہ ترنم سے پڑھنے میں جواب نہیں رکھتا تھا۔ بس پھر کیا تھا، اس شب اس نے صحیح معنوں میں مشاعرہ لوٹ لیا۔

قدرتاً اس کے بعد امرتسر اور لاہور کے مشاعروں میں اس کی مانگ بڑھ گئی۔ اب اس نے کنگھیاں بنانے کا کام چھوڑ دیا اور بعض سرپرست احباب کی مدد سے اپنا علم اور صلاحیت بڑھانے کی کوشش کی۔ مشاعروں میں شرکت کے باعث اتنی یافت ہو جاتی تھی کہ اسے اپنا پیٹ پالنے کے لیے مزید تگ و دَو کی ضرورت نہ رہی۔ گھر والے بیشک ناراض تھے کہ لڑکا آوارہ ہو گیا ہے اور کوئی کام نہیں کرتا، لیکن اُسے اُن کی کیا پرواہ تھی، اس نے گھر آنا جانا ہی چھوڑ دیا۔ کلام پر اصلاح کے لیے لطیف انور گورداسپوری مرحوم کا انتخاب کیا اور ان سے بہت فیض اٹھایا۔

۱۹۴۷ء میں پاکستان بنا، تو وہ امرتسر سے لاہور چلا گیا۔ یہاں دوستوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اُس کا کلام مختلف پرچوں میں چھپنے لگا۔ سینما فلم تیار کرنے والوں نے اس سے گیتوں کی فرمائش کی اور اس میں اسے حیرتناک کامیابی حاصل ہوئی۔ اس دور کی متعدد فلموں کے گیت ساغر کے لکھے ہوئے ہیں۔ اس زمانے میں اس کے سب سے بڑے سرپرست انور کمال پاشا (ابن حکیم احمد شجاع مرحوم) تھے، جو پاکستان میں فلمسازی کی صنعت کے بانیوں میں ہیں۔ انھوں نے اپنی بیشتر فلموں کے گانے ساغر سے لکھوائے اور یہ بہت مقبول ہوئے۔

۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۲ء تک ساغر کی زندگی کا زرّیں دور کہا جا سکتا ہے۔ وہ لاہور کے کئی روزانہ اور ہفتہ وار پرچوں سے منسلک ہو گیا، بلکہ بعض جریدے تو اسی کی ادارت میں شائع ہوتے رہے۔ لیکن اس کے بعد شامت اعمال سے

حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ وہ کہیں کا نہ رہا اور آخر میں صحیح معنوں میں مرقعِ عبرت بن گیا۔

1952ء کی بات ہے کہ وہ ایک ادبی ماہنامے کے دفتر میں بیٹھے تھے۔ انھوں نے سر درد اور اضمحلال کی شکایت کی۔ پاس ہی ایک اور شاعر دوست بھی بیٹھے تھے۔ انھوں نے تعلق خاطر کا اظہار کیا اور خاص ہمدردی سے انھیں مارفیا کا ٹیکہ لگا دیا۔ سر درد اور اضمحلال تو دور ہو گیا، لیکن اس معمولی واقعے نے ان کے جسم کے اندر نشہ بازی کے تناور درخت کا بیج بو دیا۔ بد قسمتی سے ایک اور واقعے نے اس رجحان کو تقویت دی۔

اس زمانے میں وہ انار کلی لاہور میں ایک دوست کے والد کے (جو پیشہ کے لحاظ سے ڈاکٹر تھے) مطب کی اوپر کی منزل میں رہتے تھے۔ اسی کمرے میں ان کے ساتھ ایک اور دوست بھی مقیم تھے (اب نام کیا لکھوں!) ان صاحب کو ہر طرح کے نشوں کی عادت تھی۔ ہونی کو کون ٹال سکتا ہے! ان کی صحبت میں ساغر بھی رفتہ رفتہ اوّلاً بھنگ اور شراب اور ان سے گزر کر افیون اور چرس کے عادی ہو گئے۔ اگر کوئی شخص راہِ راست سے بھٹک جائے اور توفیقِ ایزدی اس کی دستگیری نہ کرے، تو پھر اس کا تحت الثریٰ سے اِدھر کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا۔

یہی ساغر کے ساتھ ہوا۔ اور افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ خود ان کے دوستوں میں سے بیشتر نے ان کے ساتھ ظلم کیا۔ یہ لوگ انھیں چرس کی پڑیا اور مارفیا کے ٹیکے کی شیشیاں دیتے اور ان سے غزلیں اور گیت لے جاتے، اپنے نام سے پڑھتے اور چھپواتے اور بحیثیت شاعر اور گیت کار اپنی شہرت میں اضافہ کرتے۔ اس کے بعد اس نے رسائل و جرائد کے دفتر اور فلموں کے اسٹوڈیو میں جانا آنا چھوڑ دیا۔ اس میں بھی کوئی مبالغہ نہیں کہ ان اداروں کے کرتا دھرتا اس کے کام کی اجرت کے دس روپے بھی اس وقت تک ادا نہیں کرتے تھے، جب تک وہ ان کے درِ دولت کی چوکھٹ پر دس سجدے نہ کرے۔ اس نے ساغر کے مزاج کی تلخی

اور دنیا بیزاری اور ہر وقت "بیخود" رہنے کی خواہش میں اضافہ کیا۔ اور وہ بالکل آوارہ ہو گیا۔ نوبت بایں جارسید کہ کبھی وہ ننگ دھڑنگ ایک میلی کچیلی چادر اوڑھے، اور کبھی چیتھڑوں میں ملبوس، بال بکھرائے ننگے پاؤں — منہ میں بیڑی یا سگرٹ لیے سڑکوں پر پھرتا رہتا اور رات کو نشے میں دُھت، مدہوش کہیں کسی سڑک کے کنارے کسی دوکان کے تھڑے یا تخت کے اوپر یا نیچے پڑا رہتا۔

اب اس کی یہ عادت ہو گئی کہ کہیں کوئی اچھے وقتوں کا دوست مل جاتا، تو اس سے ایک چونی طلب کرتا۔ اس کی یہ چونی مانگنے کی عادت سب کو معلوم تھی چنانچہ بارہا ایسا ہوا کہ کسی دوست نے اسے سامنے سے آتے دیکھا اور فوراً جیب سے چونی نکال کر ہاتھ میں لے لی۔ پاس پہنچے، اور علیک سلیک کے بعد مصافحہ کرتے وقت، چونی ساغر کے ہاتھ میں چھوڑ دی۔ وہ باغ باغ ہو جاتا۔ یوں شام تک جو دس بیس روپے جمع ہو جاتے، وہ اس دن کے چرس اور مارفیا کے کام آتے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

جنوری ۱۹۷۴ء میں اس پر فالج کا حملہ ہوا۔ اس کا علاج بھی چرس اور مارفیا سے کیا گیا۔ فالج سے تو بہت حد تک نجات مل گئی، لیکن اس سے دایاں ہاتھ ہمیشہ کے لیے بیکار ہو گیا۔ پھر کچھ دن بعد منہ سے خون آنے لگا۔ اور یہ آخر تک دوسرے تیسرے جاری رہا۔ ان دنوں خوراک بالکل برائے نام تھی۔ جسم سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچا رہ گیا تھا۔ سب کو معلوم تھا کہ اب وہ دن دور نہیں جب وہ کسی سے چونی نہیں مانگیگا۔ چنانچہ ۱۹ جولائی ۱۹۷۴ء صبح کے وقت اس کی لاش سڑک کے کنارے ملی، اور دوستوں نے لے جا کر اسے میانی صاحب کے قبرستان میں دفن کر دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یزدانی جالندھری نے قطعۂ تاریخ وفات کہی:

ساغر نے رختِ زیست جہاں سے اٹھا لیا
افسردہ اس کے غم میں ہیں یارانِ انجمن
وہ شہر یارِ شعر، وہ درویشِ بے ریا
نظمیں تھیں جس کی مظہر معراجِ فکر و فن

نعتوں میں جس کی جذبۂ حبِّ رسول تھا | غزلوں میں جس کی حسن و جوانی کا بانکپن
یزدانیٔ حزیں نے لبِ جام رکھ کے ہاتھ | تاریخ رحلت اس کی کہی "ساغرِ سخن"

(۳) + ۱۹۷۱ - ۱۹۷۴ء)

اس نے غزل، نظم، قطعہ، رباعی ہر صنفِ سخن میں خاصا ذخیرہ چھوڑا ہے۔ وہ خود تو اسے کیا چھپواتا، ناشروں نے اپنے نفع کی خاطر اسے چھاپ لیا، اور اسے معاوضے میں ایک حبّہ تک نہ دیا۔ چھ مجموعے اس کی زندگی میں لاہور سے چھپے: غمِ بہار، زہر آرزو (۱۹۶۴ء)، لوحِ جنون (۱۹۷۱ء)، اور سبز گنبد اور شب آگہی (۱۹۷۲ء)۔ یقین ہے کہ اگر کوشش کی جائے، تو ایک اور مجموعے کا مواد بآسانی مہیّا ہو سکتا ہے۔ ساغر کا کلام بہت جاندار ہے اور زندہ رہنے کا مستحق۔

جی چاہتا ہے کہ یہاں اس کی زندگی کا ایک واقعہ قلمبند کر دوں، جس سے مشہور یونانی فلسفی دیو جانس کلبی کی روایت تازہ ہوتی ہے:

اکتوبر ۱۹۵۸ء میں پاکستان میں فوجی انقلاب ہوا۔ جرنیل محمد ایوب (ف: اپریل ۱۹۷۴ء) برسرِ اقتدار آگئے اور تمام سیاسی پارٹیاں اور سیاست دان، جن کی باہمی چپقلش اور رسّہ کشی سے عوام تنگ آچکے تھے، حرفِ غلط کی طرح فراموش کر دیے گئے۔ لوگ اس تبدیلی پر واقعی خوش تھے۔ ساغر نے اسی جذبے کا اظہار ایک نظم میں کیا ہے۔ اس میں ایک مصرع تھا:

کیا ہے صبر جو ہم نے، ہمیں ایوب ملا

یہ نظم جرنیل محمد ایوب کی نظر سے بھی گزری یا گزاری گئی۔ اس کے بعد جب وہ لاہور آئے، تو انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ میں اس شاعر سے ملنا چاہتا ہوں، جس نے یہ نظم لکھی تھی۔ اب کیا تھا! پولیس اور خفیہ پولیس اور نوکر شاہی کا پورا عملہ حرکت میں آگیا، اور ساغر کی تلاش ہونے لگی۔ لیکن صبح سے شام تک کی پوری کوشش کے باوجود وہ ہاتھ نہ لگا۔ اس کا کوئی ٹھور ٹھکانا تو تھا نہیں، جہاں سے وہ اسے پکڑ لاتے۔ پوچھ گچھ کرتے کرتے سرِ شام پولیس نے اسے

ایک پان والے کی دوکان کے سامنے کھڑے دیکھ لیا؛ وہ پان والے سے کہہ رہا تھا کہ پان میں قوام زرا زیادہ ڈالنا۔ پولیس افسر کی باچھیں کھل گئیں کہ شکر ہے ظلِ سبحانی کے حکم کی تعمیل ہو گئی۔ انھوں نے قریب جا کر ساغر سے کہا کہ آپ کو حضور صدرِ مملکت نے یاد فرمایا ہے۔ ساغر نے کہا: بابا، ہم فقیروں کا صدر سے کیا کام! افسر نے اصرار کیا، ساغر نے انکار کی رٹ نہ چھوڑی۔ افسر بیچارا پریشان کرے تو کیا کیونکہ وہ ساغر کو گرفتار کر کے تو لے نہیں جا سکتا تھا کہ اس نے کوئی جرم نہیں کیا تھا، اور اسے کوئی ایسی ہدایت بھی نہیں ملی تھی، جرنیل صاحب تو محض اس سے ملنے کے خواہشمند تھے اور ادھر یہ "پگلا شاعر" یہ عزّت افزائی قبول کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اب افسر نے جو مسلسل خوشامد سے کام لیا، تو ساغر نے زچ ہو کر اس سے کہا: ارے صاحب، مجھے گورنر ہاؤس میں جانے کی ضرورت نہیں۔ وہ مجھے کیا دینگے، دوسو، چارسو، فقیروں کی قیمت اس سے کہیں زیادہ ہے۔ جب وہ اس پر بھی نہ ٹلا تو ساغر نے گلوری کلّے میں دبائی اور زمین پر پڑی سگرٹ کی خالی ڈبیا اٹھا کر کے اُسے کھولا جس سے اس کا اندر کا حصہ نمایاں ہو گیا۔ اتنے میں یہ تماشا دیکھنے کو ارد گرد خاصی بھیڑ جمع ہو گئی تھی۔ ساغر نے کسی سے قلم مانگا اور اس کاغذ کے ٹکڑے پر یہ شعر لکھا:

ہم سمجھتے ہیں ذوقِ سلطانی
یہ کھلونوں سے بہل جاتا ہے

ساغر صدیقی بقلم خود

اور وہ کاغذ پولیس افسر کی طرف بڑھا کر کہا: یہ صدر صاحب کو دے دینا، وہ سمجھ جائینگے۔ اور اپنی راہ چلا گیا:

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
شاید کہ تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

ایک نغمہ، ایک غنچہ، ایک تارا، ایک جام   اے غمِ دوراں! غمِ دوراں! تجھے میرا سلام

ہم بنائینگے یہاں، ساغرؔ! نئی تصویر شوق — ہم تخیّل کے مجدّد، ہم تصوّر کے امام

گیت اس عہدِ بے تکلّف میں — بربط و چنگ و نَے کو ترسے ہیں

ساقیا! تیرے بادہ خانے ہیں — نام ساغر ہے، مَے کو ترسے ہیں

چراغ طور جلاؤ، بڑا اندھیرا ہے — ذرا نقاب اٹھاؤ، بڑا اندھیرا ہے

وہ جن کے ہوتے ہیں خورشید آستینوں میں — انھیں کہیں سے بلاؤ، بڑا اندھیرا ہے

مجھے تمھاری نگاہوں پہ اعتماد نہیں — مرے قریب نہ آؤ، بڑا اندھیرا ہے

فرازِ عرش سے ٹوٹا ہوا کوئی تارا — کہیں سے ڈھونڈ کے لاؤ، بڑا اندھیرا ہے

ابھی تو صبح کے ماتھے کا رنگ کالا ہے — ابھی فریب نہ کھاؤ، بڑا اندھیرا ہے

بصیرتوں پہ اجالوں کا خوف طاری ہے — مجھے یقین دلاؤ، بڑا اندھیرا ہے

جسے زبانِ خرد میں شراب کہتے ہیں — وہ روشنی سی پلاؤ، بڑا اندھیرا ہے

بنام زہرہ جبینانِ خطّۂ فردوس — کسی کرن کو جگاؤ، بڑا اندھیرا ہے

ساغرؔ کسی کی یاد میں جب اشکبار تھے — کتنے حسین دن تھے جہانِ خراب میں

جگمگاتے ہیں وحشتوں کے دیار — عقل نے آدمی کو بیچ دیا

ہم اُلٹ دیتے ہیں صدیوں کے نقاب — ہم زمانوں کی خبر رکھتے ہیں

یوں چٹکتے ہیں شاخ پر غنچے — جیسے ان کے سلام آتے ہیں

رہبروں کے ضمیر مجرم ہیں — ہر مسافر یہاں لٹیرا ہے

معبدوں کے چراغ گُل کر دو — قلبِ انسان میں اندھیرا ہے

میں بھی جنّت سے نکالا ہوا اک بت ہی تو ہوں
ذوقِ تخلیق! تجھے کیسے صنم آتے ہیں!

ہاں میں نے لہو اپنا گلستاں کو دیا ہے — مجھ کو گل و گلزار پہ تنقید کا حق ہے

صبح دیکھا، شگوفے تھے ٹوٹے ہوتے — گُل کھلاتی رہی، رات بھر، چاندنی

اے ستاروں کے چاہنے والے — آنسوؤں کے چراغ حاضر ہیں

رونقِ جشنِ رنگ و بو کے لیے — زخم حاضر ہیں، داغ حاضر ہیں

تشنگی تشنگی، ارے توبہ! قطرے قطرے کو ہم ترستے ہیں
اے خداوند کوثر و تسنیم! تیرے بادل کہاں برستے ہیں؟

کچھ نہیں مدعا فقیروں کا درد ہے لادوا فقیروں کا
اپنی تنہائیوں پہ ہنستے ہیں کون ہے آشنا فقیروں کا

ایک وعدہ ہے کسی کا جو وفا ہوتا نہیں
ورنہ ان تاروں بھری راتوں میں کیا ہوتا نہیں

ہر شناور کو نہیں ملتا، تلاطم سے خراج
ہر سفینے کا محافظ ناخدا ہوتا نہیں

ہر بھکاری پا نہیں سکتا مقام خواجگی
ہر کس و ناکس کو تیرا غم عطا ہوتا نہیں

ہائے یہ بیگانگی، اپنی نہیں مجھ کو خبر!
ہائے یہ عالم کہ تو دل سے جدا ہوتا نہیں

زمانے کو نہ دے الزام، اے ناواقفِ منزل!
زمانے کی نظر ہم ہیں، زمانے کا چلن ہم ہیں

آوارگی برنگ تماشا بُری نہیں ذوقِ نظر ملے، تو یہ دنیا بری نہیں
کہتے ہیں تیری زلفِ پریشاں کو زندگی اے دوست! زندگی کی تمنّا بری نہیں
ساغر کے ساتھ چل کے کبھی میکدے میں سُن اتنی حدیثِ ساغر و بادہ بُری نہیں

یاد رکھنا ہماری تربت کو
قرض ہے تم پہ چار پھولوں کا

جمالی، طفیل احمد

ان کا خاندان دراصل الٰہ آباد کا رہنے والا تھا، لیکن یہ ۱۹۱۹ء میں بنارس میں پیدا ہوئے، جہاں اس زمانے میں ان کے والد محمد اسحاق صاحب مقامی جیلخانے کے مہتمم تھے۔ وہ وہاں بہت لمبا عرصہ تعینات رہے تھے۔ چنانچہ جمالی کی ابتدائی تعلیم بنارس ہی میں ہوئی۔ بی۔ اے کا امتحان بعد کو ۱۹۴۱ء میں اپنے وطن الٰہ آباد یونیورسٹی سے پاس کیا۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد انھوں نے دلّی کی راہ لی۔ سیاست اور مضمون نگاری سے انھیں طالبعلمی کے زمانے ہی میں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ یہاں دلّی میں انھوں نے مختلف اخباروں میں جز وقتی کام شروع کیا۔ پھر مستقل طور پر "منشور"، کے عملے سے منسلک ہو گئے۔

۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہوا تو کراچی چلے گئے۔ ابتدا میں چندے روزنامہ "جنگ" میں کام کیا۔ جب مشہور کانگریسی اور کمیونسٹ لیڈر میاں افتخار الدین (ف: جون ۱۹۶۲ء) نے اردو روزنامہ "امروز" جاری کیا، تو اس کا ایک ایڈیشن کراچی سے بھی چھپنے لگا۔ اس کے ایڈیٹر مشہور صحافی چراغ حسن حسرت (ف: جون ۱۹۵۵ء) تھے۔ انھوں نے جمالی کی صلاحیتوں کا اندازہ لگایا اور انھیں امروز کے اسٹاف میں لے لیا۔ جمالی اس میں روزانہ "پہلا درویش"، کے قلمی نام سے مزاحیہ کالم لکھنے لگے۔ وہ اس کے ہفتہ وار ایڈیشن کے لیے

"گر تو برا نہ مانے" کے عنوان سے ملک کی معاشرتی سیاسی سماجی، ادبی سرگرمیوں پر طنزیہ انداز میں تنقید کرتے رہے۔ یہ دونوں کالم (خاص کر موخر الذکر) بہت مقبول ہوئے۔

"امروز" کا کراچی ایڈیشن بند ہو جانے کے بعد وہ فلمی دنیا سے وابستہ ہو گئے۔ اس زمانے میں انھوں نے متعدد فلموں کے مکالمے اور گانے لکھے۔ وہ کراچی کے مشہور فلمی رسالے "نگار" (ہفتہ وار) کے مستقل قلمی معاون تھے۔ اس میں وہ مختلف ناموں سے ہر ہفتے کئی کئی مضمون لکھتے رہے۔ یہ تعلق تقریباً دو برس تک قائم رہا۔

مجید لاہوری (ف: جون ۱۹۵۷ء) اور ان کا ہفتہ وار مزاحیہ اخبار "نمکدان" کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ "نگار" سے علاحدہ ہونے کے بعد جمالی نے "نمکدان" اپنی تحویل میں لے لیا۔ وہ دو برس تک اس کے مرتب رہے۔ زیادہ حصّہ اس کا بھی ان کے قلم سے ہوتا تھا۔

۱۹۶۳ء میں وہ روزنامہ "انجام" (کراچی) کے مدیر مقرر ہو گئے۔ اسی سال انھوں نے روس کا دورہ کیا۔ دو سال بعد مئی ۱۹۶۵ء میں وہ ایک سرکاری ادارے "نیشنل انوسٹمنٹ ٹرسٹ" کے افسر تعلقات عامہ نامزد ہو گئے، لیکن یہاں سال بھر بھی مشکل سے گزرا ہوگا کہ حکومتِ چین نے ان کی خدمات حاصل کر لیں، اور وہ ریڈیو پیکنگ کے رسالے "تصویرِ چین" میں مترجم ہو کر چلے گئے۔ چین سے ۱۹۶۹ء میں واپس آئے۔

وہ پاکستان رائٹرز گلڈ کے بانیوں میں تھے۔ ۱۹۶۲ء - ۱۹۶۴ء تک دو سال اس کے سکتر رہے اور کچھ مدت اس کے رسالے "ہم قلم" کی ادارت بھی کی۔ بعد کو اس سے بھی تعلقات منقطع کرنا پڑے، اور انھیں بسر اوقات کے لیے ریڈیو اور فلمی رسالوں کا سہارا لینا پڑا۔

۱۹۷۰ء میں کراچی سے فیض احمد فیض نے ایک ہفتہ وار "لیل ونہار" شروع کیا

تھا۔ جمالی اس میں اپنا کالم "گر تو بُرا نہ مانے" لکھنے لگے۔ لیکن یہ تعلق بھی زیادہ دن تک قائم نہ رہ سکا۔ اس کے بعد جمالی نے اپنا ذاتی پرچہ "انقلاب" (ہفتہ وار) جاری کیا۔ لیکن اس نے بھی پانچ شماروں کے بعد دم توڑ دیا۔

انھیں اردو، فارسی، انگریزی تینوں زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔ اردو اور انگریزی میں بےتکلّف لکھتے تھے۔ فارسی میں ان کا کوئی مضمون نظر سے نہیں گزرا۔ لیکن اس میں گفتگو اور تقریر وہ بڑی روانی سے کرتے تھے۔ وہ انجمنِ صحافیانِ پاکستان کی مجلسِ عاملہ کے رکن بھی تھے۔

اتنی صلاحیتوں کا مالک اور کامیاب غزلگو اور طنز نگار ہونے کے باوجود، افسوس کہ ان کے مزاج میں استقلال نہیں تھا۔ انجمن آرا اور انجمن ساز قسم کے انسان تھے۔ لاابالی پن گویا ان کے خمیر میں تھا۔ ہر وقت دوستوں کے حلقے میں خوش گپیوں میں مصروف رہتے۔ اسی لیے عمر بھر پریشان رہے اور کوئی دیرپا کام نہ کر سکے۔ اور تو اور اپنا کلام تک جمع نہیں کیا۔ حافظہ بہت اچھا تھا: اس لیے جو کچھ کہا، سب یاد تھا؛ ضرورت پڑے پر وہ لمبی لمبی نظمیں (طنزیہ اور مزاحیہ) اور غزلیں سنا دیتے تھے۔

آخری عمر میں انھوں نے صحافت سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی اور بسراوقات کے لیے ایک سیمنٹ ایجنسی چلانے لگے تھے۔ اسی کاروبار کے سلسلے میں ۱۰ اگست ۱۹۷۴ء ہفتے کے روز حیدرآباد (سندھ) گئے۔ اگلے دن شام کو کراچی واپسی ہوئی۔ رات سوتے میں شدید کمر درد کی شکایت کی۔ صبح (۱۲ اگست) دل کا دورہ پڑا۔ فوراً اسپتال منتقل کرنے کا انتظام کیا گیا، لیکن رستے ہی میں جان بحق ہو گئے۔ اسی دن مغرب کے بعد سخی حسن دربار قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

شادی خاصی دیر سے ۱۹۶۲ء میں کی تھی۔ دو کمسن لڑکیاں ان کے سوگواروں میں ہیں۔

افسوس کہ ان کے کلام کا مجموعہ آج تک نہیں چھپا۔ اپنی بے پروائی اور لاابالیانہ پن

کی بدولت کبھی کوئی باقاعدہ بیاض تک نہیں رکھی۔ مندرجہ ذیل تین غزلیں مختلف رسائل سے جمع کی گئی ہیں:

کسی حسیں، نہ کسی نازنیں کی بات کرو
لہو سے بھیگی ہوئی آستیں کی بات کرو

گماں ہے موت، یقیں موت کا جواب صواب
گماں سے ہاتھ اٹھاؤ، یقیں کی بات کرو

مقامِ آہ و فغاں سے گزر چکی ہے حیات
نگاہِ گرم و دمِ آتشیں کی بات کرو

زمیں ہے پیاسی اسے خونِ دل کے چھینٹے دو
پھر اس کے بعد مے و انگبیں کی بات کرو

مہ و ستارہ کی محفل بڑی حسیں ہے، مگر
زمین والو! کچھ اپنی زمیں کی بات کرو

سیاہیِ شبِ ہجراں کی داستاں چھوڑو
سحر قریب ہے، مہرِ مبیں کی بات کرو

شگفتِ گل کے فسانے تو سن چکے ہیں بہت
شکستِ خاطرِ اندوہگیں کی بات کرو

باغباں کو مائلِ شر دیکھ کر چپ ہو گئے
اس چمن میں ہم ہی کیا، سب دیدہ ور چپ ہو گئے

گرمیِ محفل جو یوں باقی رہی، تو کیا رہی
اہلِ دل چپ ہو گئے، اہلِ نظر چپ ہو گئے

رات اس محفل میں کس شوریدہ سر کا ذکر تھا
ساز ٹوٹے، راگ بہکے، نغمہ گر چپ ہو گئے

اک شبستاں نور کو ترسا کیا، تڑپا کیا
سوئے یزداں دیکھ کر شمس و قمر چپ ہو گئے
کارواں لُٹنے کا غم بھی رفتہ رفتہ ڈھل گیا
رہگزر پھر سو گئی، اہلِ سفر چپ ہو گئے
کم نہ تھے نازک مزاجی میں کسی سے ہم، مگر
رنج دینے والے کو پہچان کر چپ ہو گئے
اپنے دل کی دھڑکنیں ہم بھی سنانے آئے تھے
قلبِ عالم کو دھڑکتے دیکھ کر چپ ہو گئے

داستانِ غم میں لفظِ آسماں رہنے دیا
ایک نکتہ تھا کہ محتاجِ بیاں رہنے دیا
ان کو دیکھا، پھر بھی نظروں سے نہاں رہنے دیا
اپنی آنکھوں پر حجابِ گلستاں رہنے دیا
گل کو چوما، چاند کو دیوانہ وار آواز دی
ایک پردہ ان کے اپنے درمیاں رہنے دیا
اس جہاں سے سرکشی کی، اُس جہاں سے خودسری
لیکن اِک نازک سا سنگِ آستاں رہنے دیا
اپنی پلکوں پر چمن کے سارے آنسو لے لیے
گل کو خنداں، بلبلوں کو نغمہ خواں رہنے دیا
کیا بھٹکتے چشمۂ حیواں کی خاطر در بدر
اپنے پاس اک غم تھا، اس کو جاوداں رہنے دیا
اے جمالی! بسکہ اک گلشن سے نسبت تھی ہمیں
اپنے نغموں میں بھی اندازِ فغاں رہنے دیا

ٹھاکر پونچھی، جگن ناتھ

ان کا اصلی نام سوہن لال تھا، لیکن مشہور جگن ناتھ کے نام سے ہوئے۔ وہ پونچھ کے ایک راجپوت خاندان میں ۳۱ دسمبر ۱۹۲۲ کو پیدا ہوئے۔ پونچھ اس زمانے میں ریاست جموں و کشمیر کی ذیلی یا جگیرداری ریاست تھی۔ ان کے والد بابو بھیم سین کو ورزشی کھیلوں، خاص کر پولو اور نیزہ بازی میں خاص مہارت حاصل تھی، اسی باعث وہ راجہ صاحب پونچھ کے بڑے چہیتے اور منہ چڑھے تھے اور اس کے باوجود کہ سرکاری طور پر محض ریاست کے محکمۂ حسابات میں ملازم تھے، راجہ صاحب موصوف کی نجی محفلوں میں بھی برابر شریک رہتے تھے۔ شاید حکمران خاندان سے دور نزدیک کی کچھ رشتے داری بھی ہو۔ غرض ٹھاکر پونچھی بھی بچپن سے محل میں آنے جانے لگے اور ان کی تربیت اچھے مرفہ الحال طبقے کے ڈھنگ پر ہوئی۔ پھر جب تعلیم کا زمانہ آیا، تو اول انھیں مقامی وکٹوریہ جوبلی اسکول میں اور بعد کو تکمیل کے لیے پرنس آف ویلز کالج (حال گاندھی میموریل کالج) جموں میں بھیجا گیا، جہاں سے انھوں نے بی اے کی سند لی۔

تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ اولاً چندے محکمۂ سول سپلائی میں ملازم رہے۔ لیکن ان کی طبیعت کی جولانی کے لیے یہ میدان بہت تنگ تھا۔ وہ محض کلرکی اور بے عملی کی زندگی پر قانع نہیں رہ سکتے تھے۔ مشہور ہے کہ بچپن میں وہ گلی محلے کے بچوں کو ساتھ لے کر ڈرامے کھیلا کرتے تھے، اور سب لوگ انھیں "جنتھیدار" کے نام سے پکارتے تھے۔ اس سے ان کے مزاج کے رجحان کا پتا چلتا ہے۔ وہ واقعی علمی و ادبی صلاحیتیں لے کر آئے تھے۔ چنانچہ جب

سول سپلائی کے محکمہ سے دل اُچاٹ ہوگیا، تو ۱۹۴۸ء میں دلّی چلے آئے۔ آدمی دیکھنے اور شکل وصورت کے لحاظ سے اچھے تھے، کچھ سفارشوں نے بھی کام کیا ہوگا۔ بہرحال غرض انھیں یہاں جلد ہی آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت مل گئی۔ یہاں وہ ڈوگری نیوز سروس میں سب ایڈیٹر مقرر ہوئے تھے۔

دلّی اس زمانے میں پنجاب سے آئے ہوئے پناہ گزینوں سے پٹی پڑی تھی۔ یہ لوگ جو بھوکے ننگے جان بچاکر یہاں آئے تھے، اور جن کے پاس سر چھپانے کے لیے آسمان کی چھت کے سوائے ٹھکانا نہیں تھا، ہر طرح کی مدد کے مستحق اور طلبگار تھے۔ ٹھاکر پونچھی نے کچھ اور فنکاروں کے تعاون سے ڈرامے کیے اور پروگرام بنائے، جن کی آمدنی انھوں نے شرنارتھی ریلیف فنڈ میں پیش کردی۔ اس کے لیے کچھ ڈرامے خود بھی لکھے تھے۔

دلّی میں وہ دسمبر ۱۹۷۱ء تک رہے۔ اس کے بعد اسی عہدے پر جموں ریڈیو اسٹیشن میں تبادلہ ہوگیا۔ انھوں نے خاص طور پر ڈوگری علم وادب اور کلچر کے فروغ میں نمایاں کام کیا۔ وہ ریاستی اکاڈمی کے بھی رکن تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی افسانہ نویسی سے شروع کی تھی۔ ان کا پہلا افسانہ غالباً "خانہ بدوش" تھا جو ۱۹۵۰ء میں "ایشیا" (ہفتہ وار) بمبئی میں چھپا۔ ۲۴ برس بعد اپنی موت تک انھوں نے کوئی دو درجن ناول اور افسانوں کے تین مجموعے شائع کیے۔ ان کے بعض ناولوں اور افسانوں کا ملک کی دوسری زبانوں۔ بنگالی، پنجابی، ملیالم، ہندی، میں بھی ترجمہ ہوا۔ ان کے چند ناولوں کے نام یہ ہیں: ڈیڈی، وادیاں اور ویرانے، رات کے گھونگٹ، شمع ہر رنگ میں جلتی ہے، زلف کے سر ہونے تک، چاندنی کے سایے، یادوں کے کھنڈر، پیاسے بادل، اداس تنہائیاں، جب بکھر دتے ہیں، یہ رشتے یہ دھاگے، پت جھڑ کے بکھرے، بھنور وغیرہ۔ زندگی کی دوڑ، چناروں کے چاند، آدھے چاند کی رات، افسانوں کے مجموعے ہیں۔

وہ ڈوگری میں بھی بلا تکلف لکھتے تھے۔ ان کی تحریریں ہماری زندگی اور عوام کے مشاغل کا اچھا مرقع ہیں۔

زندگی کے آخری ایام میں انھوں نے ایک نیا ناول لکھنا شروع کیا تھا۔ "اب میں وہاں

نہیں رہتا"۔ اسے انھوں نے ۱۴ اگست ۱۹۷۴ء کو مکمل کیا اور آخری صفحے پر یہ لفظ لکھے:

"اہنسا پرمودھرمے

"پرنام

"سلام"

"خدا حافظ

"سب کچھ دور ہے۔ سب کچھ پاس ہے، صرف احساس کی بات ہے"

یہ آخری لفظ لکھ کر وہ سہ پہر کو میز سے اٹھے اور دفتر سے باہر کچھ کھانے پینے کے لیے گئے۔ سڑک پر پہنچے ہی تھے کہ ایک تیز آتی ہوئی جیپ ان سے ٹکرا گئی۔ دماغ کو ضرب شدید آئی، جس سے بیہوش ہو گئے۔ فوراً آنری مہاراجا گلاب سنگھ اسپتال پہنچایا گیا، جہاں اسی بیہوشی کے عالم میں جمعہ ۱۶ اگست (۱۹۷۴ء) صبح طائرِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گیا۔ موت سے کوئی تین مہینے پہلے سے انھوں نے "کہانی ختم" "قصہ ختم" کے الفاظ کو اپنا تکیۂ کلام بنا لیا تھا۔ اس وقت انھیں کیا معلوم ہوگا کہ واقعی اتنی جلد ان کی جیون کہانی یا قصۂ حیات ایسے المناک طریقے پر ختم ہونے والا ہے۔

۱۹۴۶ء میں پونچھ کے وزیر خاندان میں شادی ہوئی تھی، لیکن بیوی سے نبھ نہ سکی اور کوئی ڈیڑھ دو سال میں علیحدگی ہو گئی۔ لاولد فوت ہوئے۔ وہ ہر کسی کے دوست، ہمدرد اور غمخوار تھے۔ ان کے جنازے کے ساتھ زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا جو ہجوم تھا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کتنے مقبول اور ہر دل عزیز تھے۔

بہزاد لکھنوی، سردار احمد خان

۱۹۰۰ء میں اپنے خاندانی مکان، امین آباد پارک، لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ چونکہ خاندان مذہبی خیالات کا اور وہ بھی متوسط الحال قسم کا تھا، اس لیے تعلیم کے پہلو سے تشفی بخش انتظام نہ ہو سکا۔ پھر بھی لشتم پشتم مڈل کے درجوں تک اُردو، فارسی، عربی اور کچھ انگریزی حاصل کر لی۔

جب معاش کا مسئلہ پیش آیا، تو ریلوے کے محکمے میں ملازم ہو گئے۔ وہ مدتوں، ٹی، ٹی، ای (چلتی گاڑی میں ٹکٹ معاینہ کرنے والے) کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ان کے خاندان کا بریلی کی درگاہ نیازیہ سے پرانا تعلق تھا؛ یہ بھی وہیں مرید تھے۔ اس لیے نماز روزے کے سختی سے پابند تھے۔ بچپن سے قوام کے تیلے اور جسم کے کمزور تھے ہی؛ متواتر سفروں نے رہی سہی کسر پوری کر دی اور بیمار رہنے لگے۔ صحت سقیم، فرائضِ منصبی میں متواتر لمبے لمبے سفر لازم، جن میں بعض اوقات راتوں کو جاگنا پڑتا، اس پر مذہبی ریاضت۔ غرض صحت نے بالکل جواب دے دیا اور اختلاجِ قلب کے دَورے پڑنے لگے۔ گھنٹوں بیہوش پڑے رہتے؛ اسے یار لوگوں نے حالتِ جذب سے تعبیر کیا۔ جب صحت کچھ بہتر ہوئی، تو ابْ نئی اور نسبتہً سکون کی ملازمت کی تلاش میں دلّی آ گئے۔ اس زمانے میں یہاں آل انڈیا ریڈیو کے اصحاب مجاز بڑے ہمدرد قسم کے لوگ تھے؛ ان کی عنایت سے نوکری مل گئی اور یہ مضمون (سکرپٹ) لکھنے پر مقرر ہو گئے۔ دلّی میں وہ تین چار برس رہے۔ یہی زمانہ ہے جب میں نے انھیں دیکھا۔

اختلاجِ قلب کے مرض سے انھیں افاقہ تو ہو گیا، لیکن اس کے بعد سے وہ مستقلاً سُوت کی

اچھی خاصی موٹی دوہری رسّی گلے میں ڈالے رہتے ۔ جب کلام پڑھتے پڑھتے جوش میں آجاتے تو دونوں ہاتھوں سے اسے کھینچنے لگتے تھے ۔ چونکہ وہ دوہری تھی، اس لیے نیچے اوپر چلتی رہتی اور اس سے گلا گھونٹے جانے کا اندیشہ نہیں تھا ۔ میں جس ملاقات کا ذکر کر رہا ہوں، اس دن طبیہ کالج (قرول باغ) دلّی کے کسی مشاعرے میں کلام سنانے کے لیے اسٹیج پر آئے تھے ۔ میں نواب سائل مرحوم (ف: ۱۹۴۵ء) کے قریب بیٹھا تھا ۔ برابر میں کسی نے کہا: "ارے یہ گلے میں رسّی کیوں ڈالے ہوئے ہے اور اسے کھینچ کیوں رہا ہے؟" اس پر سائل صاحب بولے: "بھائی، یہ دیوانہ ہے، لیکن بکارِ خویش ہشیار۔ اگر کھینچنے کو رسّی نہیں ہو، تو یہ اپنے کپڑے پھاڑ ڈالیگا۔"

بہزاد اگرچہ یہاں ہر طرح خوش تھے، لیکن ۱۹۴۰ء میں وہ ریڈیو کی نوکری ترک کر کے پنچولی فلم کمپنی، لاہور میں مکالمہ نویس بن کر چلے گئے ۔ لاہور میں وہ تین برس رہے تھے ۔ وہاں کا معاہدہ ختم ہوا تو وہ دوبارہ ۱۹۴۳ء میں آل انڈیا ریڈیو میں آگئے؛ اب کے ان کا لکھنؤ اسٹیشن میں مضمون (سکرپٹ) لکھنے پر تقرر ہوا ۔ دو سال بعد، ۱۹۴۵ء میں انھیں راج کمل کلامندر، بمبئی نے اپنی فلموں کے لیے گیت لکھنے پر ملازم رکھ لیا ۔ وہ ۱۹۵۱ء تک بمبئی میں رہے ۔ اس زمانے میں انھوں نے ۴۰-۵۰ فلموں کے لیے گیت لکھے ہونگے ۔ اسی سال پاکستان چلے گئے، جہاں جمعہ کے دن ۱۰ اکتوبر ۱۹۷۴ء کو قریب مغرب ان کا کراچی میں انتقال ہو گیا ۔ سخی حسن درگاہ کے قبرستان (کراچی) کی چاردیواری کے باہر اُس احاطۂ خاص میں دفن ہوئے، جہاں ان کے سلسلے کے لوگوں نے درگاہ تعمیر کی ہے ۔

بہزاد سب اصنافِ سخن پر قادر تھے ۔ غزل، گیت، نظم کا وافر ذخیرہ ان کے ہاں ملتا ہے ۔ لیکن ان کی خصوصی شہرت نعت نگار کی حیثیت سے ہوئی اور اس میں شبہ نہیں کہ ان کی نعت میں خاص کیف اور درد ہے ۔ لحن سے پڑھتے بھی خوب تھے ۔ اُن کے متعدد مجموعے شائع ہوئے تھے ۔ ان میں سے نغمۂ نور، موجِ طہور اور چراغِ طور بہت مقبول ہوئے ۔

افسوس کہ ان کے کلام کا کوئی مجموعہ تلاشِ بسیار کے باوجود دستیاب نہ ہو سکا ۔ بعض سالو

میں شائع شدہ چند غزلیں ملیں، انھیں میں سے چند شعر بطورِ نمونہ درجِ ذیل ہیں۔ کلام میں بھی تصوّف کا رنگ غالب ہے، جوان کی زندگی کا مابہ الامتیاز تھا:

اک عجیب عالم ہے حسن کی یہ دنیا بھی
صبح کا تماشا بھی، شام کا تماشا بھی

راہبر سے کیا پوچھوں، راہزن سے کیوں الجھوں
منزلِ محبت کا ہے اک اور رستا بھی

کیوں مسرتیں دے دیں، اے نگاہِ بے پروا!
مجھ سے چھینتی کیوں ہے غم کا اک سہارا بھی

منزلِ نظر وہ ہے، محفلِ دگر وہ ہے
جس جگہ نظر آئے جلوہ گر بھی، جلوہ بھی

ہے یہی درِ جاناں، کعبۂ نگاہ دجاں
ہاں، یہیں پہ ہوتا ہے زندگی کا سودا بھی

ترے بغیر مری زندگی کی ویرانی
عجیب دور سے لے جانِ جاں گذرتی ہے

دبی ہوئی مرے سینے میں غم کی چنگاری
خدا گواہ کہ بنیا خترا ابھرتی ہے

عجیب رنگ سے شیرازہ بندیٔ تسکیں
وفورِ زحمت و آلام سے بکھرتی ہے

غموں نے گھیر لیا ہے چہار جانب سے
جو موج ڈوب چکی تھی، وہ خود ابھرتی ہے

تجھے خبر ہے مرے سوزِ عشق کی، پھر بھی
بتا بتا کہ تری زلف کیوں سنورتی ہے

ترے زلف و رُخ کا یہ رنگیں نظام
انھیں سے ہیں روشن مرے صبح و شام

مبارک، مبارک، اٹھی خود نقاب!
نگاہوں کو ملنے لگا اذنِ عام

میں کیوں راہبر! تجھ کو تکلیف دوں
مری منزلِ شوق ہے چند گام

وہ اٹھی، وہ اٹھی کسی کی نظر
وہ آیا، وہ آیا کسی کا پیام

نہ اپنی خبر ہے، نہ دل کی خبر
محبت نے بخشے عجب صبح و شام

ہے بیخود سا بہزادِ مضطر، مگر
ہے اس کے لبوں پر تمھارا ہی نام

یہ تو ہی بتائے، زاہد! ہے ریا کہ بے ریائی
مرا جذبۂ ندامت، تری شانِ پارسائی

ترے آستاں کے صدقے، کوئی حد بھی کیف کی ہے
کہیں مست ہو نہ جائے، مرا ذوقِ جبہہ سائی

میں جہاں سے منھ پھرا کر ترے پاس آ رہا ہوں
کوئی اور کیا بھرے گا مرا کاسۂ گدائی

مری الجھنوں سے پوچھو، مری دھڑکنوں سے پوچھو
بڑی منزلوں سے گزری ہے جنوں کی نارسائی

مری زندگی ہے مستی، مری زندگی کا حاصل
نہ جنوں نہ ہوشمندی! نہ وفا، نہ بیوفائی

مری بیخودی تصدق، مری مستیاں نچھاور
وہ ادھر ہی آ رہے ہیں، بکمالِ دلربائی

تری رہگذر کے پھیرے، ترے آستاں کے سجدے
یہی ہیں مری خطائیں، یہی میری پارسائی

خبر نہ تھی تیری جستجو میں، کشاکش رہروی ملیگی
قدم قدم پر جبیں جھکیگی، قدم قدم آگہی ملیگی

تمھیں مبارک مرا تڑپنا، مجھے مبارک تمھارے جلوے
یہ دونوں عالم رہیں سلامت، جہاں کو آسودگی ملیگی

نہ ڈھونڈ ہم کو نگاہِ عالم، جہاں یہ میں ہوں جہاں وہ ہوں
جہاں بھی کھویا ہوا ملیگا، فضا بھی کھوئی ہوئی ملیگی

ابھی نہ چھیڑو، ابھی نہ چھیڑو! ابھی تو ذوقِ طلب میں گم ہوں
یہ راز کیوں مجھ پہ کھولتے ہو کہ اور مشکل ابھی ملیگی

خودی کے دھوکے میں آ رہا ہوں جنوں سے دامن بچا رہا ہوں
سمجھ رہا ہوں یقیں میں پھنس کر، سکون کی زندگی ملیگی

ہمیں تو ہر ذرّہ میکدہ ہے کہ ہم تو ہیں تیرے رند، ساقی!
مگر کہاں مستیاں ملینگی، مگر کہاں بیخودی ملیگی!

گماں کے ہاتھوں خراب و خستہ، کدھر یہ دیوانے جا رہے ہیں
کہیں نہ کعبہ نہ بتکدہ ہے، ملی تو ان کی گلی ملیگی

محشر مرزاپوری، مرزا فرزند علی

یکم جنوری ۱۸۹۸ کو مرزاپور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حکیم علی صاحب تھے، جو بچوں کو نجی تعلیم دینے کے لیے اس دور میں خاصی شہرت کے مالک تھے۔ فرزند علی صرف پانچ برس کے تھے، جب ان کا انتقال ہو گیا۔ محشر صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے والد کے بعض شاگردوں سے گھر ہی پر حاصل کی؛ اور اس کے بعد بعمر سولہ سال ۱۹۱۴ء میں مقامی لندن مشن ہائی اسکول (حال بابو لال جیسوال انٹر کالج) سے دسویں درجے کا امتحان اوّل ڈویژن میں پاس کیا۔ اس طرح وہ اردو، فارسی، ہندی اور انگریزی میں خاصی لیاقت کے مالک ہو گئے۔ چونکہ خاندان کی ذمہ داریاں مزید تعلیم کے رستے میں حائل تھیں، اس لیے انھوں نے بسر اوقات کے لیے ملازمت کرنے کا فیصلہ کیا۔ اوّلاً چند سے مرزاپور کلکٹریٹ میں نوکری کی۔ ۱۹۱۸ء میں ان کی شادی الٰہ آباد میں ہو گئی اور یہ اگلے برس وہاں چلے گئے۔ یہاں کوئی سال بھر ڈسٹرکٹ بورڈ میں کام کیا اور اس کے بعد خفیہ پولیس کے محکمے میں بھرتی ہو گئے۔ شروع میں کرایے کے مکان میں قیام رہا۔ بعد کو جب حالات سازگار ہو گئے، تو ۱۹۲۸ء میں وہیں محلہ کیٹی پور میں اپنا مختصر مکان خرید لیا۔ ملازمت اور اس کے بعد بھی اپنی وفات تک وہ اسی مکان میں مقیم رہے۔

۱۹۳۹ء میں ان کا دفتر الٰہ آباد سے لکھنؤ منتقل کر دیا گیا، تو یہ بھی اس کے

ساتھ وہاں بھیج دیے گئے۔ نہ معلوم کیوں، وہاں کی آب وہوا ان کے راس نہ آئی اور اکثر بیمار رہنے لگے، خاص طور پر آنکھوں میں سخت تکلیف پیدا ہوگئی اور بینائی بتدریج کمزور ہونے لگی، اس پر ان کا الٰہ آباد کے ایک متعلقہ دفتر میں تبادلہ ہوگیا، لیکن اس سے بھی چنداں فائدہ نہ ہوا، رفتہ رفتہ بصارت بالکل جاتی رہی۔ آخر اسی باعث، انھیں قبل از وقت ۱۹۴۷ء میں ریٹائر ہونا پڑا۔

ان کا الٰہ آباد کے جناب راحت حسین کی صاحبزادی سے نکاح ہوا تھا۔ ان کے بطن سے آٹھ بچے ہوتے: پانچ لڑکے (محمد علی مضطر، غضنفر علی غضنفر، اظہر علی، حیدر علی، صفدر علی) اور تین لڑکیاں (قیصر جہاں، انیس جہاں، فردوس جہاں)۔ بڑی بیٹی قیصر جہاں کا ان کی زندگی میں انتقال ہوگیا تھا۔ باقی سب بچے بفضلہ تعالیٰ زندہ سلامت موجود ہیں۔

انھوں نے ۱۹۲۲ء میں شعر کہنا شروع کیا تھا۔ آغاز سخنگوئی میں پروفیسر ضامن علی ضامن صدر شعبۂ اردو، الٰہ آباد یونیورسٹی کے برادرِ خورد سید حامد علی حامد مرحوم سے مشورہ رہا۔ پھر سید حسن مرتضیٰ شفق عماد پوری تلمیذ امیر مینائی سے رجوع کیا۔ شفق نے چند غزلیں دیکھنے کے بعد فارغ الاصلاح قرار دے دیا۔ اس کے بعد کسی سے اصلاح نہیں لی۔ افسوس کلام کا مجموعہ ان کی زندگی میں شائع نہیں ہوا۔

۲۵ اکتوبر ۱۹۷۴ء کو فالج کا حملہ ہوا اور ہفتہ بھر بعد بروز جمعہ یکم نومبر ۱۹۷۴ء کو دن کے دس بجے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ جنازہ اگلے دن ہفتے کو بوقتِ صبح اٹھا، اور انھیں ہمت گنج کی کربلا میں اپنے خاندان کے بیشتر دوسرے لوگوں کے قریب دفن کر دیا گیا۔

عمر بھر کی مشق و مزاولت اور اساتذہ کی صحبت کا اثر تھا کہ ان کا کلام زبان اور فن کے پہلو سے بے عیب ہوگیا؛ اور انھوں نے خود استادی

کا درجہ حاصل کر لیا۔ افسوس کہ ان کا مجموعۂ کلام آج تک شائع نہیں ہوا۔
نمونے کے چند شعر درج ذیل ہیں:

میں اسی شبہے میں گمراہ ہوا جاتا ہوں
بیوفا کہتی ہے دنیا جسے، وہ تم تو نہیں!
بدگماں کیوں نظر آتی ہیں تمہاری نظریں
خامشی میری بہ اندازِ تکلّم تو نہیں!
اے تمناؤں کے خالق! خلشِ غم کے خدا!
عشق ہی حسن کا معصوم تبسّم تو نہیں!

یہ مانا چھن گیا آنکھوں کا نور، اے محشر! تو کیا جو دل میں تھی میرے، وہ روشنی بھی گئی؟
خطا معاف، ہم اس زندگی سے باز آئے نفس نفس کا ہمارے شمار ہوتا ہے

تو بہارِ حسنِ فطرت، میں جنونِ عشقِ رسوا
تری زندگی حقیقت، مری زندگی فسانہ

یہ زمانے میں نہیں دم کہ مٹا دے مجھ کو محشر! میں زمانے سے نہیں ہوں، مرے دم سے ہے زمانہ
عشق بہارِ بیخزاں، عشق سرورِ جاوداں عشق کا غم نشاطِ جاں، عشق سے دل جدا نہ کر

مرنے کا ٹھکانہ مل تو گیا، جینے کا سہارا ہو تو گیا
امّید کی دنیا لٹ تو گئی، کچھ ان کا اشارا ہو تو گیا
اے دردِ فراق! اے دشمنِ جاں! اے زندگیٔ غم کے ساماں!
تھے قلب و جگر جس سے لرزاں، صدمہ وہ گوارا ہو تو گیا
کلیوں کا تبسّم غائب ہے، پھولوں کے ہیں چہرے پژمردہ
لیکن ہم اس پر پھولے ہیں، گلزار ہمارا ہو تو گیا

خموشش رات میں، جب کائنات ہوتی ہے
ترے خیال سے تا صبح بات ہوتی ہے

تاج ٹونکی، نواب محمد اسماعیل علی خان بہادر (والیِ ٹونک)

انگریزی زمانے کے راجپوتانے میں ۲۲ ریاستیں تھیں؛ اور ٹونک ان میں واحد مسلم ریاست تھی۔ اس کی بنیاد امیر الدولہ نواب محمد امیر خان (ف ۱۸۳۴ء) نے انگریزوں کے ساتھ طویل کشمکش کے بعد ایک عہد نامے کی رُو سے نومبر ۱۸۱۷ء میں رکھی تھی۔ علم و ادب کی سرپرستی اور اسلامی شعائر کی حفاظت اور پابندی ہمیشہ اس ریاست کا خاص شعار اور طرۂ امتیاز رہی۔ حضرت سیّد احمد بریلوی کی مہم کی ناکامی کے بعد ان کے بقیۃ السیف قافلے کے بیشتر مجاہدین کو یہیں پناہ ملی تھی، محلہ "قافلہ" انھیں اصحاب کا بسایا ہوا ہے۔ ٹونک کے دوسرے حکمران نواب وزیر الدّولہ محمد وزیر خان (ف: ۱۸۶۴ء) کا نام غالب کی سوانح حیات میں بہت نمایاں ہے۔

نواب محمد اسماعیل خان اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی تھے۔ وہ ۳۱ جنوری ۱۹۱۷ء کو ٹونک میں پیدا ہوئے۔ وہ چوتھے فرمانروا نواب محمد ابراہیم خان صولت جنگ کے بیٹے تھے۔ اور بظاہر ان کے والی ریاست ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا، لیکن مقدّر کو کون ٹال سکتا ہے! نواب محمد ابراہیم خان کے انتقال (۲۳ جون ۱۹۳۱ء) پر ان کے بیٹے سعید الدولہ نواب سعادت علی خان سعید ان کے جانشین ہوئے۔ وہ بھی تقریباً پندرہ برس کی جہانبانی کے بعد جمعہ ۲۳ مئی ۱۹۴۷ء کو راہگرائے عالمِ جاودانی ہوئے۔ چونکہ ان کے کوئی فرزند نرینہ نہیں تھا، ان کے چھوٹے علاتی بھائی ممتاز الدولہ فاروق علی خان گدّی پر بیٹھے۔ لیکن ابھی پر مشکل

سے چھ مہینے گذرے ہونگے کہ ان کا اچانک دلّی میں انتقال ہو گیا۔ ان کے بھی کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ اب ان کے برادرِ خورد محمد اسماعیل خان (جو باقی بھائیوں میں سب سے بڑے تھے) ان کے جانشین قرار پاتے۔ جب تک حکومتِ ہند کی طرف سے اس کی باقاعدہ توثیق نہیں ہو گئی "تاریخ ادبِ اردو" کے مصنّف جناب رام بابو سکسینہ (ف: ۱۹۵۷ء) جو یو پی میں کلکٹر کے عہدے پر فائز تھے، ریاست کے منتظم قرار پاتے۔ بعد کو حکومتِ ہند نے ۱۱ فروری ۱۹۴۸ء کو نواب محمد اسماعیل خان کی تخت نشینی کی منظوری دے دی، تو سکسینہ صاحب ہی وزیرِ اعلیٰ بنا دیئے گئے تھے۔ انھوں نے عزیز الدولہ امیر الملک کا لقب اختیار کیا تھا۔
لیکن ملک آزاد ہو چکا تھا اور حکومتِ ہند چاہتی تھی کہ دیسی ریاستیں بھی ملک کے نظم ونسق میں ضم ہو جائیں۔ چنانچہ اس دعوت پر لبیک کہتے ہوئے نواب محمد اسماعیل خان بہادر نے بھی ٹونک کو مارچ ۱۹۴۸ء میں راجستھان سے ملا دیا۔ اس کے باوجود ان کے لیے ٹونک کی رعایا کی محبّت اور احترام میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ اسی طرح یہاں کے لوگوں کا ملجا وماوا بنے رہے۔
جمعرات ۲۱ نومبر ۱۹۷۴ء کو بعدِ ظہر بعارضۂ کینسر اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ تجہیز وتکفین اگلے دن صبح گیارہ بجے ہوئی۔ جنازے کے ساتھ ہزاروں ہندو، مسلمانوں کا مجمع تھا۔ ہر طرف سے جنازے پر گلباری ہو رہی تھی اور کوئی آنکھ ایسی نہیں تھی جو اشکبار نہ ہو۔ "موتی باغ" (شاہی قبرستان) کے قطعۂ خاص میں اپنے پردادا نواب وزیر الدولہ کے سرہانے سپردِ خاک ہوئے۔
ان کے بھی اولاد نہیں تھی۔ اہلِ خاندان اور ٹونک کے عوام نے ان کے چھوٹے علاتی بھائی نواب معصوم علی خان کو ان کا جانشین قرار دیا۔
نواب محمد اسماعیل علی خان نے ہوش سنبھالا، تو اپنے اردگرد علم وفضل اور شعر وسخن کی فضا دیکھی۔ ان کے والد نواب محمد ابراہیم علی خان خود بھی شاعر تھے؛ خلیل تخلّص تھا۔ وہ مضطر اور پھر بسمل سے مشورۂ سخن کرتے رہے تھے۔

نواب محمد اسماعیل خان کی تعلیم کا معقول نجی انتظام ہوا تھا، انھوں نے مختلف علوم متعدد اساتذہ سے حاصل کیے۔ بعد کو انگریزی تعلیم کے لیے میو کالج، اجمیر بھیجے گئے اور وہاں ایک انگریز ماہرِ تعلیم اتالیق کی نگرانی میں چند برس رہے۔

ٹونک اس زمانے میں شعر و ادب کا شہر تھا۔ یہاں نواب محمد ابراہیم علی خاں خلیل کی سرپرستی کے باعث شاعری کا دور دورہ تھا۔ اساتذۂ وقت نواب سلیمان خان بہادر اسد لکھنوی، سید محمد حسین بسمل خیرآبادی، سید محمد افتخار حسین خان مضطر خیرآبادی، سید ظہیر الدین حسین ظہیر دہلوی اور ان کے تلامذہ نے ٹونک کو حریفِ دہلی و لکھنؤ بنا دیا تھا۔ شاہی خاندان کے بیشتر افراد اور شہر کے لوگ شعر سے دلچسپی لیتے تھے اور آئے دن مشاعرے ہوتے رہتے تھے۔ ایسی فضا میں اگر نوجوان محمد اسماعیل خان بھی شعر گوئی کی طرف مائل ہو گئے تو اس میں تعجب کا کیا مقام ہے! چنانچہ انھوں نے تاج تخلّص اختیار کیا اور اردو میں طبع آزمائی کرنے لگے۔

انھوں نے مشورۂ سخن مولانا عبدالقادر خنداں نگینوی ثم اجمیری سے کیا، جو عربی، فارسی کے عالم اور اردو کے صاحبِ فن کہنہ مشق شاعر ہیں۔ انھوں نے خود اپنے کلام پر مفتی مہدی حسن اور مولانا معنی اجمیری سے اصلاح لی تھی۔

وہ ۱۹۴۷ء تک اجمیر ہی میں رہے۔ آزادیِ ملک کے بعد جب وہاں کی سکونت مخدوش ہو گئی، تو ٹونک چلے گئے۔ شروع میں بہت دنوں تک نواب صاحب کے کتابخانے کے مہتمم بھی رہے۔ نواب صاحب مرحوم ان کے بڑے قدر دان تھے۔

تاج مرحوم غزل سے بھی شغف رکھتے تھے۔ ان کے غزلیہ کلام کا دیوان (لمعاتِ تاج) مرتب شدہ خنداں صاحب کے پاس موجود ہے، جس میں سے چند شعر انتخاب کر کے آخر میں دیے جا رہے ہیں۔ انھیں حضرت رسالتمآب کی ذاتِ ستودہ صفات سے جو محبّت اور ارادت تھی، اس کا اظہار اکثر نعت کی

شکل میں ہوتا رہتا تھا۔ اپنے پدر بزرگوار حضرت خلیل کے اتباع میں ربیع الاول میں سات دن تک محفلِ میلاد کا قیام ان کے عہد میں بھی جاری رہا۔ اس کے اخراجات کے لیے ہزاروں روپیہ اپنی جیبِ خاص سے عطا کرتے تھے۔ روزانہ بلا امتیاز مذہب و ملّت شیرینی تقسیم ہوتی تھی اور آپ کے محل نذر باغ میں چراغاں ہوتا تھا۔ ٹونک کی محفلوں کے بارے میں مولانا منظور الحسن برکاتی کا لکھا ہوا کتابچہ "ٹونک کے جشنِ میلادالنبی" خاصے کی چیز ہے۔ مولانا برکاتی ہی کا مرتب کردہ تاج مرحوم کے نعتیہ کلام کا انتخاب بھی "تاجدارِ مدینہ" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے (ٹونک ۱۹۶۷ء) اس کے شروع میں انھوں نے وقیع اور جامع مقدّمے کا اضافہ کیا ہے۔ اس پر نواب صاحب مرحوم نے انھیں خطاب اور خلعت سے نوازا تھا۔

انھوں نے اپنے محل "نذر باغ" میں پندرہ روزہ مشاعرے کا التزام کیا تھا۔ یہ مشاعرے طرحی ہوتے، اور مصرع خود نواب صاحب مرحوم تجویز کرتے تھے۔ ٹونک کے ممتاز شعرا کے وظائف مقرر تھے۔ باہر سے بھی مشاہیر دعوت پر بلائے جاتے اور ان کے اعزاز و اکرام میں کوئی کمی نہیں کی جاتی تھی۔ اگست ۱۹۶۷ء میں ان کی سرپرستی میں "تاج اکیڈمی" قائم ہوئی تھی جس کا مقصد ٹونک کی علمی اور ادبی تاریخ کی ترتیب اور ریاست کے جلیل القدر شعراء ادبا کی تخلیقات کا تعارف تھا۔ یہ اکیڈمی آج بھی موجود ہے۔ غرض ان کی وفات سے ایک صاحبِ علم اور قدر دانِ شعر و ادب شخص ہم سے جدا ہو گیا۔

اب نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

تضمین

ترے اخلاق سے قائم ہوا دنیا کا نظام
ایک ہی صف میں کھڑے کر دیے آقا و غلام

بحرِ الطاف و عنایات، محیطِ اکرام! تلخیِ بخت کے شاکی ہوئے سب شیریں کلام
دشتِ پُر خارِ جہاں، بن گیا گلزار تمام تجھ سے سرسبز و تر و تازہ ریاضِ اسلام

نخلِ بستانِ مدینہ ز تو سرسبز مدام
زاں شدہ شہرۂ آفاق بہ شیریں رطبی

تضمین

جگر تھامے ہوئے کوئی، کوئی مضطر، کوئی بیدم
کسی کے لب پہ آہیں، کوئی محوِ گریۂ پیہم
غرض میں کیا کہوں پیشِ نظر تھا کونسا عالم
"نمی دانم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم
بہر سو رقصِ بسمل بود شب جائے کہ من بودم"

جمال و حسن پر جس کی فدا جنّت کے نظارے
جو دیکھے اک نظر، قدموں پہ اس کے جان و دل وارے
مجسّم نو بہارے، گلعذارے، کبک رفتارے
"پری پیکر نگارے، سرو قدّے لالہ رخسارے
سراپا آفتِ دل بود شب جائے کہ من بودم"

عجب اک کشمکش میں مبتلا تھی، تاج! میری جاں
زمین و آسماں حیراں، در و دیوار تھے لرزاں
مجھے لینا تھے خلوت میں کسی سے آج کچھ پیماں
"رقیباں گوش بر آواز، او در ناز، من ترساں
سخن گفتن چہ مشکل بود شب جائے کہ من بودم"

مجالِ دم زدن ہے اور نہ یارائے بیاں، خسرو!
بیاں کیسے کروں، کیسے کھلے میری زباں، خسرو!

بہ شانِ تاجدارِ تاجدارانِ جہاں، خسرو!
"خدا خود میرِ مجلس بود اندر لامکاں، خسرو!
محمدؐ شمعِ محفل بود شب جائے کہ من بودم"

اب غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں :-

پھر ہرے ہونے لگے زخمِ جگر، اے ہمنشیں! ان کے ہونٹوں پر ہنسی بے اختیار آنے لگی
آج ہی ہم نے کیا تھا عزمِ ترکِ میکشی میکدے پر آج ہی کالی گھٹا چھانے لگی
گاہ آدابِ محبت کی قسم کھاتا ہوں میں گاہ آدابِ محبت سے گذر جاتا ہوں میں
تاج میری شاعری کیا، بر سرِ محفل کبھی شعر کے پردے میں دردِ دل سنا جاتا ہوں میں

ہیں قائم بے ستوں لاکھوں تو ابت اور سیارے
کشش کا عشق کی، ادنیٰ سا یہ فیضان ہے شاید
گریباں چاک آنکھیں سرخ چہرہ خاک آلودہ
یہی، اے تاج! اربابِ جنوں کی شان ہے شاید

دل پہ اب اختیار ہے میرا اب انھیں انتظار ہے میرا
ان کے آنے کا کچھ یقین سا ہے آج دل بیقرار ہے میرا

جگر میں سوز، دل میں درد، آغشتہ بخوں آنسو
فراہم ہو گئے سامانِ تکمیلِ محبت کے

گذری ہیں میری عشق میں راتیں ہزارہا طے میں نے کی ہیں عشق کی راہیں ہزارہا
اتنا ہی لکھ دیا کہ سراپا ہوں شوقِ دید لکھنے کے واسطے تو ہیں باتیں ہزارہا
تو اس کے التفات سے غافل نہ رہ کبھی اے تاج! حسن کی ہیں ادائیں ہزارہا

یہ خالی اہلِ دل سے، تاج! وہ فرہاد و مجنوں سے
یہ سب آبادیاں جھوٹی، یہ سب ویرانے جھوٹے ہیں

ہوشِ ہستی، نہ تابِ نظارہ ایسی کیسی بہار آئی ہے
رہِ عشق میں شوق ہو ہمسفر تو دشواریاں سب ہوں آسانیاں

پوچھتے رہتے ہیں، مرے حالات میں سناتا ہوں، تو بگڑتے ہیں

جس کو ہو زلفِ پریشاں سے کسی کی نسبت
اس کا جینا بھی پریشان ہو حال، اچھا ہے

تاج! ہے عشق کی دنیا کا نرالا دستور
حال جس کا ہو برا، اس کا مآل اچھا ہے

یہ گلستاں تھے جہاں، اب ہیں ڈھیر خاروں کے
یہاں اترتے تھے سو کارواں بہاروں کے

جنھیں ڈبو یا تھا طوفاں نے، وہ ابھر کے رہے
نہ ابھرے ڈوبنے والے کبھی کناروں کے

دل بہت بیقرار ہے میرا
دل پہ کیا اختیار ہے میرا

ثمر چھپروی، عبدالحفیظ صدیقی

ان کے خاندان میں ایک طرف عربی علوم اور اسلامیت کی روایت تھی، تو دوسری طرف شاعری اور وکالت کا پیشہ۔ ان کے والد مولوی عبدالماجد چھپرہ کے کامیاب وکیل تھے اور اردو فارسی میں شعر بھی کہتے تھے؛ نصرت تخلص تھا۔ انھیں تاریخ گوئی میں خاص ملکہ حاصل تھا۔ تاریخی نام سے اپنا مجموعۂ کلام "بیان الغرائب" کے نام سے مرتب کیا تھا، جو غیر مطبوعہ رہ گیا۔ ان کے والد (یعنی ثمر کے دادا) مولوی بخشش علی عربی اور فارسی کے عالم، دینیات کے فاضل اور فارسی کے شاعر تھے۔ انھیں بھی تاریخ گوئی میں خاص مہارت حاصل تھی۔ ان کا غیر مطبوعہ دیوان بھی خاندان میں موجود ہے۔

ایسے ماحول میں ثمر (عبدالحفیظ) کی یکم فروری ۱۹۱۲ء کو چھپرہ (محلہ دھبانواں) میں پیدائش ہوئی۔ وہ آٹھ بھائی بہن تھے۔ دو بھائی ان سے بڑے تھے، چار چھوٹے؛ بہن بھی چھوٹی تھیں۔ یہ سات آٹھ برس کے تھے کہ ۱۹۲۰ء میں ان کے دادا مرحوم نے ان کے بڑے بھائی عبدالحکیم کے ساتھ تعلیم کے لیے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ بھیج دیا۔ یہاں وہ دو برس تک رہے۔ لیکن سیاسی ہنگاموں، بالخصوص خلافت تحریک کے باعث یکسوئی نصیب نہ ہو سکی، آخر ان کے والد کے مشورے سے انھیں انگریزی تعلیم دلانے کا فیصلہ ہوا اور یہ پلٹنے واپس آ گئے۔ یہاں چھپرہ اسکول میں داخلہ لے لیا۔ اس سے فارغ

ہو کر پٹنہ کالج میں پہنچے۔ درجہ بدرجہ ترقی کرکے بالآخر ۱۹۳۴ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے بی اے کی سند لی۔ اس کے بعد وکالت کا امتحان (ایل ایل۔ بی) بھی پاس کر لیا۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد کسبِ معاش کا مرحلہ آیا، تو اپنی سادگی پسند طبیعت کے اقتضا سے شروع میں معلّمی کا پیشہ اختیار کیا اور پرسا ہائی اسکول، سارن (بہار) میں ملازم ہو گئے۔ لیکن نجی حالات کی مجبوری کے باعث یہاں زیادہ دن تک نہیں رہ سکے اور والد کے توسط سے پٹنہ ہائی کورٹ میں مترجم کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔ آدمی محنتی تھے اور اخلاص و ایمانداری سے کام کرنے والے، محکمے میں ترقی ہوتی گئی۔ پہلے ناظم دارالترجمہ مقرر ہوئے اور اخیر میں اوتھ کمشنر۔ اسی عہدے سے ۱۹۷۱ء میں سبکدوش ہو کر پھلواری شریف میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔

صحت بظاہر حال ہمیشہ اچھی رہی۔ اکتوبر ۱۹۷۴ء میں دل کا دورہ پڑا۔ علاج کے لیے اسپتال چلے گئے۔ مہینا بھر بعد ۲۶ نومبر (۱۹۷۴ء) کو معالجوں نے کہا کہ آپ ٹھیک ہو گئے ہیں، چاہیں، تو مکان پر واپس جا سکتے ہیں۔ چنانچہ اسی شام پھلواری شریف پہنچے۔ دوست احباب، رشتہ دار سب خوش و خرّم تھے، ہنس ہنس کر ان سے باتیں کرتے رہے۔ اچانک دس بجے شب میں طبیعت بگڑ گئی اور اللہ اللہ کرتے جاں بحق ہو گئے۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔ درگاہِ مخدوم منہاج الدین راستی میں سپردِ خاک ہوتے۔

ابتدائی ماحول اور تعلیم کے زیرِ اثر شروع سے ورع و اتقا کی طرف مائل تھے۔ ہمیشہ پابندِ صلوٰۃ و صوم اور عاملِ اوراد و وظائف رہے۔ ان کی نیکی کا ادنیٰ سا ثبوت یہ ہے کہ جب ان کے والد کا انتقال ہوا ہے، تو سب نے اتفاقِ رائے سے نمازِ جنازہ پڑھانے کے لیے انھیں امام بنا دیا۔

ان کی شادی کوئلور (آرہ) میں داروغہ عبدالجلیل کی صاحبزادی (نسیم خاتون)

سے ہوئی تھی۔ ان کے بطن سے چار بچے ہوتے: ایک لڑکا (جاوید اقبال) اور تین لڑکیاں۔ ماشاءاللہ سب موجود ہیں۔

جس زمانے میں لکھنؤ میں زیرِ تعلیم تھے، وہاں دارالعلوم میں ایک "بزمِ سخن" تھی، جس کے اہتمام میں مشاعرے منعقد ہوتے رہتے تھے۔ ان کی آٹھ نو برس کی عمر تھی، یہ بھی ان مشاعروں میں جاتے اور وہاں اپنے سے بڑے طلبہ سے شعر لے کر اپنے نام سے پڑھ دیتے۔ یہی تفنّن ان کی شعرگوئی سے شوق کی بنیاد بن گیا۔ چھپرہ اسکول کی طالبعلمی کے زمانے میں خود کچھ تک بندی کرنے لگے۔ اور اصلاح کے لیے اسے اپنے دارالعلوم لکھنؤ کے رفیق سیّد ابراہیم ندوی نجم (سابق سپرنٹنڈنٹ اسلامک اسٹڈیز، پٹنہ) کے پاس بھیجنے لگے۔ اس کا اعتراف ایک شعر میں بھی کیا ہے:

شاعری آتی نہ تھی دراصل مجھ کو اے ثمر!
صحبتِ نجم سخنور نے سخنداں کر دیا

چندے بعد نجم نے انھیں اپنے استاد حضرت تمنا عمادی مجیبی (ف: نومبر ۱۹۷۲ء) کے سپرد کر دیا۔ یہ سلسلہ بھی جلد ہی منقطع ہو گیا اور ۱۹۳۳ء میں یہ سیماب اکبرآبادی (ف: جنوری ۱۹۵۱ء) کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہو گئے؛ آخر تک انھیں کے دامن سے وابستہ رہے۔ ان کے بارے میں کہتے ہیں:

کہنے کو بکثرت ہیں سخنور، لیکن
سیماب کو استادِ یگانہ دیکھا

انھیں نثر سے بھی دلچسپی تھی۔ کسی زمانے میں مشہور فرانسیسی ناول نویس اور مصنف ہیوگو کے ناول کا ترجمہ "بدنصیب" کے عنوان سے کیا تھا۔ ابتدا میں کچھ نظمیں انگریزی میں بھی لکھی تھیں، جو انگریزی ماہنامے "ٹریٹر رجسٹ" میں شائع ہوئی تھیں۔ افسوس کہ ان کا کوئی اردو مجموعہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ کلام بہت پختہ اور بے عیب ہے۔ فلسفیانہ طبیعت پائی تھی، اسی کی

جھلک ان کے کلام میں بھی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

سبب کیا جو سفر میں ہر قدم پر ساتھ ہے میرے
یہ گردِ راہ میری رازداں معلوم ہوتی ہے

سونی پڑی ہے عشق کی منزل ترے بغیر
پیمانہ بن کے ٹوٹ گیا دل ترے بغیر
مقصد ہوا نہ سعی کا حاصل ترے بغیر
منزل پہ بھی ہے حسرتِ منزل ترے بغیر

تبسمِ نگہِ فتنہ کار، کیا کہنا! / بدل دیا ہے رُخِ روزگار، کیا کہنا!
مآلِ یک نگہِ حسنِ یار، کیا کہنا / بنا ہے خرمنِ دل پر شرار، کیا کہنا!
فریبِ وعدۂ حسنِ یار، کیا کہنا / پھر اس پہ بھی ہے ترا اعتبار، کیا کہنا!
جمالِ یار نے تجدیدِ عشق کا پیماں / بیک نگاہ کیا استوار، کیا کہنا!

خامشی میں بھی کوئی کرتا ہے، کیا سرگوشیاں
سُن رہا ہوں آپ اپنی داستاں، دل کے قریب

نشاط انگیز جب انسان کی تقدیر ہوتی ہے
تو خود بیٹھے بٹھائے غیب سے تدبیر ہوتی ہے

جب دل ہی نہیں پاک، تو کیا سمجھو گے! / ہے عقل نہیں خاک، تو کیا سمجھو گے!
دنیا کے ہوں یا عالمِ بالا کے رموز / پیدا نہیں ادراک، تو کیا سمجھو گے!

دشوار ہے انسان کا انساں ہونا / ہاں سہل نہیں، صاحبِ عرفاں ہونا
پھر بھی، مگر! انسان جو آمادہ ہو / مشکل نہیں، مشکل کا بھی آساں ہونا

رازِ قدرت کسی کو معلوم نہیں / اصلِ فطرت کسی کو معلوم نہیں
تدبیر پہ اعتماد ہے سب کو مگر! / اپنی قسمت کسی کو معلوم نہیں

انور کامٹوی، حافظ یار محمد انصاری

۱۸۵۷ء کی افتاد کے بعد انگریزی سیاست کی سخت گیری کے باعث شمالی ہند کے معاشرے میں ایک بڑی تبدیلی یہ آئی کہ یہاں کی گھریلو صنعتیں روبزوال ہونے لگیں۔ اس زمانے میں کئی دستکار اور پیشہ ور خاندان تلاشِ معاش میں ترکِ وطن پر مجبور ہو گئے۔ انھیں میں یوپی کے دیہات کے پارچہ باف بھی تھے، جو عرفِ عام میں انصاری کہلاتے ہیں۔ اسی برادری کا ایک خاندان نواری (ضلع فیض آباد) سے ۱۹۰۷ء میں ہجرت کر کے ناگپور سے ۱۶ کلومیٹر کی دوری پر کامٹی میں جا بسا، جو اس زمانے میں تجارت کا مرکز تھا۔ اس خاندان کے بزرگ حاجی شیخ امیر تھے۔ موصوف کے چار بیٹے ہوئے، جن میں سے دو نے خاصا نام پایا۔ بڑے صوفی مولوی لعل محمد، عالم اور درس و تدریس سے شغف رکھنے والے بزرگ تھے۔ انھوں نے سیّد غلام کبریا کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، خود بھی صاحبِ اجازت تھے۔ بہت سے لوگوں نے ان سے فیض حاصل کیا۔ مارچ ۱۹۵۵ء میں رحلت کی۔

شیخ امیر کے دوسرے بیٹے ہی حافظ یار محمد انور تھے۔ کہا کرتے تھے کہ جب خاندان نواری سے کامٹی آیا ہے، تو میری عمر کوئی سات برس کی ہوگی۔ اس طرح ان کا سالِ ولادت ۱۹۰۰ء کے قریب ہونا چاہیے۔ کامٹی پہنچ کر شیخ نے بیٹے کو تعلیم کے لیے یہاں کے مشہور استاد حافظ حاجی صفی اللہ کے حوالے

کر دیا۔ چنانچہ انھوں نے حاجی صاحب موصوف کی نگرانی میں قرآنِ ناظرہ ختم کیا اور اسے حفظ بھی کر لیا۔ اس کے بعد فارسی ایک دوسرے استاد منشی محمد اسحاق صاحب سے پڑھی۔ کسبِ معاش کے لیے اپنے آبائی پیشے کو ذریعہ بنایا۔

یوپی کے اکثر گھرانوں کے کامٹی میں بس جانے کے باعث یہاں اردو کا عموماً اور شعر و ادب کا خصوصاً اچھا خاصا چرچا تھا۔ سال بھر مشاعرے ہوتے رہتے، اور عشرۂ محرم کی مجالس تو بڑے اہتمام سے ہوا کرتی تھیں۔ انور کی شعر گوئی شروع ہو چکی تھی۔ وہ بھی ان مجلسوں میں شریک ہوتے اور وہاں سلام وغیرہ پڑھتے۔ اس کے بعد طبیعت غزل کی طرف راغب ہوئی، تو انھوں نے مشہور مقامی شاعر سعید کامٹوی (ف: مئی ۱۹۳۰ء) سے اصلاح لینا شروع کی۔

سعید خود صاحبِ فن اور کہنہ مشق شاعر تھے۔ ایک زمانہ ہوا، ان کا ایک مجموعۂ کلام "ارمغانِ جدید" کے تاریخی نام (۱۳۱۲ھ) سے شائع ہوا تھا۔ سعید نے ابتدا میں چندے منشی غوث محمد سے اصلاح لی؛ بعد کو حاجی تجمل حسین تجمل جلالپوری (ف: ۱۹۳۳ء) سے مشورہ کرنے لگے۔ تجمل کا سلسلہ تین چار واسطوں سے ناسخ سے جا ملتا ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ اگرچہ سعید کے کلام میں لکھنوی رنگ نمایاں ہے، مگر انور کے ہاں اس کا اثر بالکل برائے نام ہے۔ رفتہ رفتہ انور نے خود استادی کا درجہ حاصل کر لیا۔ اس نواح میں ان کے شاگردوں کی تعداد کچھ کم نہیں ہے۔

نیو کامٹی کلب نے ان کے کلام کا انتخاب "تجلیاتِ انور" کے عنوان سے شائع کیا تھا۔ ہنوز بہت کلام غیر مطبوعہ موجود ہے۔ کلام کا جو انداز اور معیار رہے، اس کے پیشِ نظر، یہ اس لائق ہے کہ اسے ضائع ہونے سے بچایا جائے۔

اپنے گھر کے ماحول اور تعلیم کے زیرِ اثر ساری عمر صوم و صلوٰۃ کے پابند رہے۔

۱۹۶۱ء میں حج بھی کیا تھا۔ اخیر تک ایامِ رمضان میں مساجد میں تراویح پڑھاتے رہے۔ غرض متقی، پرہیزگار، پابندِ وضع بزرگ تھے۔

وہ اختلاجِ قلب کے مریض تھے۔ بدھ ۲۷ نومبر ۷۴ ۱۹ء (۱۲ ذی قعدہ ۱۳۹۴ھ) دن کے گیارہ بجے مرض کا شدید حملہ ہوا، جس سے جانبر نہ ہو سکے۔ اسی دن مغرب، کے قریب مسلم قبرستان، کامٹی میں تدفین عمل میں آئی۔ حکیم عزیز قدوسی کامٹوی نے قطعۂ تاریخِ وفات کہا:

اٹھ گئے، بزمِ جہاں سے افسوس	ناز تھا اہلِ سخن کو، جن پر
ازسرِ آہ، کہا دل نے، عزیز!	"حیف جاتے رہے حافظ انور"
ز ا +	۱۹۷۳ = ۱۹۷۴ء)

صلبی اولاد میں چار بیٹے اور دو بیٹیاں اپنی یادگار چھوڑیں۔

انور مرحوم بسیار گو نہیں تھے، لیکن جو بھی کہا، خوب کہا۔ تعجب ہوتا ہے کہ کامٹی کے سے غیر شاعرانہ ماحول میں وہ اتنے کامیاب شاعر کیونکر ہو گئے، واقعی یہ خدائے بخشندہ کی دین ہے۔ "تجلیاتِ انور" سے چند شعر ملاحظہ ہوں:

جانا بھی چاہتا ہوں تری بزمِ ناز سے
پھر یہ بھی سوچتا ہوں کہ جا یا نہ جائیگا
دیوانگیِ شوق کا عالم جو ہے، یہی
انور سے ان کے سامنے جا یا نہ جائیگا

شبِ غم، شام سے گھبرا رہا ہوں	الٰہی! خیر، کیا انجام ہوگا!
کفن کیا باندھ لوں میں سر سے، انور!	سنا ہے، آج قتلِ عام ہوگا!

آیا وہ، اور دل کو لیا، لے کے چل دیا	ہم سوچتے ہی رہ گئے، یہ ماجرا ہے کیا!
کھا کر بھی سو فریبِ محبت ہوں مطمئن	یہ سحر کاریِ بتِ رنگیں ادا ہے کیا!

اس کو تری محفل میں، تری دید سے ہے کام
کون آیا، گیا کون، یہ انور کو خبر کیا!

عبث گھبرا رہے ہو، قصۂ غم کی درازی سے
جہاں تک سن سکو گے تم، وہیں تک ہے بیاں اپنا

تم مہرباں تھے، تو زمانہ تھا مہرباں
تم مہرباں نہیں، تو کوئی مہرباں نہیں

آئی بھی بہار انور! رخصت بھی ہوئی کب کی
اب تک ہے گریباں سے الجھا ہوا سودائی

دو دن کی زندگی بھی بڑی چیز ہے، مگر
جینا ہی جب نہ آئے، تو پھر کیا کرے کوئی!

گتھیاں سلجھائیں سب نے، کچھ بنا لیکن نہ کام
راز تھی پہلے بھی دنیا، اور اب بھی راز ہے

وہی میں ہوں، جو تھا ناکام شرحِ آرزو اک دن
وہی میں ہوں، جسے کہتا تھا ہر اک بے زباں پہلے

یہ سوچتے ہی سوچتے، انور گزر گئے
اس زندگی میں کیجیے کیا، کیا نہ کیجیے

ہر درد کی، ہر غم کی دوا میرے لیے ہے
کیا نام ترا نام خدا میرے لیے ہے

تھوڑی سی پیش رفت بھی الفت میں ہے بہت
دل سے ملے نہ دل، تو نظر سے نظر ملے

شاہ معین الدین احمد ندوی

یوپی کے ضلع بارہ بنکی میں ایک مردم خیز قصبہ رُدولی ہے۔ یہاں سے بعض ایسی ہستیاں اٹھیں، جنھوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں امتیاز حاصل کیا اور آج تک ان کا نام عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔ انھیں میں صابریہ چشتیہ سلسلے کے بزرگ حضرت شیخ عبدالحق (ف: ۸۳۶ھ) بھی تھے۔ جن کے نام سے اہلِ دل کے سینے روشن اور ان کی محفلیں آج بھی گرم ہیں۔ رُدولی میں ان کا مزار مرجع الناس ہے۔ شاہ معین الدین احمد ندوی انھیں کے خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ یہ خاندان نسباً فاروقی ہے۔

شاہ صاحب ۱۹۰۳ء میں رَدولی میں پیدا ہوئے۔ گھر کی زمینداری تھی۔ ان کے والد شاہ حسنات احمد مرحوم مجذوب صفت بزرگ تھے۔ اسی لیے شاہ معین الدین اپنے نانا کی کفالت میں آ گئے۔ نانا شاہ شرف الدین تعلیمیافتہ اور قدردانِ علم ہونے کے باوجود یہ نہیں چاہتے تھے کہ یہ مزید تعلیم کے لیے گھر سے باہر جائیں۔ لیکن معین الدین احمد کی قسمت میں کچھ اور لکھا تھا۔ انھوں نے دستورِ زمانہ کے مطابق اردو اور فارسی کی ابتدائی کتابیں گھر پر پڑھیں اور مزید دینی تعلیم کے لیے لکھنؤ پہنچ گئے۔ یہاں متوسطات تک کی مدرسۂ نظامیہ، فرنگی محل میں تحصیل کی اور اس کے بعد تکمیل کے لیے ۱۹۲۲ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ لے لیا۔ اس عہد میں یہاں دارالعلوم میں ہر مضمون کا استاد اپنے

فن کا ماہر، تقریر و تحریر کے میدان کا شہسوار، طلبہ کا دلی ہمدرد تھا۔ نوجوان طالبعلم نے اسی علمی ماحول سے اور اپنے اساتذہ سے بھرپور استفادہ کیا۔ اس زمانے میں مولانا عبدالرحمٰن نگرامی (ف: مارچ ۱۹۲۶ء) دارالعلوم میں تفسیر کے استاد تھے۔ عجیب و غریب آدمی تھے، یہ مولانا نگرامی۔ علم و فضل کا شعلۂ جوالہ! افسوس کہ یہ آبگینہ جلد ہی تندیٔ صہبا سے پگھل کر صرف ۲۷ برس کی عمر میں آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ شاہ معین الدین احمد ان کے چہیتے شاگرد تھے۔ نگرامی مرحوم نے ان میں جوہرِ قابل دیکھا، تو ۱۹۲۴ء میں اُن کے دارالعلوم سے فارغ ہونے پر، انھیں اپنے استاد مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم (ف: نومبر ۱۹۵۳ء) ناظم دارالمصنفین کے پاس لوا لے گئے۔ کیا شبھ گھڑی تھی وہ جب ۲۱ سالہ نوجوان شاہ معین الدین احمد نے دارالمصنفین کے احاطے میں قدم رکھا تھا۔ جو رشتہ اس دن سے قائم ہوا، وہ پچاس سال کے بعد موت کے ساتھ ٹوٹا۔

مولانا سید سلیمان نے انھیں تربیت کے لیے (۲۵ روپے مشاہرے پر) رفیق مقرر کر دیا۔ آہستہ آہستہ انھیں لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ دارالمصنفین نے سیرۃ النبوی کی تالیف کے بعد صحابہ کے حالات کی تدوین شروع کی تھی۔ اس کی ابتدائی دو جلدیں "خلفائے راشدین" اور "مہاجرین" (حصہ اول) مولانا حاجی معین الدین ندوی (ف: ۱۹۴۱ء) نے مرتب کی تھیں۔ اب انھیں کے ہمنام شاہ معین الدین احمد جوان کے ہاتھ لگے، تو سید سلیمان ندوی مرحوم نے اسے فالِ نیک خیال کیا اور اس سلسلے کی تکمیل ان کے سپرد کر دی۔

شاہ صاحب مرحوم نے اس سلسلے میں "مہاجرین" (جلد دوم) لکھی؛ پھر "تابعین" لکھی؛ پھر صحابہ غیر مہاجر و انصار کی سیرت لکھی۔ اسی زمانے میں وسعتِ مطالعہ سے انھیں تاریخ اسلام لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ انھوں نے آغاز سے خلافتِ بنو عباس کے اختتام تک، چار جلدوں میں یہ سلسلہ مکمل کیا۔ یہ

کتاب بہت مقبول ہوئی۔ متعدد یونیورسٹیوں اور کالجوں کے نصاب میں شامل ہے اور اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

ان کے علاوہ ان کی بعض کتابیں یہ ہیں: "اسلام اور عربی تمدن" (عربی سے ترجمہ)، "عرب کی موجودہ حکومتیں"، "دین رحمت"، حیاتِ سلیمان (مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کی سوانح عمری)، "ادبی نقوش" (مجموعہ مضامین)۔ انھوں نے ۱۹۶۹ء یا ۱۹۷۰ء میں دار العلوم ندوۃ العلما میں "اقبال کی شاعری" کے موضوع پر توسیعی خطبات بھی دیے تھے؛ یہ شاید ہنوز کتابی شکل میں شائع نہیں ہوتے۔

معارف کے شذرات وہ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے بھوپال چلے جانے کے بعد ہی سے مستقلاً لکھنے لگے تھے۔ ان کی تحریر کی سلاست اور متانت، پختگی اور اصابت رائے کے سب قائل تھے۔ سخت سے سخت بات بھی ایسی نرمی اور سادگی سے کہہ جاتے تھے کہ بڑے سے بڑا مخالف بھی اس پر انگلی نہیں رکھ سکتا تھا۔

وہ تمام تصنیفی کاموں میں سید سلیمان ندوی مرحوم کے دستِ راست رہے۔ ۱۹۴۵ء میں مولانا ندوی مرحوم بعض مقامی حالات سے دل برداشتہ ہو گئے۔ انھیں ایام میں نواب محمد حمید اللہ خان والیِ بھوپال (ف: فروری ۱۹۶۰ء) نے انھیں اصرار سے اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔ اس پر مولانا سید سلیمان کو اعظم گڑھ چھوڑ کر بھوپال جانا پڑا۔ وہ وہاں قضائتِ اعلیٰ کے منصب پر، نیز دینی اور مذہبی امور کے منصرم بن کر گئے تھے۔ ان کی عدم موجودگی میں شاہ صاحب مرحوم نے دار المصنفین کا نظم ونسق اور معارف کی ادارت کی ذمے داری جس خوش اسلوبی سے سرانجام دی، اس پر استاد نے خوشنودی کی سند دی، اور تحسین کا اظہار کیا۔ پھر ۱۹۵۱ء میں جب سید صاحب مستقل طور پر ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے، تو اب اس تاریخی ادارے کا سارا بار ان

کے اور ان کے رفیقِ کار سید صباح الدین عبد الرحمٰن کے کندھوں پر آپڑا۔ اور خدا کا شکر ہے کہ وہ اس سے بوجہِ احسن عہدہ بر آ ہوتے۔ اسی کا شاندار نتیجہ دار المصنفین کا جشنِ زرّین تھا، جو فروری ۱۹۶۴ء میں نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم (ف: مئی ۱۹۶۹ء) کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اور جس میں ملک بھر کے علماء اور اہلِ علم نے شرکت کی تھی۔

سیر چشمی، اقربا پروری، استغنا، توکل اُن کے کردار کے اجزائے ترکیبی تھے۔ ۱۹۲۴ء میں مشاہرہ محض ۲۵ روپے مقرر ہوا، تو وہ اسی میں خوش تھے۔ آخر میں بڑھتے بڑھتے یہ ۴۰۰ سو تک پہنچا، تو بھی انھوں نے کسی طمطراق اور نمایش کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اس اثنا میں بڑے بڑے مشاہرے پر باہر سے بلاوے آئے۔ مدرسۂ عالیہ، کلکتہ نے بلایا، جامعہ ملّیہ اسلامیہ، نئی دلّی نے اپنے یہاں آنے کی دعوت دی۔ لیکن اس مردِ خدا نے یک درگیر و محکم گیر کے اصول پر عمل کرتے ہوئے اپنے استاد اور دادا استاد کی یادگار کو سینے سے لگائے رکھا، اور سب کو جواب دے دیا۔ ہر مہینے اپنی آمدنی کا ایک حصّہ اپنے اعزّہ اور دوسرے مستحق اصحاب کے لیے الگ کر دیتے تھے۔ ۱۹۶۹ء میں صدرِ جمہوریہ ہند کی طرف سے عربی کی سندِ اعزاز ملی، جس کے ساتھ تین ہزار سالانہ کا وظیفہ بھی ملتا ہے، تو اس کا بیشتر حصّہ بھی اسی طرح تقسیم ہوتا رہا۔ ان کے والد بہت زرعی زمین چھوڑ مرے تھے۔ شاہ صاحب مرحوم نے اپنے حصے کی زمین چھوٹے بھائی شاہ امام احمد کو ہبہ کر دی کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں، اور تمھارے پاس کوئی اور ذریعۂ معاش نہیں ہے۔ عمر کے ساتھ استغنا کا یہ رنگ اور گہرا ہو گیا تھا۔ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی (سہارنپور) امیر تبلیغی جماعت سے بیعت تھے اور اس جماعت کا جو رنگ ہے، اسے جاننے والے جانتے ہیں۔ دو مرتبہ (۱۹۶۶ء و ۱۹۷۳ء) حج بیت اللہ کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔

ان کی پہلی شادی رُدولی کی مشہور شخصیت شاہ مصطفیٰ احمد کی چھوٹی صاحبزادی عشرت النسا بیگم سے (جو کسی زمانے میں بھوپال میں اکاونٹنٹ جنرل تھے) عنفوانِ شباب میں ہو گئی تھی، لیکن جلد ہی یہ خاتون ایک لڑکا اپنی یادگار چھوڑ کر ۱۱ دسمبر ۱۹۲۵ء (۲۵ جمادی الاوّل ۱۳۴۴ھ) کو انھیں داغِ مفارقت دے گئیں۔ چندے بعد دوسری شادی شیخ منظور الحق نعمانی کی صاحبزادی وحی النسا سے ہوئی۔ لیکن یہی حادثہ پھر پیش آیا۔ ان کا ۳۰ دسمبر ۱۹۳۶ء کو انتقال ہوا۔ گھر والوں نے بہت کوشش کی کہ وہ پھر تاہل کا جُوا گلے میں ڈال لیں۔ اس وقت عمر بھی ۳۵ برس کی رہی ہو گی۔ لیکن اس اللہ کے بندے نے کسی کی ایک نہ سنی، اور پھر نکاح نہیں کیا۔ ان بیویوں سے دو بچے (ایک لڑکا اور ایک لڑکی) تھے۔ انھیں پالا پوسا اور پروان چڑھایا۔ لڑکا شاہ ودود احمد اپنے بیوی بچوں کے ساتھ آج کل کراچی میں ہے، اور لڑکی (دادھیالی نام، غوثیہ؛ ناسخیالی، ثمر فاطمہ) اپنے گھر بار والی رُدولی ہیں۔ اس کی شادی اپنے خاندان ہی میں ایک جوانِ صالح چودھری اویس احمد سے کر دی تھی۔

صحت ہمیشہ ٹھیک رہی۔ ہاں، کبھی کبھی تنفّس کی شکایت کرتے تھے۔ ۱۹۷۲ء میں جب دار المصنّفین کا اجلاس بمبئی میں ہوا ہے، تو اچانک وہاں پہلی مرتبہ دل کی شکایت محسوس کی۔ لیکن اس پر کوئی تشویش نہیں ہوئی۔ آخری وقت بہت ہی دبے پاؤں آیا۔ جمعہ کے دن ۱۳ دسمبر ۱۹۷۴ء کو حسبِ عادت تمام معمولات سے فارغ ہوتے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد آنکھ لگ گئی۔ جاگے، تو عصر کی نماز کے لیے وضو کا پانی طلب کیا۔ کرسی سے اٹھنے لگے، تو گر گئے؛ اور پھر نہیں اٹھے۔ ڈاکٹر صاحب فوراً بلوائے گئے۔ انھوں نے دیکھ کر اعلان کیا کہ شاہ صاحب اپنے رفیقِ اعلیٰ کے حضور حاضر ہو چلے ہیں۔ اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہِ رَاجِعون۔

ان کی وصیّت کے مطابق میّت اگلے دن ان کے وطن رُدَولی گئی اور وہاں چودھری خلیل احمد کی مسجد کے احاطے میں آخری خوابگاہ نصیب ہوئی۔
آسماں تربت پہ تیری عنبر افشانی کرے۔

شبیر محمدؔ اختر گجراتی

میرے ہمعمر اور دوست اور ہموطن تھے۔ یعنی وہ بھی گجرات (موجودہ پاکستان) کے رہنے والے تھے، اگرچہ ۱۹۰۷ء میں پیدا لاہور میں ہوئے جہاں ان کے والد میاں محمد یوسف غالباً اوورسیر تھے، اور سر گنگا رام مرحوم (ف: جولائی ۱۹۲۷ء) کے دوستوں میں تھے۔ شبیر محمدؔ نے دسویں درجہ تک کی تعلیم زمیندارہ ہائی اسکول (موجودہ زمیندارہ کالج)، گجرات میں پائی۔ اس کے بعد انھوں نے پولیس ٹریننگ اسکول، پشاور میں داخلہ لے لیا، اور وہاں سے تربیت کی تکمیل کے بعد پولیس کے محکمے میں بھرتی ہو گئے۔

لیکن ان کا مذاق ادبی، بلکہ تعلیمی تھا، پولیس کی نوکری کب تک چلتی! تین چار سال تو گھر والوں کے مجبور کرنے پر کسی نہ کسی طرح کاٹے؛ بالآخر ۱۹۳۰ء میں استعفیٰ دے دیا، اور سال بھر بعد لاہور چلے آئے۔

وہ عقیدے کے لحاظ سے جماعتِ احمدیہ کی لاہوری شاخ سے متعلق تھے۔ چنانچہ لاہور آنے پر وہ اس انجمن کے دونوں پرچوں، ہفتہ وار "پیغام صلح" (اردو) اور ہفتہ وار "لائٹ" (انگریزی) میں کام کرتے رہے۔ یہاں سے نکل کر کچھ دن تک ماہنامہ "تہذیب النسواں" کے ادارۂ تحریر سے بھی رسمی طور پر وابستہ رہے۔ اسی زمانے میں انھوں نے ایک سلسلۂ مضامین بچوں کی نفسیات پر قلمبند کیا تھا؛ جو بہت مقبول ہوا تھا۔

انھوں نے نفسیات کا مطالعہ بطورِ خاص کیا تھا۔ لاہور میں انھوں نے ایک ادارہ قائم کیا تھا، جہاں وہ نفسیات کے موضوع پر طلبہ کو تعلیم دیتے تھے۔ اردو میں اس مضمون کی نصابی کتابیں ہی کتنی ہیں! چنانچہ یہ کمی پورا کرنے کو انھوں نے اسی زمانے میں چھوٹے چھوٹے رسالے لکھے، جنھیں وہ نصاب کے طور پر استعمال کرتے تھے۔

لاہور کے مسلسل قیام سے وہ وہاں کے علمی اور ادبی حلقوں میں اچھے خاصے متعارف ہو گئے، اور ان کے احباب کا حلقہ بھی وسیع ہو گیا۔

نظم و نثر دونوں میں درک تو حاصل تھا ہی، اب وہ رسالوں میں مضمون بھی لکھنے لگے۔ ان دنوں مولانا احسن اللہ خان تاجور نجیب آبادی کا ماہنامہ "شاہکار" بڑے ٹھسّے سے نکلتا تھا۔ اختر ایک دن اس کے دفتر گئے۔ مولانا تاجور ابھرتے ہوئے ادیبوں کی حوصلہ افزائی کرنے اور انھیں آگے بڑھانے میں بڑی مسرّت محسوس کرتے تھے۔ انھوں نے اختر کی صلاحیتوں کا اندازہ کر کے انھیں "شاہکار" کا نائب مدیر مقرر کر دیا۔ مولانا تاجور کا جب جنوری ۱۹۵۱ء میں انتقال ہو گیا، اور شاہکار بھی بند ہو گیا، تو اس کے بعد اختر پنجاب کے مشہور ماہنامے "ہمایوں" کے ادارے سے منسلک ہو گئے۔ یہاں وہ ۱۹۴۸ء تک رہے۔

اس دوران میں بھی ان کا مدرسۂ نفسیات بدستور جاری رہا۔ ۱۹۴۴ء میں انھوں نے اس موضوع پر اپنے دو ماہانہ رسالے شروع کیے: (۱) "نفسیات" اور (۲) نفسیاتی جائزے"۔ یہ دونوں پرچے مدتوں باقاعدگی سے چھپتے رہے۔

اب ان کی ادبی حیثیت مسلّم ہو چکی تھی۔ ۱۹۴۸ء میں وہ ہفتہ وار "قندیل" (لاہور) کے مدیر مقرر ہو گئے۔ اور ۱۹۷۰ء تک اس رسالے کو مرتب کرتے رہے۔ اس میں وہ ہر ہفتے "میں دیکھتا چلا گیا" کے عنوان سے ایک کالم "تماشائی" کے قلمی نام سے لکھتے تھے۔ یہ سب حلقوں میں بہت مقبول ہوا۔ اس میں لاہور

اور صوبے کی ہفتے بھر کی ادبی، سماجی، سیاسی سرگرمیوں پر ہلکے پھلکے انداز میں تبصرہ کرتے۔ ان کی زبان سلیس، سادہ اور بڑی جاندار تھی۔ مولوی عبدالحق مرحوم تک اُن کی زبان کے معترف اور مدّاح تھے۔

وہ حلقۂ اربابِ ذوق اور رائٹرز گلڈ کے بنیادی اراکین میں سے تھے، اور حلقے کے جلسوں میں خاص طور پر مستعدی سے شریک ہوتے تھے۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ حلقے میں حاضری دینے والے ادیبوں کا کلام نظم و نثر انھیں بآسانی "قندیل" میں اشاعت کے لیے مل جاتا۔ یوں اس عہد کے بیشتر قابلِ ذکر ادیبوں کے مضامین اور منظومات "قندیل" میں چھپتی رہیں اور پرچے کا معیار اپنے معاصرین کے مقابلے میں بہت بلند ہوگیا۔ وہ اپنے مستقل کالم (میں دیکھتا چلا گیا) کے علاوہ بھی افسانے، ڈرامے اور مضامین لکھتے رہتے تھے۔ ان کی تقریریں ریڈیو سے بھی نشر ہوتی رہتی تھیں۔

۱۹۷۱ء میں ان پر پہلی مرتبہ فالج کا شدید حملہ ہوا، اور وہ بہت دن تک نقل و حرکت سے معذور رہے۔ بارے، باقاعدہ علاج سے کچھ چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے۔ لیکن اس سے کمزوری اتنی ہوگئی کہ پھر انھیں کامل صحت کا ایک دن بھی دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ اکتوبر ۱۹۷۴ء کے اواخر میں ان پر پھر فالج گرا۔ اب کے علاج کے لیے یونائیٹڈ کرسچین اسپتال چلے گئے۔ دو مہینے بعد وہیں اسپتال میں ۳۰ دسمبر ۱۹۷۴ء علی الصباح رہگرائے عالمِ جاودانی ہو گئے۔ جنازہ اسی دن اٹھا اور قبرستان میانی صاحب میں سپردِ خاک ہوئے۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔ بیوہ کے علاوہ دو بیٹے اور چھ بیٹیاں اپنے سوگواروں میں چھوڑے۔

مرحوم اپنی سخن فہمی اور بذلہ سنجی، سیرچشمی اور وضعداری کے لیے مشہور تھے۔ جن ایام میں "قندیل" کے مدیر تھے، کئی جگہ سے زیادہ تنخواہ پر ملازمت کی پیشکش ہوئی، لیکن انھوں نے ہمیشہ انکار کیا۔ پروفیسر محمد سرور (جامعی) جنھوں نے

مولانا عبید اللہ سندھی پر خاصا کام کیا ہے، اختر مرحوم کے ماموں ہیں۔ محمد سرور صاحب نے کسی زمانے میں حمید نظامی مرحوم کے "نوائے وقت" کے جواب میں اپنا روزنامہ "آفاق" جاری کیا تھا۔ انھوں نے معقول تنخواہ پر اختر کو بھی اس کے ادارۂ تحریر میں شمولیت کی دعوت دی۔ محمد سرور صاحب نے خیال کیا کہ اختر میرا بھانجا ہے اور تنخواہ بھی معقول، بھلا اسے قبول کرنے میں کیا عذر ہو گا! لیکن انھیں بھی مایوسی ہوئی۔ اختر نے اپنی وضعداری نباہی اور "من لب ستم حنائے قناعت بپائے خویش" کہتے ہوئے "قندیل" میں جمے رہے۔

ایک اور بات! اختر ان کا تخلص نہیں تھا، نہ وہ شعر کہتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی نے پوچھا: "اختر صاحب! آپ شعر نہیں کہتے، تو نام کے ساتھ یہ تخلص کیوں لگا رکھا ہے؟" کہنے لگے: "اختر تخلص نہیں ہے، بلکہ سیّد انبیا علی تاج قسم کی چیز ہے، انھوں نے بھی تو کبھی شعر نہیں کہا۔ بات دراصل یہ ہے کہ شبیر محمد قسم کے نام کچھ فوجی اور جنگجو حضرات ہی کو زیبا دیتے ہیں۔ میں نے التباس سے بچنے کی خاطر اپنے نام کے ساتھ اختر کا اضافہ کر لیا۔"

انھوں نے کوئی پچاس کے قریب کتابیں چھوڑی ہیں۔ ان میں نفسیاتی موضوعات ہیں، تراجم ہیں، افسانے ہیں، ڈرامے (اردو اور پنجابی) ہیں، تاریخ اسلام ہے۔ لیکن ادیب اور مصنف سے بھی وہ بلند تر انسان تھے۔ با اصول، مرنجان مرنج، دوستوں کے ہمدرد اور کنبہ پرور۔ دعا ہے کہ خداوندِ تعالیٰ ان سے عفو و کرم کا سلوک کرے۔ آمین!

چغتائی، عبدالرحمٰن (خان بہادر)

کون ہے جس نے جامع مسجد اور لال قلعہ یا تاج محل، آگرہ کا نام نہ سنا ہوگا! لیکن یہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ان عالیشان اور شہرۂ آفاق عمارتوں کے نقشے لاہور کے دو فنکاروں نے تیار کیے تھے؛ ان کے نام تھے: احمد اور حامد۔ یہ دونوں سگے بھائی تھے۔ عہدِ شاہجہانی کے موّرخوں نے ان کے نام استاد العصر احمد اور نادر العصر حامد لکھے ہیں۔ ان کے نام سے منسوب "کوچہ اُستا حامد" آج بھی ان کی یاد تازہ کرنے کو موجود ہے۔ فنِ عمارت اس خاندان میں نسلاً بعد نسل قائم رہا۔ مہاراجا رنجیت سنگھ کے میر عمارت بابا صدرالدین چغتہ اسی خاندان کے نام لیوا تھے۔ ان کے بیٹے میاں رحیم بخش تھے اور میاں رحیم بخش کے میاں کریم بخش چغتہ۔ یہ دونوں باپ بیٹے بھی میر عمارت اور معمار تھے۔ میاں کریم بخش کا ۱۹۱۳ء میں انتقال ہوا۔ ۶۰ سال سے زیادہ عمر پائی۔
میاں کریم بخش چغتہ کے تین بیٹے: عبدالرحمٰن، عبداللہ اور عبدالرحیم ہوتے۔ یہی عبدالرحمٰن ہمارے مشہور مصوّر اور فنکار عبدالرحمٰن چغتائی ہیں، جن کا ۱۷ جنوری ۱۹۷۵ء کو لاہور میں انتقال ہوا۔ عبداللہ علمی حلقوں میں ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی کے نام سے معروف ہیں، اور ان کا نام سوانحِ اقبال میں متعدد مقام پر آتا ہے۔ انھوں نے سوربون یونیورسٹی (پیرس) سے تاج محل کے موضوع پر اپنے مقالے سے ڈاکٹریٹ کی سند لی تھی۔ عبدالرحیم سب سے

چھوٹے ہیں۔ انھوں سے ساری عمر بڑے بھائی عبدالرحمٰن چغتائی کی معیت اور خدمت میں گزار دی۔

عبدالرحمٰن چغتائی لاہور میں ۲۱ ستمبر ۱۸۹۹ء کو پیدا ہوئے۔ ان کی بسم اللہ مسجد میں ہوئی۔ یہاں انھوں نے قرآنِ ناظرہ ختم کیا۔ بعض سورتیں جو انھیں آخر تک حفظ تھیں، وہ اسی ابتدائی تعلیم کا نتیجہ تھا۔ مسجد کی مکتبی تعلیم کے ساتھ ہی ان کے والد نے انھیں اپنے بہنوئی میاں میراں بخش نقاش (بن بابا عمر الدین نقاش) سے نقاشی اور مصوری کے اسباق لینے کی ہدایت کی تھی۔ میاں میراں بخش نقاش اپنے فن کے ماہر اور اس حیثیت سے سرکاری حلقوں میں بھی معروف تھے۔ حکومت نے ان کی عظمتِ فن کے اعتراف میں انھیں مسجد وزیر خان (لاہور) میں حجرے عطا کیے تھے۔ اس زمانے میں یہ حجرے مصوروں، نقاشوں، خطاطوں کو حکومت کی طرف سے اعزاز و اکرام کے طور پر دیے جاتے تھے۔ بابا میراں بخش نے بعمر ۱۱۵ سال ۱۹۲۰ء میں وفات پائی۔ وہ لاہور کے قبرستان بی بی پارک دامن میں دفن ہوئے۔ عبدالرحمٰن چغتائی میو اسکول جانے تک ان سے مستفیض ہوتے رہے تھے۔

مسجد سے فارغ ہو کر ان کا ریلوے ٹکنیکل اسکول، لاہور میں داخلہ ہوا۔ چھٹے درجے کے بعد تعلیم کا یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ چندے پتنگ بازی اور آوارہ گردی کرنے کے بعد انھوں نے پھر اسی اسکول سے ۱۹۱۱ء میں پرائیوٹ طور پر مڈل (آٹھویں درجے) کا امتحان پاس کیا۔

خاندانی روایت کے پیشِ نظر؛ فن اور آرٹ ان کے خون میں تھے۔ مڈل اسکول امتحان کے بعد انھوں نے خود بخود میو اسکول آف آرٹ، لاہور میں داخلہ لے لیا۔ اس زمانے میں یہاں ڈرائنگ، نقشا سازی (ڈرافٹ مینی)، لوہاری اور لکڑی کے کام کی تعلیم کا خاصا انتظام تھا۔ عبدالرحمن چغتائی آخری درجے کے امتحان (۱۹۱۴ء) میں صوبے بھر میں اوّل آئے تھے۔

میو اسکول کے امتحان میں کامیابی کے بعد اوّلاً انھوں نے کرسچین ہائی اسکول گوجرانوالہ میں ڈرائنگ ماسٹر کی نوکری اختیار کر لی۔ لیکن یہاں ان کا دل نہیں لگا۔ گوجرانوالہ میں وہ صرف چند مہینے رہے، اور استعفیٰ داخل کر کے واپس لاہور چلے آئے۔ ان کی مادرِ علمی (میو اسکول) نے محسوس کیا کہ ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانا چاہیے، چنانچہ اسکول میں فوٹو لیتھوگرافی کا درجہ کھولا گیا جس کے انچارج چغتائی صاحب مقرر ہوئے۔ وہ اس عہدے پر ۱۹۲۴ء تک رہے اور پھر مستعفی ہو گئے۔ اس کے بعد عمر بھر کہیں ملازمت نہیں کی۔

یہ میاں میراں بخش نقّاش کی تربیت ہی کا اثر تھا کہ انھوں نے عنفوانِ شباب میں مصوّری شروع کر دی۔ چنانچہ پنجاب فائن آرٹ سوسائٹی، لاہور کی نمائش منعقدہ ۱۹۱۹ء میں چغتائی کی آب رنگی تصاویر کا بھی سراغ ملتا ہے لیکن ابھی تک ان کی مصوّری کی شہرت ان کے احباب ہی تک محدود تھی، اور عوام سے متعارف نہیں ہوئے تھے۔ ان کی شہرت کے عام کرنے میں پروفیسر (ڈاکٹر) محمد دین تاثیر (ف: نومبر ۱۹۵۰ء) اور ماہنامہ نیرنگِ خیال کا بہت ہاتھ ہے۔ بلکہ صحیح یہ ہے کہ نیرنگِ خیال کے شروع کرنے والے ہی تاثیر اور چغتائی تھے۔ اس کی داغ بیل تاثیر کے مکان ہی پر پڑی، اور انھیں نے حکیم یوسف حسن کو یہ پرچہ جاری کرنے کا مشورہ دیا، چونکہ ان کے پاس سرمایہ تھا، جسے وہ اس کے اخراجات کے لیے لگا سکتے تھے۔ ہاں، بعد کو دوسرے احباب (نیاز مندانِ لاہور) سے بھی مشورہ کیا گیا تھا اور سب نے دستِ تعاون بڑھانے کا وعدہ کیا۔ نیرنگِ خیال وسط ۱۹۲۴ء میں جاری ہوا اور اس کے پہلے ہی شمارے میں چغتائی کی بنائی ہوئی ایک تصویر شامل تھی۔ اس کے بعد بھی وہ باقاعدگی سے اپنی تخلیقات نیرنگِ خیال میں شائع کرتے رہے۔ غرض کہ یہ حقیقت ہے کہ اگرچہ چغتائی پہلے سے مصوّری کر رہے تھے، لیکن وہ عوام سے نیرنگِ خیال ہی کے ذریعے سے متعارف ہوئے۔ تاثیر نے ان کے فن اور تکنیک کے بارے میں اور ان کی

خوبیوں اور خصوصیتوں کی وضاحت کے لیے متعدد مضامین لکھے۔ یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ تاثیر نے محض چغتائی کے آرٹ پر لکھنے اور اس کی باریکیوں کو اجاگر کرنے کی خاطر یورپ کے بڑے بڑے مصوّروں اور فنونِ لطیفہ کے ماہروں کی تخلیقات اور تصنیفات کا غائر مطالعہ کیا تھا، تاکہ وہ چغتائی کے فن پر کماحقہٗ لکھ سکیں اور دوسرے عالمی مصوّروں کے ساتھ ان کا مقابلہ کرکے ان کے مابہ الامتیاز پہلو دکھا سکیں۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اگرچہ چغتائی نے اصول کی حد تک تو اپنے بزرگ میاں میران بخش سے ضرور استفادہ کیا، لیکن اس کے بعد اس میدان میں انھوں نے جو فتوحات حاصل کیں اور دنیائے تصویر و فن کے خزانے میں جو بیش بہا اضافہ کیا، وہ سرتاسر ان کا ذاتی کارنامہ اور ان کے اپنے زورِ بازو کا ثمرہ تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے محسوس کیا کہ جب تک میں عالمی شاہکاروں کا قریبی اور غائر مطالعہ، اور معاصر مصوّروں اور فنکاروں اور نقادوں سے بالمشافہہ تبادلۂ خیال نہیں کرتا، میرے فن میں وسعت اور عالمگیریت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اسی مقصد کے لیے انھوں نے ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۶ء میں دو مرتبہ یورپ کا سفر کیا۔ پہلے سفر میں ان کے چھوٹے بھائی محمد عبداللہ چغتائی بھی ان کے ساتھ گئے تھے۔ اسی زمانے میں علامہ اقبال بھی گول میز کانفرنس کے سلسلے میں لندن میں مقیم تھے۔ اقبال نے اپنے مشوروں سے مستفیض کیا اور مختلف اکابر سے ان کی ملاقات میں بھی راہنمائی کی۔

ان سفروں میں انھوں نے یورپ کے تمام بڑے بڑے شہروں اور وہاں کے عجائب گھروں اور تصویر خانوں کی سیر کی اور ان کے مہتمموں سے ملے۔ نیز مختلف مقامات کے وہ حسین مناظر بنظرِ غائر دیکھے، جو اکثر مصوّر اپنی تخلیق کے لیے پس منظر کے طور پر استعمال کرتے رہے ہیں۔ انھیں سفروں میں وہ یورپ کے مشاہیرِ علم و فن اور مقتدر مصوّروں سے بھی ملے۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ

ان سفروں اور ملاقاتوں کا ان کے فن کی بالیدگی اور پختگی، اور شخصیت کی تشکیل اور رچاؤ میں کتنا ہاتھ رہا ہوگا۔

یورپ سے واپسی کے بعد انھوں نے اپنے فن میں تانبے کی پلیٹ پر لوہے کے قلم سے تصویر بنانے (یعنی ایچنگ: Etching) کا اضافہ کیا۔ اب تک ان کی توجہ زیادہ تر خطوط پر مبذول رہی تھی۔ یہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ محض خطوط کے پیچ وخم سے جیتی جاگتی تصویر بنا دینے میں ان کا کوئی حریف نہیں اور اس کا راز ان کی ڈرائنگ کے فن پر غیر معمولی قدرت میں پوشیدہ ہے۔ یہی کام انھوں نے ایچنگ سے لیا۔ یاد رہے کہ ان سے قبل کسی ہندوستانی مصوّر نے فن کی اس شاخ کا ایسا بھرپور نمونہ پیش نہیں کیا تھا؛ اس کا سہرا صحیح معنوں میں چغتائی کے سر ہے۔

اب ان کا بجا طور پر ہندستان کے صفِ اوّل کے مصوّروں اور فنکاروں میں شمار ہونے لگا۔ ۱۹۳۴ء میں حکومتِ وقت نے ان کی خدمات کا اعتراف "خان بہادر" کے خطاب سے کیا۔ یہاں غالبًا ایک بات کا ذکر بےمحل نہیں ہوگا۔ انگریزی عہد میں یہ خطاب بالکل سیاسی نوعیت کے تھے۔ اور بالعموم حکومت کے چیلے چانٹوں اور جی حضوریوں تک محدود "خان صاحب" البتہ ایک آدھ مرتبہ غیر سیاسی اور علمی وادبی افراد کے حصّے میں بھی آچکا ہے۔ لیکن چغتائی کو یہ خطاب محض اپنی فنّی اور ادبی خدمات کی وجہ سے ملا۔ ان سے پہلے جن چند غیر سیاسی اشخاص کو اس طرح کا خطاب ملا تھا، ان میں علامہ اقبال اور رابندر ناتھ ٹیگور کے نام نمایاں ہیں۔

پاکستان کے وجود میں آجانے کے بعد ۱۹۶۰ء میں وہاں کی حکومت نے انھیں "ہلالِ امتیاز" کے اعزاز سے نوازا۔ ۱۹۶۴ء میں مغربی جرمنی کے سابق صدر ڈاکٹر ہنرک لیبکے پاکستان کے دورے پر آئے تھے۔ انھوں نے چغتائی سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ لہٰذا اگلے دن جب موصوف علامہ اقبال کا مزار دیکھنے گئے،

تو ان کی خواہش کے مطابق وہاں ان سے چغتائی کا تعارف کرایا گیا۔ ڈاکٹر لبکے، چغتائی کے فن کے بڑے مداح تھے۔ چنانچہ انھوں نے خاص طور پر اپنے وزیر والٹر شیل کو (جو بعد کو صدر مغربی جرمنی بنے) چغتائی کے مسکن (راوی روڈ) پر ان کی خدمت میں سونے کا تمغہ پیش کرنے کو بھیجا، جو گویا مغربی جرمنی کی طرف سے ان کی فنّی میدان میں خدمات کا اعتراف تھا۔

ان کی چھ کتابیں فن اور تصویر کے موضوع پر شائع ہوئی ہیں۔ سب سے پہلے ۱۹۲۸ء میں مرقع چغتائی'' منصۂ شہود پر آئی، جس میں غالب کے کلام کو تصویروں کے پیکر میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ان کی شہرت کا سنگِ بنیاد ثابت ہوئی۔ اس کا مقدمہ علامہ اقبال نے لکھا تھا۔ اس میں ۴۲ رنگین اور دس سادہ تصویریں ہیں۔ اس کا ایک خاص ایڈیشن شائع ہوا تھا۔ جس کی قیمت ۱۲۵ روپے فی نسخہ تھی اور ایک عام جو سترہ روپے میں بکا تھا۔ دونوں میں کاغذ کے تفاوت کے علاوہ اور کوئی فرق نہیں تھا۔ اس سلسلے میں لطیفہ یہ ہے کہ اعلان کیا گیا تھا کہ اعلیٰ ایڈیشن جرمنی میں چھپا ہے، حال آں کہ یہ لاہور ہی میں چغتائی صاحب کے مکان (واقعہ کوچۂ چابک سواراں، لاہور) میں خاص مشین سے طبع ہوا تھا۔ اس کی دیدہ زیب کتابت اور اعلیٰ معیارِ طباعت اور تجلید وغیرہ سے سب لوگ دھوکا کھا گئے۔ اس کام میں ان کے سب سے چھوٹے بھائی عبدالرحیم چغتائی ان کے دستِ راست اور ہر طرح ممد و معاون رہے۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ عبدالرحیم صاحب نے اپنی پوری زندگی بڑے بھائی کی خدمت کے لیے وقف کر دی۔ عبدالرحمٰن چغتائی کو اپنے تخلیقی کام کے سوا اور کسی کام سے کام نہیں تھا۔ اس کے بعد تصاویر پر چوکھٹے لگوانا، انھیں نمائشوں میں بھیجنا اور واپس منگوانا، کتابوں کا شائع کرنا، ان کی تقسیم اور نکاسی کی نگرانی ـــــ غرض سب کام عبدالرحیم صاحب کی نگرانی میں ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ گھر بار کے سب اخراجات بھی انھیں کے ہاتھوں

سر انجام ہوتے تھے۔
"مرقعِ چغتائی" کے سلسلے میں ایک اور بات بھی قابلِ ذکر ہے۔ جب یہ کتاب شائع ہوئی، تو اس کی تمام اصلی تصاویر سر اکبر حیدری نے نظام پیلس (حیدرآباد ہاوس) نئی دلی میں لگانے کے لیے لے لی تھیں۔ لیکن جب شہزادی درِ دانہ (نظام عثمان علی خان مرحوم کی بڑی بہو اور نواب اعظم جاہ ولی عہد کی بیگم) نے انھیں دیکھا، تو فرمایا کہ تصاویر نئی دلّی نہ بھیجی جائیں، میں انھیں اپنے محل میں لگاؤنگی۔ خدا معلوم، اب وہ کہاں ہیں!
"نقشِ چغتائی"، ان کا دوسرا کارنامہ تھا۔ یہ کتاب ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی۔ اس میں غالب کے کچھ اور اشعار کو مصوّر کیا گیا ہے۔ یہ بھی بڑے اہتمام سے نکلی، بکرم کی لچکدار جلد اور بڑھیا کاغذ، ہر صفحے کی جدول کی تزیین اور دو رنگی چھپائی۔ اس میں کل ۱۹ تصویریں ہیں، جن میں سے صرف ایک رنگین ہے، بقیہ سب سادہ، سپید و سیاہ ہیں۔
اسی "نقشِ چغتائی" کا دوسرا ایڈیشن (نقشِ ثانی) غالباً ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا۔ (تاریخ درج نہیں) یہ پہلے ایڈیشن سے بہت مختلف ہے، تصویروں میں بھی تفاوت ہے اور ان کی تعداد میں بھی۔ اس میں چھ رنگین تصویریں ہیں اور سولہ، سادہ، سپید و سیاہ۔ اسی دوسرے ایڈیشن کا ہو بہو چربہ تیسری مرتبہ ۱۹۶۵ء میں چھپا۔
اس کے بعد ان کی یہ کتابیں شائع ہوئیں:

۱۔ تصاویرِ چغتائی: ۱۹۳۶ء
۲۔ ہندی تصاویرِ چغتائی: ۱۹۵۲ء (اس کا ایک مختصر ایڈیشن بہت پہلے دلّی کی ایک فرم نے شائع کیا تھا)۔
۳۔ عملِ چغتائی: ۱۹۶۸ء
۴۔ تیمور کا گھرانا: ۱۹۷۲ء

عملِ چغتائی میں کلامِ اقبال کو مصوّر کیا ہے، جس طرح پہلی دو کتابیں مصوّر کلامِ غالب ہے۔ کلامِ اقبال کو مصوّر کرنے کی خواہش خود علامہ اقبال نے "مرقعِ چغتائی" کی اشاعت کے بعد ظاہر کی تھی۔ چغتائی نے ۱۹۴۰ء میں اس پر کام شروع کیا تھا؛ اس کی تکمیل کہیں ۲۵ برس بعد ہوئی۔ یہ بڑے سائز (۵/۱ x ۱۲/۱) کے ۴۵۰ صفحات کی کتاب ہے؛ اس میں ۴۰ چار رنگی تصاویر ہیں اور ۴۲ یک رنگی؛ شروع میں جسٹس سر عبدالرحمٰن کا دیباچہ ہے۔ کتاب بہت اہتمام سے شائع ہوئی ہے اور ہر طرح سے اقبال اور چغتائی دونوں کے شایانِ شان ہے۔ مرحوم کہتے تھے کہ اس کی تیاری اور طباعت پر تین لاکھ روپیہ صرف ہوا ہے۔ ابتداً میں اس کا ۷۵ جلدوں کا ایک خاص ایڈیشن بھی شائع ہوا تھا، جس کی قیمت پندرہ سو روپیہ فی نسخہ تھی۔ اس کا اجراء سابق صدرِ پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوّب خان کے ہاتھوں لاہور آرٹ کونسل میں ہوا تھا اور حکومتِ پاکستان نے اس خدمت کے اعتراف میں چغتائی مرحوم کو دو لاکھ روپے کا انعام عطا کیا تھا۔

مندرجۂ ذیل کتابیں غیر مطبوعہ رہ گئیں:

۱۔ عمر خیام (مصوّر): اس پر انھوں نے ۳۰۔۴۰ برس کام کیا تھا۔ کتاب مکمل ہو چکی تھی۔ اس میں کوئی ۶۰۔۷۰ تصویریں ہیں۔ تمام تصویروں کی لوحیں اور بلاک وغیرہ بن چکے تھے؛ اور وہ اسے شائع کرنے کا انتظام کر رہے تھے کہ موت کا بلاوا آ گیا۔ خدا معلوم، اب اس کی اشاعت کا کیا انتظام ہو گا! چغتائی مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ یہ کتاب اس فرض کی ادائی ہے، جو مغرب، عمر خیام کی قدر و منزلت کر کے اور اس کے متعدد مصوّر ایڈیشن شائع کر کے ہم اہلِ مشرق سے وصول کرنے کا حقدار ہے۔

۲۔ چغتائی آرٹ: یہ کتاب تقسیمِ ملک سے قبل زیرِ طباعت تھی کہ فسادات کے باعث کام درمیان میں رہ گیا۔ اس کے بعد وہ عملِ چغتائی کی تکمیل میں

لگ گئے اور اس پر توجہ نہ دے سکے۔ بہر حال اس کا پورا سامان موجود ہے۔

۳۔ کارِ چغتائی: یہ در اصل غالب کے سلسلے کی تیسری کتاب ہے یعنی "مرقعِ چغتائی" اور "نقشِ چغتائی" کے بعد انھوں نے غالب کے جن مزید اشعار کو مصوّر کیا تھا، یہ ان کا مجموعہ ہے۔ اس میں ۳۰۔۴۰ نئی تصویریں ہیں۔ یہ کتاب بھی تقسیمِ ملک کے وقت زیرِ طبع تھی۔ اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ہر ایک تصویر کے ساتھ اردو میں کچھ اشارے لکھے ہیں۔ "عملِ چغتائی" میں بھی ہر ایک تصویر کے ساتھ تقریباً دو دو صفحے کے اشارات ہیں یہ سب مرحوم کے اپنے لکھے ہوتے ہیں۔

۴۔ ماڈرن آرٹ میں چغتائی کا حصّہ (انگریزی)

۵۔ چغتائی اور اس کے نقّاد (")

۶۔ نغمۂ لذّت (")

۷۔ چغتائی کی عریاں تصویریں (NUDES) (")

وہ اردو میں افسانہ بھی لکھتے تھے اور فنّی موضوعات پر مضامین بھی۔ ۱۹۴۷ء میں ان کے افسانوں کے دو مجموعے "کاجل" اور "لگان" شائع ہوتے تھے۔ اپنی وفات سے پہلے ایک اور مجموعہ "ستاون" کے عنوان سے مرتب کیا تھا۔ اس میں تین طویل افسانے ہیں: (۱) ستاون؛ (۲) ہانجن؛ (۳) لندن سے ایک خط۔ ستاون میں دوسری جنگِ عظیم کے اس زمانے کی داستان ہے، جب حُسنِ اتّفاق سے اردو کے بعض مشہور ادیب (تاثیر، مجید ملک، پطرس بخاری وغیرہ) دلّی میں جمع ہو گئے تھے۔ ہانجن کشمیر سے متعلق ہے۔ ۱۹۲۹ء کے موسمِ گرما میں وہ کشمیر گئے تھے۔ اس افسانے میں اسی زمانے کے تاثرات قلمبند کیے ہیں۔ تیسرا افسانہ ظاہر ہے کہ سفرِ لندن کی یادگار ہے۔ سنا ہے کہ ان کے غیر مطبوعہ افسانوں کی بھی خاصی بڑی تعداد موجود ہے۔

انھوں نے اپنے شوق سے مختلف ممالک کے مشہور مصوّروں کی تخلیقات کا اچھا

خاصا ذخیرہ جمع کیا تھا۔ آرٹ سے متعلق مطبوعہ کتابیں بھی بہت تھیں۔ خوشی کا مقام ہے کہ ان کی وفات کے بعد حکومت پاکستان کی سرپرستی میں "چغتائی عجائب گھر" قائم کر دیا گیا ہے، جس میں ان کی سب چیزیں محفوظ ہو گئی ہیں۔ وہ خود بھی یہی جانتے تھے؛ اس طرح ان کی وصیت بھی پوری ہو گئی۔

وہ شخصی زندگی میں بہت سادہ تھے۔ دن رات اپنے فن کی دُھن میں رہتے، گھر سے بھی کم نکلتے تھے۔ کسی قسم کی علّت نہیں تھی؛ نہ سگرٹ پیتے تھے، نہ شراب، حال آں کہ ان کے بیشتر دوست اور ملنے والے سگرٹ پیتے تھے اور ان میں سے کئی فنکار قسم کے حضرات تو شراب کے بھی رسیا تھے۔ چغتائی صاحب تاش کے پتّوں تک کو نہیں پہچانتے تھے۔ مصوّری کے علاوہ ان کا دوسرا سب سے بڑا شوق پتنگ بازی تھا۔ اپنے پتنگ خود ہی بناتے تھے۔ ان کی ساخت اور شکل وصورت میں طرح طرح کی اختراعات کی تھیں جوانی میں کھیل کود کا شوق بھی رہا، بلکہ شروع میں تو اسی لَت کے مارے چندے تعلیم کا سلسلہ ہی ٹوٹ گیا تھا۔ کرکٹ، بندوق کا نشانہ، مچھلی کا شکار ان کے دل پسند مشغلے تھے۔ کرکٹ میں گیند اتنی تیزی اور قوّت سے پھینکتے تھے کہ وکٹ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی تھی۔ تیراک بھی اچھے تھے۔

بروز جمعہ ۱۷ جنوری ۱۹۷۵ء کو اپنے خالق کے حضور حاضر ہو گئے۔ جنازہ اگلے دن اٹھا اور انھیں امانتاً اپنے بزرگوں کے نزدیک لاہور کے مشہور قبرستان میانی صاحب میں سپردِ خاک کیا گیا۔ ان کے اعزّہ چاہتے ہیں کہ انھیں ایک خاص مقبرے میں دفن کیا جائے۔ اسی لیے جب تک اس کے انتظامات مکمل نہ ہو جائیں، فی الحال انھیں میانی صاحب میں امانتاً دفنایا گیا ہے۔ بلکہ خود ان کی خواہش تو یہ تھی کہ "چغتائی عجائب گھر" ہی میں اُن کا مدفن بھی بنے۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔

انھوں نے اپنی زندگی میں دو نکاح کیے۔ پہلی بیوی (وزیر النسا بیگم) اپنے خاندان ہی سے تھیں۔ ان کے والد کا نام میاں محمد بخش چغتائی تھا۔ اس بیوی سے کوئی

اولاد نہیں ہوتی، ان کا ۲۳ مارچ ۱۹۶۶ء کو انتقال ہوا۔ دوسرا نکاح انھوں نے ۱۲ دسمبر ۱۹۴۲ء کو کیا تھا۔ یہ بیگم (کشور بانو) امرتسر کے ایک کشمیری خاندان سے ہیں۔ ان کے بطن سے دو بچے ہوئے۔ بڑی بیٹی (مسرّت) نے فلاسفی میں ایم اے کیا اور پنجاب بھر میں اوّل رہیں۔ وہ شادی شدہ اور اپنے گھر بار والی ہیں۔ ان سے چھوٹا ایک بیٹا عارف الرحمٰن چغتائی (ولادت: ۲۰ اگست ۱۹۴۹ء) ہے عارف میاں نے بزنس ایڈمنسٹریشن میں ایم اے تک تعلیم پائی ہے۔ وہ انگریزی میں شاعری بھی کرتے ہیں اور ان کے دو مختصر مجموعے شائع کر چکے ہیں۔

دیوان سنگھ مفتون، سردار

پنجاب (پاکستان) کے ضلع گوجرانوالہ میں ایک خاصا بڑا قصبہ حافظ آباد ہے۔ یہ تحصیل کا صدر مقام بھی ہے۔ تقسیم ملک (۱۹۴۷ء) تک کھتری قوم کی کھنہ برادری کا یہاں کے عمائد میں شمار ہوتا تھا۔ اسی برادری کے ایک سکھ گھرانے کے ایک فرد ڈاکٹر ندھان سنگھ تھے۔ وہ سرکاری ملازمت میں تھے اور ڈاکٹر کی حیثیت سے پنجاب کے مختلف مقامات (میانوالی، جہلم وغیرہ) میں تعینات رہے تھے۔ جب وہ جہلم کے سرکاری اسپتال کے انچارج تھے، تو یہاں ۱۴ اگست ۱۸۹۰ء کو ان کے گھر دوسرا لڑکا (اور چوتھا بچہ) پیدا ہوا۔ اس سے پہلے ان کی اولاد میں دو لڑکیاں اور ایک لڑکا کرتار سنگھ موجود تھے۔ اس نومولود کا نام انھوں نے دیوان سنگھ رکھا۔ یہی بچہ آگے چل کر سردار دیوان سنگھ مفتون، ایڈیٹر ریاست ہوا؛ اور اس نے تاریخ صحافتِ اُردو میں لافانی مقام حاصل کیا۔

دیوان سنگھ مفتون صرف ۴۰ دن کے تھے کہ ان کے والد ڈاکٹر ندھان سنگھ کا جہلم ہی میں انتقال ہوگیا۔ گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی، خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ ڈاکٹر ندھان سنگھ نے اپنی طویل ملازمت کے دوران میں بہت کچھ کمایا اور پس انداز کیا تھا۔ اس کے علاوہ غیر منقولہ جائداد بھی کم نہیں تھی۔ اگر حالات معمول کے موافق رہتے، تو ان کے پسماندگان کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونا چاہیے تھی۔ لیکن ہندو سماج میں (اور وہ بھی آج سے ایک صدی قبل کے سماج میں) بیوہ کی حالت بہت

زندہ تھی۔ رشتے دار اور عزیز قریب اس غریب کے اور اس کے یتیم بے سہارا بچوں کے سر پر ہاتھ رکھنا اور ان کی حمایت کرنا تو درکنار، اس تاک میں رہتے کہ جو کچھ ان کے پاس ہے، اسے بھی ہتیا لیں۔ ڈاکٹر ندھان سنگھ کی وفات کے وقت بڑی لڑکی ۱۸ برس کی تھیں، کرتار سنگھ دس برس کے تھے۔ اور ان سے چھوٹی (دوسری) لڑکی پانچ برس کی تھی۔ اور دیوان سنگھ تو جیسا کہ ابھی ذکر ہوا، صرف ۳۰ دن ہی کے تھے۔ ایسے میں ظاہر ہے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی بیوہ بالکل بے یار و مددگار رہ گئی تھیں۔ اراضی اور مکانات پر مرحوم کے ایک بھائی نے قبضہ کر لیا اور ان بچوں کے جوان ہونے پر بھی یہ جاداد واپس دینے سے انکار کر دیا۔ گھر میں جو اندوختہ تھا، وہ آہستہ آہستہ بچوں کی پرورش اور دو لڑکیوں اور بڑے بیٹے کی شادی کے مصارف میں ختم ہو گیا۔ جب نقد اور زیورات ٹھکانے لگ گئے، تو اثاث البیت تک فروخت کرنے کی نوبت آ گئی۔ قصہ کوتاہ، جب دیوان سنگھ کی دس بارہ برس کی عمر ہوتی ہے تو افلاس اور ادبار نے گھر میں ڈیرا ڈال رکھا تھا۔

ایسے حالات میں بالعموم سب سے چھوٹا بچہ سب سے زیادہ گھاٹے میں رہتا ہے؛ اس کی تعلیم و تربیت نہیں ہو سکتی۔ یہاں بھی یہی ہوا۔ دیوان سنگھ ششم یا پنجم تک تو پڑھ سکے، اس کے بعد ان کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ گھر میں روزمرہ کے اخراجات تک پورا کرنے کے لالے پڑے ہوتے تھے، ان کی فیس اور کتابوں وغیرہ کے لیے کہاں سے آتا! چنانچہ یہ خالصہ ہائی اسکول، گوجرانوالہ سے جہاں انھوں نے داخلہ لیا تھا، تین چار دن بعد واپس آ گئے۔

حالات سے مجبور ہو کر دیوان سنگھ اب وہیں حافظ آباد میں پانچ روپے ماہانہ پر ایک کپڑے کی دکان پر نوکر ہو گئے۔ یہ ملازمت دو تین برس رہی۔ اس کے بعد انھوں نے کوشش کر کے فیروزپور کے سول اسپتال میں کمپاؤنڈر کی نوکری حاصل کر لی۔ چھ روپے مشاہرہ ملنے لگا۔ کچھ مدت بعد اسی حیثیت سے منڈی ابوہر (ضلع فیروزپور) کے اسپتال میں تبادلہ ہو گیا۔ لیکن یہاں وہ زیادہ دن

نہیں رہے؛ فیروز پور واپس چلے آئے۔ فیروز پور میں مشکل سے چھ مہینے گزرے ہونگے کہ پھر تبادلہ ہوا۔ اور اب کے وہ موگا (ضلع فیروز پور) پہنچ گئے۔ موگا کی یہ خصوصیت ہے اور اس شہر کے لیے باعثِ فخر بھی، کہ آنکھوں کے مشہور معالج رائے بہادر ڈاکٹر متھراداس (ف: ۱۶ مارچ ۱۹۷۲ء) یہاں رہتے تھے۔ وہ بھی اصل میں حافظ آباد ہی کے رہنے والے تھے، لیکن موگا میں بس گئے تھے۔ یہاں انھوں نے ایک اسپتال قائم کیا تھا جس میں موتیا بند کے علاج کے متلاشی مریض آکر رہتے تھے۔ ڈاکٹر متھراداس کی دیوان سنگھ کے خاندان سے دُور نزدیک کی کچھ عزیزداری بھی تھی۔ انھوں نے ڈاکٹر متھراداس سے درخواست کی کہ مجھے اپنے اسپتال میں کام سیکھنے کا موقع دیجیے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے ان کا شوق دیکھتے ہوئے خوشی سے اجازت دے دی۔

وہ اس اسپتال میں کمپاؤنڈر کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ شروع میں نو روپے مشاہرہ تھا؛ بعد کو ترقی ہوئی، تو بارہ ملنے لگے۔ ساتھ ہی موتیا بند کا آپریشن کرنے کی تعلیم پاتے اور اس کی مشق بھی کرتے تھے۔ یہاں وہ تین برس رہے۔ جب ہاتھ جم گیا اور خود اعتمادی پیدا ہو گئی، تو انھوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور مانسہ (ریاست پٹیالہ) میں آزادانہ نجی طبی پریکٹس شروع کر دی۔ خدا نے ان کی محنت اور خلوص میں برکت دی، کام چل نکلا۔ یہاں انھوں نے اپنا ایک چھوٹا موٹا اسپتال بھی قائم کر لیا، جہاں وہ موتیا بند کے آپریشن کرتے تھے، اور باہر کے مریضوں کو ٹھہراتے تھے۔ غرض اب زندگی کامیاب کہی جا سکتی تھی۔ شہرت بھی حاصل تھی اور تین چار سو روپے مہینے کی آمدنی بھی۔

یہیں مانسہ میں وہ واقعہ پیش آیا، جس نے انھیں "ڈاکٹر دیوان سنگھ" کی جگہ "دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر ہفتہ وار ریاست" بننے کی راہ پر ڈال دیا۔

فیروز پور اسپتال میں تھے، جب انھیں اردو رسائل پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اس زمانے میں وہ ماہنامہ "زمانہ" (کانپور) کے خریدار بن گئے۔ "مخزن" (لاہور) ان

کے ملنے والے ایک صاحب کے پاس آتا تھا، یہ اس سے مستعار لے کر پڑھنے لگے۔ یہ سلسلۂ شوق ابوہر اور موگا میں بھی نہ صرف جاری رہا، بلکہ اس میں ترقی ہوتی گئی۔ اب اور ماہنامے بھی آنے لگے، بلکہ یہ روزنامہ "اخبارِ عام" (لاہور) کے بھی باقاعدہ خریدار بن گئے۔ جہاں گئے، وہاں کے بعض علم دوست اصحاب سے بھی روابط پیدا ہو جاتے۔ ان سے نہ صرف پڑھنے کو رسائل و جرائد ملتے، بلکہ ان کی صحبت میں دل و دماغ کی صلاحیتوں پر جلا بھی ہوتی چلی گئی۔ یہ صورتِ حال تھی، جب وہ مالسہ میں بلا شرکتِ غیرے ایک اسپتال اور تین چار سو روپے ماہانہ آمدنی کے مالک تھے۔

ایک دن انھوں نے ایک مضمون لکھا اور اسے "شیر سنگھ فیروز پوری" کے فرضی نام سے لاہور کے ہفتہ وار "خالصہ اخبار" کو بھیج دیا۔ مضمون چھپ گیا۔ اسی نام سے دو تین اور مضمون بھی اسی پرچے میں شائع ہوئے۔ تھوڑے دن بعد اخبار کے منیجر بھائی مول سنگھ کا خط آیا کہ کیا آپ مستقل طور پر "خالصہ اخبار" کی ایڈیٹری کی ذمہ داری لینے کو تیار ہیں؟ اور اگر جواب اثبات ہو تو، کیا تنخواہ قبول کریں گے؟ انھوں نے جواب دیا کہ میں یہاں ڈاکٹری کرتا ہوں اور اس سے تین چار سو ماہانہ پیدا کر لیتا ہوں۔ میری تعلیم معمولی ہے، لیکن مطالعہ کافی ہے، اور مجھے لکھنے کا شوق بھی ہے۔ بھائی مول سنگھ نے اس پر لکھا کہ ہم تو ایڈیٹر کو ۶۰ روپے سے زیادہ مشاہرہ نہیں دے سکتے! آپ کی موجودہ آمدنی کے پیشِ نظر آپ کو خالصہ اخبار کی ایڈیٹری پیش کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

بظاہر معاملہ یہیں پر ختم ہو جانا چاہیے تھا کہ ۶۰ اور ۳۰۰-۴۰۰ میں جو بیّن فرق ہے، اسے کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے! لیکن دیوان سنگھ کی ہیجان پسند طبیعت کو چین کہاں! انھوں نے ایک بزرگ مہربان سے مشورہ کیا کہ صورتِ حال یہ ہے، مجھے کیا کرنا چاہیے؟ ان صاحب نے لکھا کہ اس میں شک نہیں کہ تمھارے

قلم میں غیر معمولی زور ہے اور کامیاب صحافی بننے کی صلاحیت بھی، تجربہ کر لینے میں کیا مضائقہ ہے! اس رائے نے "دیوانہ راہوے بس است"، کا کام کیا۔ انھوں نے بھائی مول سنگھ کو لکھا کہ میں ۶۰ روپے ماہانہ ہی پر خالصہ اخبار کی ادارت قبول کرتا ہوں۔ اور ماںلسمہ میں اپنا جما جمایا، چلتا کاروبار چھوڑ کر لاہور پہنچ گئے۔

وہ اس اخبار میں مشکل سے چار مہینے رہے ہوں گے۔ بیشک، ان کے زور دار ادار یوں سے پرچہ بہت مقبول ہو گیا، لیکن ان کی تحریریں حکومت کی نظر میں خلافِ قانون ٹھہریں، اور پرچے کے مالک اور طابع اور ناشر پر متعدد مقدمے قائم ہو گئے۔ ایک ہمعصر (شیر پنجاب) کے ایڈیٹر سردار امر سنگھ (ف: جولائی ۱۹۴۸ء) نے بھی ازالۂ حیثیت عرفی اور ہتکِ عزت کا مقدمہ دائر کر دیا۔ ظاہر ہے کہ کونسا اخبار اتنے "لائق" مدیر کا خرچ برداشت کر سکتا ہے! ہوتے تم دوست جس کے، دشمن اس کا آسماں کیوں ہو! قدرتاً دیوان سنگھ ملازمت سے برخاست کر دیے گئے۔

اب وہ بیکار تھے، لیکن مایوس نہیں ہوئے۔ چندے اِدھر اُدھر کچھ اخباروں میں کام کیا، تاہم حالات تسلی بخش نہیں تھے۔ بہر حال انھوں نے محسوس کر لیا کہ اب صحافت ترک کر کے کوئی اور پیشہ اختیار کرنا ممکن نہیں۔ اور صحافت میں ان کی تعلیم و تربیت بمنزلۂ صفر تھی۔ فیصلہ کیا کہ اگر صحافت ہی کو بقیۂ عمر کے لیے ذریعۂ معاش بنانا ہے، تو لازم ہے کہ اسے کسی کامل استاد سے سیکھا جائے۔ مشہور صحافی رام رچھپال سنگھ شیدا (ایڈیٹر ہندوستان) ان دنوں لاہور میں تھے۔ اور دیوان سنگھ مفتون کے ان سے مراسم تھے۔ انھوں نے شیدا صاحب سے پوچھا کہ اردو صحافت میں سب سے لائق اور تجربہ کار کون صاحب ہیں؟ شیدا نے سید بشارت علی جالب دہلوی (ف: جولائی ۱۹۳۰ء) کا نام لیا، جو اس زمانے میں روزنامہ ہمدم، لکھنؤ کے مدیر تھے۔ اس پر دیوان سنگھ نے جالب صاحب کو لکھا کہ میں آپ سے صحافت سیکھنا چاہتا ہوں؛ اگر آپ اجازت

دیں، اور میرے لکھنؤ میں بسر اوقات کے لیے کچھ مقرر فرما دیں، تو میں حاضرِ خدمت ہو جاؤں۔ جالب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یاد دہانی کرائی، تو اب کے بھی صدائے برنخاست۔ دیوان سنگھ بھلا یوں کہاں ٹلنے والی اسامی تھے! انھوں نے ریل کا ٹکٹ خریدا اور لکھنؤ پہنچ گئے۔ ساتھ کا مختصر سامان ایک گوردوارے میں رکھا اور ہمدم کے دفتر جا دھمکے۔ جالب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے فرمایا کہ چونکہ ہمارے دفتر میں کوئی جگہ خالی نہیں تھی، اس لیے کوئی جواب نہیں دے سکا۔ دیوان سنگھ نے کہا کہ اگر صرف ۳۰ روپے ماہانہ کا انتظام ہو جائے تو میں یہاں رہ کر آپ سے کچھ حاصل کر لوں۔ جالب نے پھر نفی میں جواب دیا اور کہا کہ کوئی خالی جگہ ہے ہی نہیں، تنخواہ کا کیا سوال ہے! اب دیوان سنگھ نے کہا کہ میں چپراسی کے طور پر بھی رہنے کو تیار ہوں، کیونکہ میرا مقصد تو آپ کے دفتر میں، آپ کے نزدیک رہنا ہے؛ تاکہ میں آپ سے کچھ حاصل کر سکوں۔ اس پر بھی جالب نے وہی جواب دیا کہ چپراسی کی بھی جگہ خالی نہیں ہے۔ اس پر اس مردِ قلندر نے کہا کہ اچھا فرمائیے کہ کیا آپ کو میرے بغیر کچھ تنخواہ لیے، مفت کام کرنے پر بھی کچھ اعتراض ہو گا؟ جالب نے کہا کہ بھلا کسی کے مفت کام کرنے پر بھی اعتراض ہو سکتا ہے! اس پر انھوں نے شہر میں ایک کیمسٹ کی دکان پر پندرہ روپے ماہانہ کی نوکری تلاش کر لی۔ دن بھر ہمدم کے دفتر میں مفت کام کرتے، چھ بجے شام سے آدھی رات تک اس کیمسٹ کے ہاں رہتے، اور جب وہاں سے چھٹی ملتی، تو گوردوارے آ کر پڑ رہتے۔ وہ لکھنؤ میں غالباً چھ مہینے رہے؛ شاید اور رہتے، لیکن سخت بیمار پڑ گئے۔ جب علاج معالجے سے اچھے ہو گئے، تو لاہور واپس چلے آئے؛ اور رشید احمد صاحب کے اخبار "ہندوستان" میں نوکری کر لی۔

اس واقعے سے دیوان سنگھ کے کردار اور ان کی کامیابی کا راز کھلتا ہے۔ اگر ان کے سامنے کوئی مقصد ہوتا، تو اس کے حصول کی خاطر وہ راہ کی مشکلات سے

گھبرا کر اس سے دست بردار نہیں ہو جاتے تھے۔ منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے وہ کسی ادنی سے ادنی کام سے بھی جی نہیں چُراتے تھے۔ ان کی تمام کامیابیوں کا راز انھیں دو باتوں میں پنہاں ہے: مشکل سے نہ گھبرانا اور محنت سے جی نہ چُرانا۔

"ہمارا سنسار" میں کام کرتے تھے کہ مشہور سکھ لیڈر ماسٹر موتا سنگھ نے ان سے کہا کہ مہاراجا پٹیالہ کے آدمی بھسوڑ (ریاست پٹیالہ) کے قومی کارکن بابو تیجا سنگھ کو بہت تنگ کر رہے ہیں کیونکہ بابو صاحب نے مہاراجا کی بعض ناجائز خواہش پوری کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اس پر دیوان سنگھ بھسوڑ پہنچے، ماسٹر موتا سنگھ اور بابو تیجا سنگھ سے ملے، سارے حالات سُنے۔ مشورہ ہوا کہ کیا کرنا چاہیے۔ آخر طے پایا کہ مہاراجا بہادر کی کارگزاریوں کا بھانڈا پھوڑا جائے، اخباروں میں مضمون لکھے جائیں اور دیوان سنگھ خود حالات بےنقاب کرنے کے لیے اردو میں ایک پمفلٹ بھی لکھ کر شائع کرے۔

قرارداد کے مطابق دیوان سنگھ نے پمفلٹ بعنوان "خونِ شہادت کا تازہ قطرہ" لکھا اور چھپوا دیا۔ وہ اس کے دو سو نسخے جلدی سے تیار کروا کے دفتری کے ہاں سے اٹھا لائے اور انھیں دوستوں میں تقسیم کر دیا۔ شدہ شدہ اس کی خبر مہاراجا کے آدمیوں کو بھی ہو گئی۔ انھوں نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا جس پر حکومتِ ہند نے پمفلٹ بحقِ سرکار ضبط کر لیا اور پولیس نے دفتری کے ہاں سے بقیہ ۱۸۰۰ نسخے اپنے قبضے میں لے لیے۔ جب دیوان سنگھ کو حالات کی خبر ملی، تو انھیں افسوس ہوا کہ کی کرائی محنت ضائع گئی۔ لیکن انھوں نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا۔ بھسوڑ پہنچ کر پھر ماسٹر موتا سنگھ اور بابو تیجا سنگھ سے مشورہ کیا۔ دونوں نے کہا کہ کچھ ہو، پمفلٹ دوبارہ شائع ہونا چاہیے۔ اس پر یہ دلی آئے؛ یہیں اس کی کتابت کرائی اور ایک دن میں اسے طبع کرا کے اور دو ہزار نسخے لے کر واپس روانہ ہو گئے۔ رستے میں لدھیانہ، جالندھر، امرتسر کے ڈاکخانوں سے مختلف دوستوں کے نام پارسل بھیجتے ہوئے لاہور پہنچے، اور بقیہ نسخے وہاں

سے ارسال کر دیے۔
پولیس نے تفتیش کی، تو انھیں پتا چل گیا کہ یہ کس کی کارستانی ہے۔ اس پر یہ دو ہفتے بعد گرفتار کر لیے گئے۔ اب ایک لطیفہ ہوا!
جس دن پولیس نے انھیں پکڑا ہے، اتفاق سے اس دن اتوار تھا۔ تھانے والوں نے انھیں ہتھکڑی لگا کر انگریز ڈپٹی کمشنر کے بنگلے پر بھیجا کہ ان سے ریمانڈ پر دستخط کرائے جائیں؛ مقدمہ تحقیقات مکمل ہونے پر بعد کو دائر ہوتا رہیگا۔ ان کی خوش قسمتی کہ جب تھانیدار انھیں ہتھکڑی لگائے ڈپٹی کمشنر کے بنگلے پر پہنچا ہے، تو صاحب بہادر نشے میں چور تھے۔ تھانیدار نے ان سے کوائف بیان کر کے ریمانڈ پر دستخط کرنے کی درخواست کی، تو خدا معلوم، وہ پوری بات سمجھے بھی یا نہیں؛ انھوں نے دیوان سنگھ سے پوچھا: ویل، تم کل ہماری عدالت میں حاضر ہوگا؟
دیوان سنگھ نے کہا: اگر آپ کہتے ہیں، تو میں ضرور آؤنگا۔ اس پر ڈپٹی کمشنر نے تھانیدار کو حکم دیا کہ ملزم کی ہتھکڑی کھول دو اور اسے رہا کر دو؛ یہ کل عدالت میں حاضر ہو جائیگا۔ وہ تو یہ کہہ کر بنگلے کے اندر چلے گئے، ادھر تھانیدار غریب حیران، پریشان کہ ڈیفنس آف انڈیا کا مقدمہ، دو ہفتے کی دن رات کی تگ و دو کے بعد ملزم گرفتار ہوا؛ اور صاحب نے یوں اس کی رہائی کا حکم دے دیا! لیکن حکمِ حاکم، مرگِ مفاجات، کرتا تو کیا کرتا؛ اُس نے انھیں رہا کر دیا۔
اگلے دن پیر تھا، یہ حسبِ قرارداد عدالت میں حاضر ہو گئے۔ اب صاحب کا نشہ اتر چکا تھا اور وہ اپنی پہلے دن کی کارگزاری پر کچھ متعجب اور پریشان بھی تھا۔ لیکن جو تیر کمان سے نکل چکا تھا، وہ اب واپس کیونکر آسکتا تھا! اس نے دیوان سنگھ سے کہا کہ اگر تم معافی چاہو، اور وعدہ کرو کہ آیندہ کبھی ایسا پمفلٹ نہیں لکھوگے، تو ہم تم کو چھوڑ دیتا ہے۔ انھوں نے جوانی کی ترنگ میں جواب دیا کہ میں، نہ معذرت کرتا ہوں، نہ کوئی وعدہ؛ آپ کو مقدمہ چلانا ہے، تو خوشی سے چلائیے۔ اس پر صاحب کھسیانے ہوتے چپراسی کو حکم دیا کہ اس لڑکے کو

عدالت سے نکال دو؛ یہ نہیں جانتا کہ مقدمہ کیا ہوتا ہے! وہاں کیا دیر تھی چپراسی نے انھیں گردن پکڑ کر باہر ڈھکیل دیا۔ جان بچی، لاکھوں پائے۔ صاحب نے مسل پر لکھ دیا: ملزم ناتجربہ کار نوجوان چھوکرا ہے، اسے تنبیہ کر دی گئی ہے۔ مسل داخل دفتر کر دی جائے۔

یہ ان کی زندگی کی پہلی تصنیف تھی؛ اور پہلی گرفتاری بھی۔

اب یہ پھر بیکار تھے۔ بسراوقات کے لیے چند سے لاہور کے مختلف پرچوں (گورو گھنٹال، ہندو، اکالی وغیرہ) میں جز وقتی کام کرتے رہے۔ لیکن کب تک۔ ۹ آخر ۱۹۲۰ء میں دلّی پہنچے۔ ان دنوں یہاں اخباری دنیا میں خواجہ حسن نظامی مرحوم (ف: جولائی ۱۹۵۵ء) کا ڈنکا بجتا تھا۔ انھیں نئے نئے اخبار جاری کرنے کی گویا دھن تھی۔ دیوان سنگھ ان سے ملے اور طے پایا کہ ایک روزنامہ "رعیّت" کے نام سے جاری کیا جائے۔ اس میں دیوان سنگھ نے ۲۵۰ روپے لگائے، بقیہ سرمایہ خواجہ صاحب مرحوم کا تھا۔ شرط یہ تھی کہ دیوان سنگھ صرف تیس روپے ماہانہ اپنے ذاتی خرچ کے لیے لینگے؛ روزانہ خواجہ صاحب کی کتابوں کا ایک صفحے کا اشتہار اخبار میں مفت شائع ہوگا۔ اگر اخبار میں منافع ہوا، تو دونوں شریک برابر کے حصّے دار؛ اگر نقصان ہوا تو اسے خواجہ صاحب پورا کرینگے۔ لیکن پوری کوشش کے باوجود اخبار گھاٹے میں رہا۔ چند مہینے کے بعد خواجہ صاحب نے کہا کہ بھائی، اب زیادہ نقصان برداشت نہیں کیا جا سکتا، ہمیں اخبار بند کر دینا چاہیے۔ قدرتاً دیوان سنگھ کو اس فیصلے سے بہت افسوس ہوا۔ ابتدائی ڈھائی سو تو ڈوبے ہی تھے، اب پھر مستقبل کا سوال سامنے آگیا۔

خواجہ صاحب موصوف کے عزیز دوستوں میں ملّا واحدی (ف ۱۱ اگست ۱۹۷۶ء) بہت مشہور شخصیت تھی۔ یہاں دلّی میں ان کی بڑی ساکھ تھی، وہ میونسپل کمیٹی کے رکن بھی تھے۔ اس زمانے میں وہ ماہنامہ "نظام المشائخ" نکالتے تھے۔ انھوں نے خواجہ صاحب سے کہا کہ آپ "رعیّت" مجھے دے دیجیے، میں اسے چلاؤں گا۔ غرض، "رعیّت" کا دفتر واحدی صاحب کے مکان کوچہ چیلان میں اٹھ گیا۔ بھوپال سے

نیاز فتحپوری اس کی ادارت کے لیے بلائے گئے۔ حکومت کو اخبار کی پالیسی پسند نہ آئی، وہ اس کی متواتر نکتہ چینیوں سے چیں بجبیں تھی۔ اتنے میں نیاز کے مصر سے متعلق دو اداریے گویا روایتی اونٹ کی پشت پر آخری تنکا ثابت ہوئے۔ حکومت نے ملّا واحدی سے ضمانت طلب کر لی، اور مطبع ضبط کر لیا۔ پرچے نے دم توڑ دیا۔ ہے یہ کہ آج تک بھی یہ ملّا واحدی کی ضد سے چل رہا تھا، ورنہ اس میں منافع کی صورت تو کبھی ایک دن بھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔

دیوان سنگھ پھر بیکار ہو گئے، اور حسب معمول جیب بالکل خالی۔ "رعیّت" میں کام کرنے کے زمانے میں ان سے دیوبند کے ایک تاجر لالہ اوگرسین کی ملاقات ہو گئی تھی۔ وہ دیوان سنگھ کی محنت کی عادت اور فرض شناسی سے بہت متاثر تھے۔ لالہ جی نے انھیں پیشکش کی کہ آیئے، بمبئی چل کر آڑھت کا کاروبار کریں۔ مرتا کیا نہ کرتا! مجبوراً دیوان سنگھ نے ۱۵۰ روپے مشاہرے پر ان کی ملازمت قبول کر لی اور بمبئی چلے گئے۔ لیکن تجارت ان کے بس کی بات نہیں تھی، نہ کوئی اس کا تجربہ ہی تھا۔ مشکل سے انھوں نے چار مہینے سیٹھ صاحب کے ساتھ کاٹے اور بھاگ نکلے۔ اس کے بعد مہاراجا رِپودمن سنگھ والیِ نابھہ کے، جن سے سردار سردول سنگھ کویشر کے ذریعے سے تعارف ہو چکا تھا، ملازم ہو کر نابھہ چلے گئے۔ وہ نابھہ میں کوئی ڈھائی تین سال رہے۔ یہاں وہ دو سو روپے ماہانہ پاتے تھے۔

مہاراجا رپودمن سنگھ اپنی قوم پرستی اور انگریز دشمنی کے لیے مشہور تھے۔ اسی لیے حکومت ہند کا پولٹیکل ڈپارٹمنٹ ان کے خلاف ہو گیا اور حکومت انھیں گدی سے اُتارنے کے لیے بہانے ڈھونڈنے لگی۔ بالآخر حکومت نے ۱۹۲۳ء میں مہاراجا کو اختیارات سے دست بردار ہونے پر مجبور کر دیا، جس کے بعد وہ ڈیرہ دون میں مقیم ہو گئے۔ لیکن حکومت ان کی سرگرمیوں سے مطمئن نہیں تھی۔ مہاراجا نے بھی کچھ بے احتیاطی سے کام لیا۔ آخرکار ۱۹۲۸ء میں انھیں الٰہ آباد کے ریلوے اسٹیشن پر گرفتار کر کے کوڈائی کنال میں نظر بند کر دیا گیا۔ وہیں ۱۹۴۲ء میں ان کا انتقال

ہوا۔ اس جلاوطنی کے زمانے میں ان کی بیوی سروجنی دیوی بھی ان کے ساتھ نظر بند رہی تھیں؛ ان کی ۲۸ دسمبر ۱۹۷۷ء کو نئی دلی میں رحلت ہوئی۔
جب مہاراجا نابھ کو گدی سے اتار اگیا، تو دیوان سنگھ نے بھی وہاں سے روانہ ہونے کی تیاری کی کہ اب وہاں ان کا کون تھا جس کے بھروسے پر یہ نابھے میں رہ سکتے تھے! انھوں نے انگریز منتظم اعلیٰ (ایڈمنسٹریٹر) مسٹر اوگلوی کی خدمت میں استعفےٰ پیش کر دیا۔ اوگلوی نے اوّل تو ان سے استعفےٰ واپس لینے کو کہا اور ملازمت جاری رکھنے کا مشورہ دیا۔ لیکن اصرار کرنے پر اتنی رعایت کی کہ اچھا پندرہ دن تک میں اسے منظور نہیں کرتا؛ یہ وقفہ آپ کی رخصت میں محسوب کر لیا جائیگا۔ اس دوران میں غور کر لیجیے۔ اگر اس کے بعد بھی آپ اس فیصلے پر بضد رہے، تو استعفےٰ منظور کر لیا جائیگا۔ لیکن ہوا اس کے برعکس۔ یہ نابھ سے فوراً مہاراجا سے ملاقات کے لیے ڈیرہ دون پہنچے۔ وہاں مہاراجا نے انھیں ایک نجی خط دے کر حیدرآباد بھیج دیا۔ ظاہر ہے کہ گورمنٹ ہند کی خفیہ پولیس ان کی نقل و حرکت کی نگرانی کر رہی تھی، اور انھیں معلوم تھا کہ یہ کیا کر رہے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں! چنانچہ جب وہ حیدرآباد سے واپس نابھ پہنچے کہ اپنا سامان وغیرہ لے کر اس شہر کو خیرباد کہہ دیں، تو پولیس نے انھیں گرفتار کر کے نظر بند کر دیا۔ قصور یا الزام کچھ نہیں بتایا، بس نظر بند کر دیا۔
ان کے دوستوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ خود مہاراجا نے مجلسِ واضعِ قوانین کے اراکین دوستوں کو لکھا۔ خدا خدا کر کے معاملہ لارڈ ریڈنگ وائسرائے ہند کے سامنے پیش ہوا اور انھوں نے ان کی رہائی کا حکم صادر فرمادیا۔ وہ تین مہینے نظر بند رہے تھے۔
نابھ کی ملازمت کے دوران میں انھوں نے وہاں ظلم و ستم کے کئی واقعات اپنی آنکھوں دیکھے تھے۔ قرب و جوار کی دوسری ریاستوں کے حالات بھی کچھ بہتر نہیں تھے، وہاں کی بدعنوانیوں کی کہانیاں بھی آنے والے سناتے رہتے تھے۔ دیوان سنگھ جب یہ باتیں سنتے، تو ان کا خون کھولتا اور چاہتے کہ کسی طرح ان مظلوموں کی روداد حکومت

ہند اور عوام تک پہنچائی جائے، تاکہ ان کی دادرسی ہو سکے۔ اسی زمانے میں انھوں نے دیر سویر ایک اخبار جاری کرنے کا عزم کر لیا جس کے ذریعے سے والیانِ ریاست کے مظالم طشت ازبام کیے جائیں اور ان کی مصیبت زدہ رعایا کی دردناک کہانی ملک و قوم کو سنائی جائے۔

جب یہ نابھہ کی نظر بندی سے چھوٹے، تو سیدھے دلّی پہنچے۔ اب انھوں نے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا اقدام کیا۔ دوستوں سے مشورہ ہوا کسی نے حوصلہ افزائی کی؛ کسی نے اس خارزار سے دامن بچانے کی صلاح دی۔ روپے کا سوال الگ تھا۔ وہ ہمیشہ فضول خرچ رہے۔ نابھہ کی پوری ملازمت کے دوران میں بھی کچھ پس انداز نہیں کیا تھا کہ اب اخبار شروع کرتے وقت کام آتا۔ قصہ کوتاہ، کافی سوچ بچار کے بعد فیصلہ ہوا کہ ایک ہفتہ وار جاری کیا جائے اور موضوع کی مناسبت سے اس کا نام "ریاست" ہو۔ ڈیڑھ ہزار روپیہ ایک بنیے سے قرض لیا اور یوں ۱۹۲۴ء میں اس کا آغاز ہوا۔

"ریاست" کا اجرا کئی پہلوؤں سے عہد آفریں تھا۔ یہ پہلا پرچہ ہے جس میں خاص طور پر دیسی ریاستوں کے حالات اور معاملات پر بےخوفی اور صراحت سے تنقید کی گئی۔ اس سے پہلے اگر کوئی ریاستوں کے بارے میں کچھ لکھتا بھی تھا، تو صرف والیِ ریاست کی مدح میں قصیدہ، تاکہ اس سے کچھ فتوح حاصل ہو سکے؛ لکھنے والے کو ریاست کی رعایا سے کوئی سروکار نہیں ہوتا تھا۔ پھر یہ پرچہ جس آب و تاب سے چھپنا شروع ہوا، وہ بھی اردو صحافت میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس سے پہلے صرف مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم (ف: فروری ۱۹۵۸ء) کا الہلال (البلاغ) اس شان سے نکلا تھا۔ لیکن وہ خوش درخشید، ولے دولتِ مستعجل بود کا مصداق ثابت ہوا۔ اور صرف چار برس زندہ رہ کر بند ہو گیا۔ "ریاست" کے سلسلے میں اس کے مدیرِ اعلیٰ (دیوان سنگھ) کو جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا، وہ بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ چونکہ اس پرچے میں مختلف ریاستوں کی بےزبان اور مظلوم رعایا کی حمایت میں

وہاں کے حکمرانوں کے کرتوتوں کا کچّا چٹھا چھپتا تھا، اس لیے تمام والیانِ ریاست نے گویا دیوان سنگھ کے خلاف متحدہ محاذ بنالیا۔ کئی مقدّمے دائر ہوتے جن میں فریقین کون تھے: ایک طرف راجا مہاراجا یا نواب کی بے پایاں دولت اور اثرورسوخ، اور دوسری طرف ایک ہفتہ وار اخبار کا بجّہ (تنہا ایڈیٹر) اور اس کے محدود وسائل۔ لیکن آفریں ہے دیوان سنگھ کو کہ انھوں نے جو قدم پہلے دن اٹھایا تھا، اس سے ذرّہ برابر پسپائی قبول نہیں کی اور میدان میں ڈٹے رہے۔ ان پر بعض اوقات مختلف ریاستوں کی طرف سے بیک وقت چار چار مقدّمے چلائے گئے، ایک شمال میں، دوسرا جنوب میں، تیسرا مغرب میں، چوتھا یہاں دلی میں۔ آپ تصور کر سکتے ہیں کہ اس سے کتنی جسمانی تکلیف اور ذہنی کوفت ہوئی ہوگی! پھر مالی زیرباری اپنی جگہ۔ ان پر اپنی زندگی میں پندرہ مقدّمے چلے۔ ان میں سب سے مشہور نواب بھوپال کا مقدّمہ ہے، جو ہوشنگ آباد میں چھ برس تک جاری رہا۔ اور جس میں آخرکار دیوان سنگھ کو تین مہینے قید کی سزا ہوئی۔ مرحوم کہتے تھے کہ اس میں میرا اسّی ہزار روپیہ خرچ ہوا تھا۔ اس کے باوجود یہ کبھی نہیں ہوا کہ ان مادّی اور معنوی تکالیف سے پریشان ہو کر ناانصافی یا ظلم وستم سے سمجھوتا کر لینے کا خیال بھی ان کے دماغ میں آیا ہو۔

"ریاست" کی ایک اور خدمت بھی نظرانداز نہیں کی جا سکتی۔

ہماری سیاسی جنگ کا اصلی محاذ تو انگریزی حکومت کے خلاف تھا، جس نے ہماری آزادی سلب کر کے پوری قوم کو غلام بنا رکھا تھا۔ لیکن ایک ذیلی محاذ اور بھی تھا اور اس پر بہت کم توجہ ہوئی۔ ہندستان میں کوئی ۶۰۰ دیسی ریاستیں تھیں۔ ان کے حکمران مطلق العنان تھے، ان کا فرمودہ ریاست کا قانون تھا۔ جس کے خلاف کوئی داد تھی نہ فریاد۔ ان ریاستوں کی ہستی اور بقا انگریز کے رحم وکرم پر تھی۔ اس لیے یہ والیانِ ریاست ہمیشہ انگریز کی حمایت کرتے اور جب بس چلتا، رہنمایانِ قوم اور سیاسی لیڈروں کے خلاف اقدام کرتے رہتے، تاکہ

اس طرح ولیِ نعمت انگریزی حکومت کی نظروں میں اپنی خیر خواہی اور فرماں برداری کا نقش اور گہرا کر سکیں۔ غرض کہ یہ ریاستیں ہماری آزادی کے حصول میں ہمیشہ سدِّ راہ ثابت ہوئیں۔ "ریاست" نے انھیں بےنقاب کر کے بہت بڑی خدمت سر انجام دی۔ اس سے جہاں ریاستوں کی رعایا میں بیداری اور اپنے حقوق کا احساس پیدا ہوا، وہیں اس سے انگریز کا وقار بھی ملیامیٹ ہو گیا، جو ان ناکارہ اور ننگِ ملّت و قوم راجاؤں، مہاراجاؤں اور نوابوں کا پشت پناہ اور حامی تھا۔

"ریاست" ۱۹۶۰ء تک جاری رہا۔ ملک آزاد ہوا، تو ریاستوں کی اہمیت بھی ختم ہو گئی۔ جلد ہی نہ ریاستیں رہیں، نہ ان کے حکمران، نہ ریاستوں کے مسائل۔ اس لیے حقیقت میں اب اس پرچے کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔ انھوں نے ایک مقامی دوست کے ساتھ اس کے جاری رکھنے کے لیے کچھ معاملہ کیا تھا، لیکن وہ بھی دیرپا ثابت نہ ہوا۔

دیوان سنگھ جی کے فضول خرچ تھے۔ لاکھوں کماتے اور اڑا دیے، کبھی کل کی فکر نہ کی۔ ان کے ہاتھ میں چھید تھا، بڑا سا چھید، روپیہ اس میں ٹکتا نہیں تھا؛ ایسے میں کچھ پس انداز کرنے یا آڑے وقت کے لیے بچا رکھنے کا امکان ہی کیا تھا۔ ساری عمر صحافت کا کاروبار کرنے سے وہ کسی اور گون کے رہے بھی نہیں تھے۔ اس پر کبر سنی اور اعتدالِ قواء کا فقدان۔ واقعی پریشانی کا عالم تھا۔ بارے، مولانا ابو الکلام آزاد کی سفارش پر حکومتِ ہند نے ڈھائی سو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا، اور پھر انھیں کے ایما پر حکومتِ پنجاب نے بھی غالباً پانسو ماہانہ دینا منظور کیے؛ یوں جان و تن کا رشتہ قایم رکھنے کا سامان ہو گیا۔

"ریاست" بند کرنے کے بعد ۱۹۶۰ء میں دلّی سے ہجرت کر کے راجپورہ (ڈیرہ دون) چلے گئے تھے۔ وہاں اکیلے رہتے تھے، بیوی بچے یہاں دلّی ہی میں رہے۔ ۲۰ جنوری ۱۹۷۵ء کو غسلخانے سے نکلتے ہوئے پاؤں رپٹ گیا اور گر گئے۔ سر میں چوٹ آئی۔ جس سے بہت خون خارج ہوا؛ علاج کے لیے وہاں اسپتال میں داخل ہو گئے۔

جب دلّی میں گھر والوں کو اطلاع ہوئی، تو جا کر انھیں لوا لائے۔ لیکن وقتِ اخیر آ لگا تھا، ساری دوا دوش کے باوجود وہ جانبر نہ ہو سکے۔ اتوار ۲۶ جنوری ۱۹۷۵ء آدھی رات سے کچھ پہلے روح نفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ یوں وہ مردِ میدان بھی جس نے ساری عمر لڑتے جھگڑتے اور مخالفوں کا مقابلہ کرتے گزار دی تھی، فرشتۂ موت کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گیا۔

موت سے کس کو رستگاری ہے!

تین بیٹے ان کی جسمانی یادگار ہیں: مہندر سنگھ، اونکار سنگھ، نندکمار سنگھ سب یہیں دلّی میں کاروبار کرتے ہیں۔

ان سے دو کتابیں یادگار ہیں: ناقابلِ فراموش اور جذباتِ مشرق۔ ناقابلِ فراموش انھوں نے جیل میں لکھنا شروع کی تھی۔ ۱۹۴۲ء کی "ہندوستان چھوڑدو" تحریک میں وہ بھی قید کر دیے گئے تھے۔ وہ ۱۸ اگست ۱۹۴۲ء کو گرفتار ہوئے اور تقریباً سال بھر بعد ستمبر ۱۹۴۳ء میں رہا کر دیے گئے۔ جیل خانے میں انھوں نے اپنی زندگی کے وہ واقعات قلمبند کرنا شروع کیے، جو ان کی نظر میں اہم اور سبق آموز تھے۔ ان کی غیر حاضری کے زمانے میں "ریاست" بند رہا۔ ان کی رہائی کے بعد جب یہ ۳ اپریل ۱۹۴۴ء کو دوبارہ جاری ہوا، تو پہلے ہی شمارے میں یہ یادداشتیں "ناقابلِ فراموش" کے عنوان سے شائع ہونا شروع ہوئیں۔ بعد کو ان کا ایک مختصر مجموعہ کتابی شکل میں چھپا، تو بہت مقبول ہوا۔ اس سلسلے کی ہر دلعزیزی سے انھیں خیال پیدا ہوا کہ اسے مفصل کر دیا جائے۔ چنانچہ دوسری بار یہ کتاب نومبر ۱۹۵۷ء میں بڑے سائز کے ۵۱۶ صفحات پر شائع ہوئی۔ رڑکی کے قیام کے زمانے میں انھوں نے اس کا دوسرا حصہ "سیف و قلم" کے نام سے لکھا تھا۔ اور اس کی کتابت بھی ہو چکی تھی۔ یہ بھی خاصی ضخیم کتاب ہے۔ چھپ جائے، تو اس سے ہمارے سوانحی ادب میں مفید اور دلچسپ اضافہ ہوگا۔

تعلیم کی کمی کے باوجود، انھوں نے ساری عمر کی مشق سے، اردو سے اچھی خاصی واقفیت

حاصل کرلی تھی۔ اگرچہ ان کی زبان اغلاط سے پاک نہیں، لیکن ان کی تحریر میں بلا کی کشش ہے۔ "ناقابلِ فراموش" میں تسلسل مفقود ہے؛ جستہ جستہ واقعات ہیں۔ ہر ایک واقعے کے آخر میں کوئی اخلاقی سبق دینے کی کوشش بھی موجود ہے، جو طبیعت پر گراں گزرتا ہے۔ ان سب نقائص کے باوجود، اس کی دلچسپی اور کشش کا یہ عالم ہے کہ انسان اس سے اکتاتا نہیں اور چاہتا ہے کہ اسے آخر تک پڑھ جائے۔ اس کتاب کا ہندی ترجمہ بھی "تروینی" کے عنوان سے چھپ چکا ہے۔ میں جب ۱۹۶۶ء میں افغانستان سے واپس آیا، اور انھیں معلوم ہوا، تو خواہش ظاہر کی کہ اس کا فارسی ترجمہ چھاپنے میں ان کی مدد کروں۔ میں نے عرض کیا کہ اصلی مسئلہ اس کے فارسی ترجمہ کرنے کا ہے۔ جب تک یہ نہ ہو، طباعت و اشاعت کے مرحلے کا کیونکر سوچا جاسکتا ہے! بہرحال وہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔

ان کی دوسری کتاب "جذباتِ مشرق" بھی جیل کی دین ہے۔ مقدمۂ بھوپال کے بعد وہ تین مہینے ناگپور جیل میں رہے تھے۔ یہیں انھوں نے ہندی، پنجابی، فارسی وغیرہ کے منتخب اشعار کا تشریحی ترجمہ شروع کیا۔ رہائی کے بعد مدّتوں یہ تراجم بھی "ریاست" میں چھپتے رہے۔ انھیں کا مجموعہ بالآخر ۱۹۶۰ء میں کتابی شکل میں شائع ہوا۔

ان کے نام کے ساتھ مفتون کا جزو تخلص نہیں تھا۔ خواجہ حسن نظامی مرحوم اپنے دوست احباب کو مختلف لقب اور خطاب دیا کرتے تھے۔ جس زمانے میں سردار دیوان سنگھ سے ان کے تعلقات خوشگوار تھے، انھوں نے انھیں "مفتون" کا لقب عطا کیا۔ اور یہ کچھ ایسا ان کے نام کے ساتھ لگا کہ جب تک آپ پورا نام "دیوان سنگھ مفتون" نہ کہیں، ان کی طرف کسی کا خیال جا ہی نہیں سکتا۔

مرحوم کی پوری زندگی سبق آموز ہے۔ مادّی وسائل یکسر ندارد، تعلیم نہ ہونے کے برابر، ہر طرح کے ہنر یا فن سے کورے، حوصلہ افزائی کرنے والے یا بڑھاوا دینے والے مفقود۔ لیکن ان کی محنت و مشقت سے جی نہ چرانے کی عادت، اور بے پایاں

خود اعتمادی کا یہ ثمرہ تھا کہ انھوں نے بڑے بڑے پہاڑوں سے ٹکر لی۔ اور انھیں اپنی جگہ سے ہلا دیا۔ وہ آزادانہ جیے اور آزادانہ مرے۔

اس طرح جی کہ بعد مرنے کے
یاد کوئی تو گاہ گاہ کرے

مسیح الزّماں، ڈاکٹر سیّد

ان کا خاندان جائس (ضلع رائے بریلی، یوپی) کا رہنے والا تھا۔ ان کے والد سیّد مہدی الزّماں پیشے کے لحاظ سے بہت کامیاب وکیل، اور سماجی پہلو سے عمائدِ شہر میں سے تھے۔

مسیح الزّمان ۱۸ مارچ ۱۹۲۵ء کو جائس ہی میں پیدا ہوئے تعلیمی دور بہت کامیاب رہا۔ ۱۹۴۱ء میں بی۔ اے کے امتحان میں الٰہ آباد یونیورسٹی کے تمام اردو کے امیدواروں میں اوّل آئے، تو چنتامنی گھوش کا یادگاری سونے کا تمغا انعام میں ملا۔ دو برس بعد وہیں سے ایم۔ اے (اردو) کی سند پائی، جس میں پھر تمام طلبا میں اوّل رہنے پر وکٹوریہ جوبلی تمغہ عطا ہوا۔ اس کے بعد یہ چاہتے تھے کہ وہیں سے ڈاکٹریٹ کی سند بھی حاصل کریں، لیکن اس وقت صدرِ شعبۂ اردو ضامن علی ضامن (ف: ۲۵ اپریل ۱۹۵۵ء) تھے۔ اور وہی ان کے تحقیقی کام کے نگراں بھی تھے۔ ان سے موضوع کے مسئلے پر اتفاق نہ ہو سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بات ٹلتی رہی، اور بہت دن بعد کہیں ۱۹۶۸ء میں وہ ڈی لٹ کے مرتبے تک پہنچے۔ صرف ۱۸ برس کی عمر تھی کہ ایم اے کرنے کے بعد ۱۹۴۳ء میں وہیں اپنی یونیورسٹی میں اُردو کے مدرّس (لیکچرر) مقرر ہو گئے؛ پہلے کچھ دن عارضی جگہوں پر رہے، بعد کو مستقل ہو گئے۔ رفتہ رفتہ ۱۹۷۰ء میں ریڈر کا مقام ملا۔ اس دوران میں دو برس کے لیے انھوں نے بنارس ہندو یونیورسٹی میں شعبہ اردو، فارسی و عربی کے صدر کی حیثیت سے

بھی کام کیا (نومبر ۱۹۶۹ء تا نومبر ۱۹۷۱ء) چونکہ وہاں توسیع نہ ملی، اس لیے واپس الٰہ آباد چلے آئے۔

اگرچہ جسم کے لاغر اور قویٰ کے کمزور تھے، لیکن عام صحت کم و بیش ہمیشہ ٹھیک رہی۔ آخری وقت بہت دبے پاؤں آیا۔ ۹ فروری ۱۹۷۵ء کو اچانک دل کا دورہ پڑا، اور جاں بحق ہو گئے۔ خدا مغفرت فرمائے۔ کربلا، الٰہ آباد (ہمت گنج) میں دفن ہوئے۔

جائس کے سادات امام دہم حضرت علی نقی علیہ السّلام کی اولاد ہیں۔ علم و فضل کے ساتھ شعر و ادب بھی ان کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ سید مسیح الزّماں کے خاندان میں بھی پرانے مسلمان گھرانوں کی طرح عربی، فارسی کا بہت چرچا تھا۔ ان کے والد سیّد مہدی الزّماں صاحب علمی ذوق اور شاعرانہ مزاج کے آدمی تھے۔ انھیں لکھنے پڑھنے کا شوق تھا؛ بلکہ عروض پر چند رسالے بھی ان سے یادگار ہیں۔ مسیح الزّماں مرحوم نے بھی فارسی انھیں کی نگرانی میں پڑھی، اور اس میں اچھی استعداد پیدا کرلی۔

ان کی دلچسپی کے دو خاص موضوع تھے: ڈراما اور مرثیہ۔ ڈراما کے فن کے مالہ و ما علیہ سے خوب واقف تھے۔ یونیورسٹی میں ڈرامیٹک ایسوسی ایشن بھی قائم کی تھی، جس کی سرپرستی میں (خود مسیح الزّماں صاحب کی نگرانی میں) ڈرامے کھیلے جاتے تھے۔ یہ امرِ واقع ہے کہ الٰہ آباد یونیورسٹی، بلکہ باہر شہر کے حلقوں میں بھی، ڈرامے کو جو فروغ ہوا، اس میں مسیح الزّماں مرحوم کی مساعی کو بہت دخل ہے۔

جس ماحول میں ان کی تربیت ہوتی تھی، اس میں تصنیف و تالیف کی چاٹ لگ جانا بالکل قدرتی بات تھی۔ اس پر پیشہ اُردو پڑھانے کا! اعتقاداً چونکہ شیعی تھے، اس لیے مرثیے سے شغف بھی فطری بات تھی۔ ان کی پہلی کتاب "مرثیۂ میر" تھی، جو ۱۹۵۲ء میں چھپی۔ عام خیال تھا کہ میر تقی میر کے مراثی مفقود ہو چکے ہیں، مرحوم نے انھیں کو ایک مبسوط مقدمے کے ساتھ پیش کیا ہے۔ بقیہ کتابیں یہ ہیں: (۲) اردو تنقید کی تاریخ؛ جلد اوّل (۱۹۵۴ء)؛ (۳) تعبیر، تشریح، تنقید (۱۹۵۵ء): یہ بعض مضامین اور متفرق تقریروں کا مجموعہ ہے؛ (۴) "حرفِ غزل" (۱۹۵۷ء): اس

میں اُردو غزل کا تنقیدی مطالعہ اور انیسویں صدی کے مشہور غزل گویوں کا جائزہ لیا ہے؛ (۵) "امانت کی اندر سبھا" (۱۹۶۶ء): متن کی تصحیح کی گئی ہے، اور ایک مبسوط مقدمے میں، ابتدائی اسٹیج، رہس اور اندر سبھا کی تدوین اور اس کی خوبیوں اور خامیوں پر بحث کی ہے؛ (۶) معیار و میزان (۱۹۶۸ء): اُردو کے نثری اسالیب پر تبصرہ ہے؛ (۷) اردو مرثیہ کا ارتقا (۱۹۶۸ء): ڈی لٹ کی سند کا مقالہ؛ (۸) اردو مرثیے کی روایت (۱۹۶۹ء) یہ گویا اردو مرثیہ کی تین صدیوں کی تاریخ ہے؛ (۹) موازنۂ انیس و دبیر از شبلی (۱۹۷۰ء) مقدمہ اور حواشی کا اضافہ کیا ہے؛ (۱۰) کلیاتِ مومن (۱۹۷۰ء): مقدمہ اور مومن کے مقام کے تعین کی کوشش؛ (۱۱) کلیاتِ میر: جلد دوم (۱۹۷۱ء): غزلیات کے علاوہ میر کے کلام کی تدوین، اس کے مقدمے میں میر کی شاعری اور اسلوب پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے؛ (۱۲) داغ کی شاعری (ہندی)؛ (۱۳) خورشید (۱۹۷۳ء): پارسی تھیٹر بمبئی کا پہلا اردو ڈراما جو کسی زمانے میں گجراتی میں چھپا تھا؛ اسی کو حیاتِ نو بخشی ہے۔ انھوں نے دو کتابیں انگریزی سے ترجمہ بھی کی تھیں (۱۴) ٹیلیفون کی کہانی (۱۹۶۰ء)؛ (۱۵) ریاستہائے متحدہ کی مختصر تاریخ (۱۹۶۴ء) کچھ چیزیں غیر مطبوعہ بھی رہ گئیں۔ مختلف مجلات میں مطبوعہ مضامین بھی خاصی تعداد میں ہیں۔

ان کی شادی پروفیسر سیّد مسعود حسن رضوی ادیب کی بڑی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ ان سے دو لڑکے اور دو لڑکیاں اپنی یادگار چھوڑے۔

حیرت بدایونی، سیّد حسن

یو۔پی کے مردم خیز خطّے بدایوں میں پیر کے دن ۲۴ اگست ۱۸۹۶ء (۱۵ ربیع الاوّل ۱۳۱۴ھ) کو پیدا ہوئے۔ دادھیال اور ناںھیال دونوں طرف سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی اولاد میں تھے۔ پشتوں سے ان کے بزرگ حکومتِ وقت کی ملازمت کرتے آئے تھے، اور گھر میں علم و فضل کا بھی دور دورہ تھا۔

ان کے جدِّ اعلیٰ قاضی محمد جلیس، عہدِ اورنگ زیب میں فتاوائے عالمگیری کی ترتیب و تدوین شریک رہے تھے۔ اسی باعث ان کے بعد یہ خاندان "قاضی زادے" کے لقب سے مشہور ہوگیا۔ چنانچہ بدایون کے جس محلّے میں یہ لوگ مقیم تھے، وہ آج تک "قاضی ٹولہ" کہلاتا ہے۔

ان کے دادا قاضی عظمت علی منصف اور صدرِ اعلیٰ کے عہدے پر فائز تھے، زمینداری بھی تھی۔ غرض دینوی عزّت اور آرام و آسایش کے تمام وسائل مہیّا تھے لیکن یہ خوشحالی ان کے والد قاضی محمد حسن کے ساتھ ختم ہوگئی۔ انگریزی حکومت کا زمانہ تھا۔ انھیں کوئی معقول ملازمت ملی نہیں، اور معمولی اور چھوٹی نوکری انھوں نے اپنے شایانِ شان نہ خیال کی۔ بیکاری اور مزاج میں ریاست کی ہوا! رفتہ رفتہ ساری املاک بک گئیں، جہاں عیش کے نقارے بجتے تھے، وہاں افلاس نے چھاؤنی چھالی۔

بدایون کا ماحول کچھ عجیب دین و دنیا اور شعر و حکمت کے امتزاج کا نام تھا۔

سید حسن کچھ حالات سے مجبور، کچھ اپنی افتادِ طبع کا تقاضا؛ ان کی تعلیم کا آغاز بھی عربی اور دینیات سے ہوا۔ اور بالآخر مدرسۂ قادریہ اور مدرسۂ شمس العلوم سے عربی اور علومِ قرآنی میں سندِ فراغ حاصل کی۔ پھر الٰہ آباد یونیورسٹی سے منشی فاضل (فارسی) اور مولوی فاضل (عربی) کے اعلیٰ امتحانات امتیاز سے پاس کیے۔

تعلیم جس نہج پر ہوئی تھی، اس میں معلّمی کے پیشے کے علاوہ اور کوئی سبیل رہ ہی نہیں گئی تھی۔ چنانچہ اوائل میں چندے انبالہ، بدایون، کانپور کے ہائی اسکولوں میں مدرّس رہے۔

۱۹۲۲ء میں ہماری سیاسی تحریک اپنے پورے شباب پر تھی۔ پوری فضا کانگریس اور خلافت کے نعروں سے گونج رہی تھی۔ نوجوان طبیعتوں میں جوش اور ہیجان تھا۔ جوان سید حسن بھی اس لپیٹ میں آ گئے، جوش و خروش سے میدانِ عمل میں کود پڑے اور جلسوں میں تقریریں کرنے لگے۔ لیکن جب گرفتاری کا وارنٹ کٹ گیا، تو اب عافیت اسی میں دیکھی کہ انگریزی علاقے سے ہجرت کر جائیں۔ رُوپوش ہو کر دسمبر ۱۹۲۲ء میں ریاست حیدر آباد دکن پہنچے، جو اس دور میں شمالی ہند کے شرفا کا واحد ملجا و ماوا تھا۔ مہینا بھر بعد جنوری ۱۹۲۳ء میں ریاست کے قانون کے مطابق حلف نامہ داخل کر کے ملکی صداقت نامہ (ریاست کی رعایا ہونے کا سرٹیفکٹ) حاصل کر لیا۔ انگریزوں نے بھی یہ خیال کر کے کہ چلو، بلا ٹلی، مزید پیچھا نہ کیا اور انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔

حیدر آباد میں بھی معلّمی کا پیشہ اختیار کرنا پڑا۔ اوّلاً چندے مدرسۂ آصفیہ میں پڑھاتے رہے، بعد کو شاہی خاندان کے نونہالوں کی درسگاہ "مدرسۂ اعزّہ" میں تبادلہ ہو گیا۔ یہیں تھے کہ نوجوان نواب کلیانی کے اتالیق مقرر ہو کر پائیگاہ پر چلے گئے۔ دو تین برس بعد مہاراجا سر کشن پرشاد یمین السّلطنت سے ملاقات ہوئی، تو ان کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ مہاراجا مرحوم کی مردم شناسی اور اپنے وابستگان کی ترقی پر توجہ ضرب المثل ہے۔ انھوں نے جاگیردار کالج میں ان کی ملازمت کا انتظام کر دیا۔

یہی زمانہ ہے جب حیدرآباد میں ملکی اور غیر ملکی تحریک چلی تھی۔ جب تک مہاراجا ان کی پشت پر تھے، سید حسن کی ملازمت کو کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔ لیکن انھوں نے استعفا دے دیا، تاکہ کسی کا احسان نہ رہے۔ اس کے بعد پھر مہاراجا ہی کی وساطت سے انھیں محکمۂ اوقاف میں جگہ مل گئی۔ ۳۶ برس کی طویل ملازمت کے بعد اسی محکمے سے پنشن پر سبکدوش ہوئے۔ عمر بھر کے قیام نے حیدرآباد کو ان کا وطنِ ثانی بنا دیا تھا۔ اس لیے اب وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اور بدایوں واپس نہیں گئے۔

ان کا گھر بھر شاعر تھا۔ دادا عظمت علی ضیا، والد محمد حسن اثر، چچا محمد حسین سحر، بڑے بھائی محمد محسن، محسن تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی سلطان حسن کا تخلص ابر تھا۔ ایسی شعرزدہ فضا سے یہ کیونکر بچ سکتے تھے! غرض بہت کم عمری میں شعر کہنے لگے۔ پہلے حسن تخلص کیا، بعد کو اسے حیرت سے بدل لیا۔ شعر پر کسی سے اصلاح نہیں لی، جو کہا، خود ہی دیکھ لیا اور حسبِ ضرورت اس میں ترمیم کر لی۔ اردو اور فارسی دونوں میں کہتے تھے؛ اردو میں آبگینہ (حیدرآباد ۱۹۷۳ء) اور فارسی میں ابریق (حیدرآباد ۱۹۷۴ء) مجموعے طبع ہو چکے ہیں۔ بچّوں کے لیے بھی کچھ چیزیں لکھی تھیں؛ یہ بھی شائع ہو چکی ہیں۔

۱۵ فروری ۱۹۷۵ء ہفتے کے دن نمازِ مغرب کے بعد سوا سات بجے راہیِ ملکِ بقا ہوئے۔ اگلے دن (۱۶ فروری) جنازے میں شہر کے تمام طبقات کے لوگ کثیر تعداد میں شریک ہوئے۔ درگاہِ یوسفین (نام پلّی) کے احاطے میں پائینتی کی طرف سپردِ خاک ہوئے۔ امیر مینائی اور داغ بھی اسی درگاہ میں محوِ خوابِ ابدی ہیں۔ رہے نام اللہ کا۔

۱۹۲۵ء میں اُن کی شادی جناب اعجاز حسین فرشوری کی صاحبزادی شکیلہ خاتون سے ہوئی تھی۔ وہ بحمدہٖ تعالیٰ حیات ہیں، اردو فارسی کی اچھی لیاقت کی مالک ہیں اور شعر و شاعری کا بھی ذوق رکھتی ہیں۔

اولادِ جسمانی میں چار بیٹے اور تین بیٹیاں اپنی یادگار چھوڑے۔ بیٹوں میں سب سے بڑے مویّد حسن ایم۔کام، ریجنل ریسرچ لیبارٹری میں اکیس رے کے شعبے کے مدیر ہیں۔ ان سے چھوٹے ڈاکٹر افضل محمد، عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ جغرافیا میں ریڈر رہیں۔ اور سنجھلے احمد جلیس ایم، اے، انوارالعلوم کالج میں اردو کے لیکچرر۔ سب سے چھوٹے محی الدّین حسن حکومتِ ہند میں ہیں۔ مشہور افسانہ نگار جیلانی بانو ان کی بیٹی ہیں۔

کلام بہت پختہ اور بے عیب ہے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میں غلط العام فصیح اور غلط العوام فصیح دونوں کو ڈھوکا سمجھتا ہوں؛ عام اور عوام میں کوئی فرق نہیں؛ غلطی عوام کی ہو یا خواص کی، وہ غلطی ہی رہیگی اور غلطی ہی کہلائیگی۔ اس لحاظ سے ان کا کلام دیکھا جائے، تو آپ کو اس میں کہیں کوئی سقم نظر نہیں آئیگا۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

وہ شباب، وہ جوش، وہ دل نہ رہا؛ وہ تڑپ نہ رہی، وہ مزا نہ رہا
تری آنکھ میں قدرِ وفا نہ رہی، مرے دل میں مذاقِ جفا نہ رہا
تری دُھن میں گیا ہوں وہاں کہ جہاں نہ غمِ دل وجاں، نہ غمِ دو جہاں
کوئی دُھن تری دُھن کے سوا نہ رہی، کوئی غم ترے غم کے سوا نہ رہا

دل ہی کی زندگی سے ہے دنیا کی زندگی — دنیا نہیں رہیگی، اگر دل نہیں رہا
حیرت! وہ میکشی نہ ہوئی، خودکشی ہوئی — قابو میں جب زباں نہ رہی، دل نہیں رہا

رنج میں ہنسنا، عیش میں رونا، موت کی شادی، زیست کا غم
سارے زمانے سے الٹی دنیا ہے محبّت، کیا کہنا!
دورِ شراب و نغمۂ دلکش، ابرِ سیاہ و موسمِ گل
آج کسی کی بزمِ طرب ہے غیرتِ جنّت، کیا کہنا!

آج یہ کون انجمن میں جلوہ فرما ہو گیا — بزم کا عالم، ابھی کیا تھا، ابھی کیا ہو گیا
میکدہ آباد، ساقی شاد، میکش زندہ باد — آج ہم جیسے فقیروں کا بھی پھیرا ہو گیا

غیروں کی وفا سے تو فراغت ہوئی حاصل
اپنوں کی جفا کا ہے ابھی بارِ گراں اور

دنیا فریبِ محض ہے، لیکن مفر نہیں
دنیا میں ہمنوائیِ دنیا کیے بغیر

پھر ہوش میں آجائیں جنوں چھوڑ کے، حیرت!
اب دل کو نیا روگ لگانے کے نہیں ہم

تم نہیں ہو، تو برسات کس کام کی!
آگ برسا رہے ہیں، یہ پانی کے دن

اپنی سی نہ کی کوئی کمی ہم نے دوا میں
چلتی نہیں انساں کی مگر، حکم خدا میں

ہے رحم کا وعدہ، تو کبھی قہر کی دھمکی
ڈالا مجھے کشمکشِ بیم و رجا میں

پیتے ہیں محتسب بھی، اکیلے ہمیں نہیں
لیکن وہ پی کے گھر سے نکلتے کہیں نہیں

منزل وہی قدم ہے، جہاں ٹوٹ جاتے دم
سچ پوچھیے تو عشق کی منزل کہیں نہیں

تم پہ میرا کوئی حق بھی نہیں، دعویٰ بھی نہیں
آج تک میں نے اس انداز سے سوچا بھی نہیں

دل ہے نادان کہ کرتا ہے بھروسا تم پر
تم تو تم ہو، مجھے اب دل کا بھروسا بھی نہیں

اب یہ لگتا ہے کہ برسوں کی محبت ہے، مگر
اس سے پہلے تمھیں میں نے کبھی دیکھا بھی نہیں

تم مہرباں تھے، تو سبھی مہرباں تھے
تم مہرباں نہیں تو کوئی مہرباں نہیں

خبر سنی جو قفس میں بہار آنے کی
نظر میں پھر گئی تصویر آشیانے کی

شام سے صبح ہو گئی، صبح سے شام ہو گئی
آپ کے انتظار میں عمر تمام ہو گئی

ترکِ بادہ کی باتیں، پاکباز! رہنے دے
بادہ خوار باز آئے ایسے خیرخواہوں سے

دونوں کی ضد نے خاک میں ہم کو ملا دیا
دل اختیار کا ہے، نہ تم اختیار کے

دل تم سے لگا کر یہ دعا مانگ رہا ہوں
انسان کا انسان سے خدا کام نہ ڈالے

موسیٰ کو صدا طور پہ آئی، تو یہ آئی
جاؤ بھی، بڑے آئے ہمیں دیکھنے والے!

موت ہے انسان کا آغاز بھی، انجام بھی
زندگی درحقیقت موت کی تاخیر ہے

مانا کہ دوسروں سے مخاطب ہیں وہ، مگر ہم خوب جانتے ہیں کہ ہم سے خطاب ہے
تم نے کیا کر دیا، خدا جانے دل ہمارا رہا، نہ ہم دل کے

دورانِ سفر میں ہیں رہرو، پایانِ سفر معلوم نہیں
رہبر کو رُخِ منزل تو کجا، خود راہگزر معلوم نہیں

یہ چاندکا رنگیں دھوکا ہے، یا سچ مچ نور کا تڑکا ہے
افسوس، ابھی آنکھیں تھیں، مرغانِ سحر معلوم نہیں

طوفان فضا میں چھا تو گیا، موجوں میں تلاطم آ تو گیا
اب دیکھیے، ٹکرا جائے کہاں، مڑ جائے کدھر معلوم نہیں

اک ٹیس سی تڑپا جاتی ہے، اک برق سی لہرا جاتی ہے
کیا کہیے کہ سینے میں زخمی دل ہے کہ جگر، معلوم نہیں

لاریب کہ صبحِ صادق کا دنیا میں تو برحق ہے آنا
البتہ ہمارے جیتے جی آ جائے گی سحر، معلوم نہیں

ہر چند کہ ہو تم ہم سے خفا، اوروں کی طرف رُخ ہے بھی، تو کیا!
کیا ہم کو تمھاری آنکھوں کی افتادِ نظر معلوم نہیں؟

اٹھتے نہیں دل کی سمت قدم، کرتے ہو طوافِ دَیر و حرم
اللہ کے بندو! تم کو بھی اللہ کا گھر معلوم نہیں

مانا کہ افق پہ پھوٹی کرن، دنیائے چمن بیدار ہوئی
آغازِ سحر معلوم سہی، انجامِ سحر معلوم نہیں

حیرت! انھیں انساں کیوں سمجھا! اب ہیں وہ پری، اب کیا شکوہ
جب حسن جوان ہو جاتا ہے، لگ جاتے ہیں پَر، معلوم نہیں؟

شمس منیری، حافظ شمس الدین احمد

ریاست بہار میں منیر بہت مشہور قصبہ ہے۔ یہ حضرت شرف الدین یحییٰ کی سکونت اور پھر وہیں تدفین کی وجہ سے منیر شریف کہلاتا ہے۔ یہی منیر، شمس کے بزرگوں کا وطن تھا۔ ان کے والد ضمیر الدین صاحب معمولی کاشتکار تھے، محنتی، دیانتدار، خدا ترس اور تعلیمیافتہ۔ اسی لیے وہ لوگوں میں مولوی ضمیر الدین کے نام سے مشہور ہوئے۔ انھیں گانو کے زمیندار کے ظلم و ستم سے عاجز آکر ترک وطن کرنا پڑا۔ اس پر انھوں نے گوالیار میں سکونت اختیار کرلی۔ یہاں انھوں نے بسر اوقات کے لیے ٹھیکیداری کا کام شروع کیا۔ اور رفتہ رفتہ فن تعمیر میں اتنی مہارت حاصل کرلی کہ انجنیئر کہلانے لگے، اور پھر اسی حیثیت سے ریاست میں ملازم ہوگئے۔ ان کی بقیہ زندگی گوالیار ہی میں گزری۔ یہاں عزت بھی حاصل ہوئی، اور روپیہ بھی خوب کمایا؛ یہ خدا نے ان کی نیک نیتی کا پھل دیا۔ ایک زمانے بعد وطن مالوف واپس آئے۔ اب دیکھیے قسمت کا کرشمہ! وہی زمیندار جس کی چیرہ دستیوں سے تنگ آکر انھوں نے ہجرت کی تھی، اپنے لچھنوں کے طفیل، ان حالوں پہنچ چکا تھا کہ اس کی جاداد فروخت ہو رہی تھی۔ مولوی ضمیر الدین نے یہ جاداد خرید لی۔ تِلکَ الأیامُ نُداوِلُها بینَ النّاس فرمانِ الٰہی ہے۔

شمس الدین احمد ۱۸۹۶ء میں ضلع پٹنہ کے گانو بلھوری، اپنی نانھیال میں پیدا ہوئے

پیدا ہوئے۔ تعلیمی اور بہت شاندار دور رہا۔ دسویں کا امتحان ۱۹۱۱ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے درجۂ اوّل میں پاس کیا، اور فارسی میں پوری یونیورسٹی میں اوّل آئے۔ انٹر کا امتحان بھی پٹنہ کالج کے طالبعلم کی حیثیت سے کلکتہ یونیورسٹی ہی سے درجۂ اوّل میں پاس کیا، اور اب کے صوبۂ بہار میں اول رہے۔ بی اے کے زمانے میں ان کے والد مولوی ضمیر الدین گوالیار میں مقیم تھے، یہ امتحان انھوں نے وکٹوریہ کالج، گوالیار سے، الہ آباد یونیورسٹی سے دیا، جس کے ساتھ یہ کالج ملحق تھا؛ اپنے کالج میں اوّل آئے اور ریاست گوالیار سے وظیفہ ملا۔ اس زمانے میں مولوی احسن اللہ خاں ثاقب وکٹوریہ کالج میں عربی اور فارسی پڑھاتے تھے؛ شمس الدین احمد ان کے چہیتے شاگرد تھے۔ اس کے بعد انھوں نے پٹنہ یونیورسٹی میں داخلہ لیا، اور وہاں سے ایم اے (فارسی) کی سند درجۂ اوّل میں حاصل کی، یونیورسٹی بھر میں اوّل آئے، اور طلائی تمغہ ملا۔ اسی دوران میں قانون کی سند (ایل ایل بی) بھی حاصل کرلی۔

اتنے شاندار تعلیمی دور کے بعد ملازمت میں کیا دشواری پیش آسکتی تھی! منظفرپور میں گریر بھومی ہار برہمن کالج تھا؛ شمس کا ۱۹۲۱ء میں وہاں اردو فارسی کے مدرس کی اسامی پر تقرر ہوگیا۔ سال بھر بعد راونشا کالج، کٹک (اڑیسہ) میں فارسی کی مدرسی مل گئی اور یہ وہاں چلے گئے۔ پانچ برس وہاں رہنے کے بعد ۱۹۲۷ء میں پٹنہ کالج میں اردو فارسی پڑھانے پر مقرر ہوئے۔ بقیہ زمانۂ ملازمت اسی کالج میں بسر ہوا؛ ۱۹۵۱ء میں اعزاز و اکرام سے یہیں سے سبکدوش ہوئے۔

مآخذ: پروفیسر سید حسن، پٹنہ؛ جناب قیّم الحق گیاوی، پٹنہ

۵ یہ کالج ایک مالدار امداد رجیز بھومی ہار بابو لنگٹ سنگھ نے قائم کیا تھا۔ گریر (Greer) اس وقت حاکم ضلع تھا، جس کا نام انھوں نے اپنے ساتھ شامل کرلیا۔ آزادی کے بعد حکومت وقت نے کالج کا نام صرف بانی سے منسوب کرکے لنگٹ سنگھ کالج رکھ دیا (L.S. College)۔ چنانچہ اس وقت یہی نام ہے۔

ملازمت سے فارغ ہو کر اولاً انھوں نے وکالت شروع کی، لیکن اس میں دل نہیں لگا۔ ساری عمر مدرسی میں گزری تھی، قانون کے ساتھ زیادہ مس کبھی نہیں رہا تھا، لہذا اس میں کچھ ایسی کامیابی نہیں ہوئی۔ اسی زمانے میں پٹنے میں شبینہ کالج کھل گیا اور یہ تعلیم و تدریس کے لیے وہاں مقرر ہو گئے۔ لیکن اب صحت بہت گر گئی تھی، اور اکثر بیمار رہنے لگے تھے۔ آخر میں اس ٹیٹ کی شکایت ہو گئی۔ اسی عارضے میں ۱۸ فروری ۱۹۷۵ء کو انتقال کیا۔ درگاہ شاہ ارزاں میں دفن ہوئے۔

شعر گوئی کالج کے زمانے سے شروع کی، اور اس میں اپنے کالج کے استاد ثاقب مرحوم کے مشورہ رہا۔ بعد کو جب ثاقب کا کلام نظم و نثر "گوہر بے نامہ" کے عنوان سے چھپا (لکھنؤ ۱۳۱۴ھ)، تو شمس نے اس کے شروع میں اردو میں تقریظ لکھی گمان ہے کہ انھوں نے ثاقب کے علاوہ اور کسی کو اپنا کلام نہیں دکھایا۔ ان کے کلام کا ایک مجموعہ "گلبانگ" کے نام سے چھپ چکا ہے (پٹنہ ۱۹۷۰) اس کے علاوہ انھوں نے نظیر اکبر آبادی کا مختصر انتخاب "اشعارِ نظیر" کے عنوان سے کیا تھا۔ یہ کتاب بھی چھپ چکی ہے (الہ آباد)

انھوں نے اپنی زندگی میں تین نکاح کیے۔ پہلی بیوی ان کی خالہ کی صاحبزادی تھیں۔ ان سے دو بیٹے ہوئے۔ ایک لڑکا عین عالم شباب میں بحالتِ جنون فوت ہو گیا؛ دوسرے حیات ہیں۔ اس بیوی کی وفات کے بعد دوسری شادی کی؛ اس کی اولاد موجود ہے۔ تیسری بیوی کی اولاد بھی ماشاءاللہ خوش و خرم موجود ہے۔

چند اشعار بطور نمونہ درج ہیں:

اللہ! یہ صنمکدہ کیسا بنا دیا! اس خاکداں کو حسن کی دنیا بنا دیا

صد جلوہ ہائے بوقلموں سے جہان کو آشوب گاہِ طورِ تجلّی بنا دیا

دشتِ وحشت میں وہ اب پہلی سی رونق ہی نہیں

موت نے مجنوں کی، ویرانے کو ویراں کر دیا

کیا سبکدوشی ہوئی، شمسؔ! امیری عشق میں
جان دی اللہ کو، دل نذرِ جاناں کر دیا

خزاں سے پامال ہو رہا ہے، چمن جو تھا اپنی آرزو کا
جو گل بظاہر شگفتہ ہیں بھی، نہیں ہے نام ان میں رنگ و بو کا

بھلا کرو گے بھلا ملیگا، بُرا کرو گے، بُرا ملیگا
اسی نے کاٹا ہے جس نے بویا، اسی نے چاٹا ہے جس نے تھوکا

اللہ ان کی یاد اب اتنی سی رہ گئی۔ گویا کبھی ملے تھے کسی میہماں سے ہم
منزل بھی ایک، راہ بھی ایک، اختلاف کیوں؟ بس یہ کہ بڑھ گئے ہیں ذرا کارواں سے ہم

کبھی ہم سے قول و قرار تھا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی چاہ بھی، کبھی پیار تھا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی وقتِ گرمیِ خوں بھی تھا کبھی عہدِ زورِ جنوں بھی تھا
کبھی جوشِ عہدِ بہار تھا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی جنگلوں میں قرار تھا کبھی شغلِ سیر و شکار تھا
یہی لطفِ لیل و نہار تھا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
تجھے بہت تمھارے بھی تھی ہمی دمِ امتحان رہا کوئی
یہی ایک شمسؔ نزار تھا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

بہت کم ہیں جمالِ روئے لیلیٰ دیکھنے والے زیادہ ہیں فقط محمل کا پردا دیکھنے والے

نہ چل او مستِ جامِ کامرانی اس قدر تن کے
بہت دیکھی ہیں تقدیریں بگڑتی ہم نے بن بن کے

مزا ہے آپ روٹھیں اور منائیں منّتوں سے ہم
قیامت ہے، مگر پھر روٹھ جانا آپ کا من کے

کوئی چھینٹا پڑے تو شمسؔ جنگل کو نکل جائیں
مثالِ داغؔ ہم بھی منتظر بیٹھے ہیں ساون کے

ہونٹوں پہ تبسم کلیوں کا، گالوں میں لالی پھولوں کی
کچھ پھول ادھر بھی دیتی جا، او بیچنے والی پھولوں کی!
پھاگن کی ہوائیں چلتی ہیں، شاخوں میں کلیاں کھلتی ہیں
اس فصل میں جوبن دکھلاتی ہے ڈالی ڈالی پھولوں کی
گنجوں کے اندھیرے میں روشن، پھولوں کے دیئے کر ڈالے ہیں
باغوں میں منائی فطرت نے کیا خوب دوالی پھولوں کی

اپنے بیگانے ہوئے اے جانِ جاں تیرے لیے
بن گئے دشمن زمین و آسماں تیرے لیے
ساتھیوں نے ساتھ چھوڑا، دوستوں نے دوستی
ہو گئے اپنے پرائے بدگماں تیرے لیے
کیسے ہم بیفکر تھے جب تک نہ تھا تیرا خیال
ایک آفت ہم پہ آئی ناگہاں تیرے لیے
سختیاں ساری سہیں تیرے لیے اے دلربا!
کھوئے سب آرام، اے آرام جاں تیرے لیے
جان تک اس نے لگا دی چاہ کی بازی میں آہ
کچھ نہ دیکھا شمس نے سود و زیاں تیرے لیے

یادِ سے دُو بدو نظر نہ ہوئی ۔ لاکھ چاہا کہ ہو، مگر نہ ہوئی
شب فرقت گزر ہی جائے گی ۔ کون سی شب ہے، جو سحر نہ ہوئی؟
وہ طلب کیا، جو در پہ ٹھیر گئی! ۔ وہ نظر کیا، جو پردہ در نہ ہوئی!
وائے وہ دعدہ جس کے تیور سے ۔ آتش شوق تیز تر نہ ہوئی

چاندنی کھل رہی ہے صحرا میں
شمسِ وحشی کو کیا خبر نہ ہوئی!

اعجاز حسین، ڈاکٹر سیّد

ان کے والد کا نام سیّد محمد شفیع تھا۔ وہ پولیس میں ملازم تھے۔ آدمی شریف اور مسکین طبع تھے لیکن تعلیم زیادہ نہیں تھی۔ اس لیے کوئی ترقّی نہ کر سکے۔ ان کے خسر سیّد حسین امیر اور رئیس آدمی تھے۔ الٰہ آباد کے مضافات کے محلّہ راجا پور میں خاصی جاداد کے مالک تھے۔ ان کے صرف چار بیٹیاں تھیں، نرینہ اولاد نہیں تھی۔ اسی لیے انھوں نے بیٹیوں کی شادیاں شریف، لیکن غریب نوجوانوں سے کیں اور سب کو خانہ داماد کی حیثیت سے اپنے ساتھ رکھا۔ یہی وجہ تھی کہ سید اعجاز حسین کی ولادت اپنی ننھیال میں ہوئی۔ انھوں نے خود لکھا ہے کہ سال کا یقین نہیں، ۱۸۹۸ء یا ۱۸۹۹ء تھا، لیکن مہینا یقیناً اگست کا تھا، اور جمعہ کا دن، وقت صبح صادق تھا۔ بعد کو انھوں نے یومِ آزادی کی مناسبت سے اسے ۱۵ اگست بنا لیا تھا؛ ظاہر ہے، کہ یہ فرضی تاریخ ہے۔ اور لطیفہ یہ ہے کہ ۱۵ اگست ۱۸۹۸ء کو جمعہ تھا، نہ ۱۵ اگست ۱۸۹۹ کو۔

سیّد حسین اپنے زمانے کے رئیسوں کی جملہ خوبیوں اور خامیوں سے متصف تھے۔ شعر بھی کہتے تھے۔ ذوق تخلّص کرتے تھے۔ بیک واسطہ ان کا سلسلۂ تلمّذ آتش سے ملتا ہے۔ وہ فارسی اور عربی کے دلدادہ تھے؛ اور انگریزی کے مخالف کیسی

قسم کا کام کاج کرنا دون مرتبہ سمجھتے تھے۔ آمدنی کا اور کوئی ذریعہ نہ تھا اندوختے سے سب شوق پورے ہو رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح تو قارون کا خزانہ بھی ساتھ نہیں دے سکتا۔ نتیجہ وہی ہوا جس کی کوئی بھی عقلمند پیشگوئی کر سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ حالت اتنی کمزور ہو گئی کہ گھر کا اگلا خرچ تک چلانا دوبھر ہو گیا۔ کہاں کبھی روپے کی وہ ریل پیل تھی، اور کہاں اب آمدنی گھٹتے گھٹتے ۲۰۔۲۵ روپے ماہانہ رہ گئی۔

سید اعجاز حسین کی تعلیمی رفتار بہت سست رہی۔ گھر کے ماحول کے باعث انھیں اردو اور فارسی شعر سے تو ضرور دلچسپی پیدا ہو گئی، بلکہ جلد ہی خود بھی تک بندی کرنے لگے، لیکن ریاضی اور اقلیدس سے ان کی جان جاتی تھی؛ اور دسویں درجے کی سند کے امتحان کے لیے یہ لازمی مضمون تھے۔ چنانچہ دو مرتبہ ناکامی کے بعد انھوں نے کلکتے کی راہ لی، جہاں یونیورسٹی میں ریاضیات کا معیار نسبتاً کم تھا اور اسی لیے یہاں سے وہ ۱۹۱۹ء میں دسویں درجے کی سند لینے میں کامیاب ہو گئے۔ اس وقت عمر عزیز ۲۰ برس سے متجاوز ہو چکی تھی۔

اس کے بعد انھوں نے میور سنٹرل کالج، الہ آباد میں داخلہ لے لیا۔ انٹر میں بھی ایک مرتبہ فیل ہوئے، لیکن لگے رہے۔ آخر کار مسلم یونیورسٹی سے انٹر اور ۱۹۲۴ء میں میور کالج سے بی اے کی سند لی۔ اسی دوران میں انگریزوں کو اردو پڑھاتے اور اپنے خرچ کی کفالت کرتے رہے۔ چونکہ اب سرکاری ملازمت کے لیے عمر زیادہ ہو چکی تھی، اس لیے انھوں نے یونیورسٹی میں ایم اے (اردو) میں داخلہ لے لیا۔ اور ۱۹۲۸ء میں اس شان سے یہ امتحان پاس کیا کہ اوّل درجے میں یونیورسٹی بھر میں اوّل آئے۔ اور سو روپے ماہانہ کا ریسرچ اسکالر شپ بھی ملا۔ جس سے مستقل آمدنی کی صورت پیدا ہو گئی اور تشویش کچھ کم ہوئی۔ پھر جب ۱۹۲۹ء میں وہیں اردو کے مدرس کی جگہ نکلی، تو اس پر ان کا تقرر ہو گیا۔

اب یہ ہر طرح مطمئن اور پرسکون زندگی گذارنے کی شاہراہ پر کھڑے تھے۔ اس میں اگر

افسوس کا کوئی پہلو تھا، تو یہ کہ ان کے وہ نانا (سید حسین) جنھوں نے انھیں پالا پوسا، پروان چڑھایا، پڑھایا لکھایا، ان کے آرام کی خاطر خود ہر طرح کی تکلیفیں جھیلیں، ان کے ملازم ہونے (۷ اگست ۱۹۲۹ء) سے پانچ مہینے پہلے (۲۱ مارچ ۱۹۲۹ء) رحلت فرما چکے تھے۔ انھیں اپنے چہیتے نواسے کی کامیابی دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔ اِنّا لِلّٰہِ و اِنّا اِلیہِ رَاجِعُونَ۔

سید سجّاد ظہیر مرحوم (ف: ستمبر ۱۹۷۳ء) نے اپنے بعض ہمخیال احباب کے تعاون سے ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنّفین کی بنیاد رکھی تھی۔ انھوں نے اس کے قیام اور استحکام کے لیے ملک کا دورہ کیا اور جگہ جگہ اس کی شاخیں قائم کیں۔ ۱۹۳۸ء میں انھوں نے الٰہ آباد میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اسی زمانے میں ان کے بعض اور ادیب دوست بھی یہیں مقیم تھے۔ ان میں ڈاکٹر زیڈ۔ اے احمد (زین العابدین احمد موجودہ رکنِ راجیہ سبھا)، کنور محمد اشرف اور پروفیسر احمد علی کے نام زیادہ نمایاں ہیں۔ اس اجتماع کا نتیجہ یہ نکلا کہ الٰہ آباد میں بھی انجمن ترقی پسند مصنّفین کی شاخ قائم ہو گئی۔ جلسے ہونے لگے، جہاں بحث مباحثے ہوتے، اور یوں شہر کے ادبی حلقوں میں گویا زندگی کی تازہ لہر دوڑ گئی۔ سید اعجاز حسین بھی اسی بھنور میں پہنچ گئے، بلکہ انجمن کے سکتر بنا دیے گئے۔ ان کی کتاب "نئے ادبی رجحانات" اسی ماحول میں لکھی گئی تھی۔

۱۹۲۸ء میں ایم اے کی سند لینے کے بعد انھوں نے پی ایچ، ڈی کے لیے ریسرچ میں داخلہ لے لیا تھا۔ موضوعِ مقالہ تھا: "اردو شاعری پر تصوف کا اثر" لیکن خدا معلوم کیوں، مقالہ پیش نہیں کیا۔ بہر حال وہ ڈاکٹریٹ کی سند کے بغیر ہی کام کرتے رہے۔ دس بارہ برس بعد انھوں نے ڈی لٹ کی سند لینے کی ٹھانی اور مقالہ بعنوان "مذہب و شاعری" تیار کیا۔ ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں میں اردو موضوع پر ڈی لٹ کی سند لینے والے وہ پہلے شخص تھے۔

ڈاکٹر اعجاز حسین یونیورسٹی میں بحیثیت لیکچرر ۱۹۲۹ء میں آئے تھے۔ وہ مدتوں

اسی عہدے پر رہے، پھر ریڈر مقرر ہوئے اور بالآخر پانچ چھ برس پروفیسر رہنے کے بعد یکم مئی ۱۹۶۱ء کو ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ اس کے بعد یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی طرف سے انھیں پانسو روپیہ ماہانہ کا تحقیقی وظیفہ عطا ہوا۔ "اردو شاعری کا سماجی پس منظر" اسی وظیفے کا قیمتی نتیجہ ہے۔

اگرچہ صحت عام طور پر اچھی رہی، لیکن عمر کے ساتھ ضعفِ قواء قدرتی عمل ہے، جس سے مفر نہیں۔ ۱۸ر فروری ۱۹۷۵ء کو ایک طالبعلم کے پی ایچ۔ ڈی کے امتحان کے سلسلے میں مظفرپور (بہار) گئے تھے، وہیں دل کا شدید دورہ پڑا۔ علاج معالجہ ہوا لیکن بےسود۔ یوں اپنے اعزہ اور خاندان سے دور، پردیس میں اتوار ۲۳ فروری ۱۹۷۵ء کو جاں بحق ہو گئے۔ لاش الٰہ آباد آئی اور اشوک نگر کے نواح میں سرستی گھاٹ کے قریب، اپنے ننھیالی قبرستان میں دفن ہوئے۔ ان کی مندرجہ ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں: (۱) آئینۂ معرفت؛ (۲) مختصر تاریخِ ادبِ اردو؛ (۳) نئے ادبی رجحانات (۱۹۴۲ء)؛ (۴) مذہب و شاعری؛ (۵) ملکِ ادب کے شاہزادے؛ (۶) اردو ادب آزادی کے بعد؛ (۷) ادب و ادیب؛ (۸) حیاتنا سیدنا (حضرت سید طاہر سیف الدین مرحوم)؛ (۹) ادبی ڈرامے؛ (۱۰) میری دنیا (۱۹۶۵ء)؛ (۱۱) اردو شاعری کا سماجی پس منظر وغیرہ۔ ان کے علاوہ کچھ کتابیں ہندی میں بھی ہیں۔

وہ ابھی طالبعلم تھے، جب ان کے نانا نے انھیں روزافزوں آوارگی اور تماشبینی سے بچانے کی خاطر ۱۹۲۲ء میں ان کی شادی کر دی تھی۔ ان سے آٹھ بچے ہوئے: پانچ لڑکے اور تین لڑکیاں۔ بحمدہٖ تعالیٰ سب خوش و خرم ہیں۔

جیسا کہ لکھ چکا ہوں، ان کے نانا مرحوم شعر کہتے تھے۔ گھر پر کتابوں کا معقول ذخیرہ تھا۔ آغاز میں ماحول بھی رنگین اور شعر انگیز تھا۔ اسی لیے وہ بہت اوائلِ عمر میں شعر کہنے لگے، تخلص اعجاز تھا۔ بہت دن تک نانا ابا ہی سے اصلاح لی لیکن جب وہ بصارت سے محروم ہو گئے، تو انھوں نے اپنے میور سنٹرل کالج کے

اسسٹنٹ پروفیسر (عربی و فارسی) شیخ مہدی حسن ناصری کا دامن تھاما۔ ان کی ادبی تربیت میں شیخ صاحب موصوف کا بہت ہاتھ تھا۔ دیوان آج تک شائع نہیں ہوا۔ بطور نمونہ چند شعر ملاحظہ ہوں، جو ان کی بیاض سے حاصل کیے گئے ہیں۔

جذبِ دل نے نشترِ غم کو رگِ جاں کر دیا
درد کو اس طرح اپنایا کہ درماں کر دیا
پیکرِ ہستی میں اک دھبّا سا تھا میرا وجود
ذوقِ بیتابی کے صدقے جس نے انساں کر دیا
موجِ غم سے داد کیا ملتی، دلِ برباد کی
میں نے خود، اعجاز! ہر قطرے کو طوفاں کر دیا

سفرِ حیات بھی ختم ہے، کہیں زندگی کا نشاں نہیں
ابھی اور ستم کے میں دیکھتا، میرے بس میں عمرِ رواں نہیں
میرے دل کی ہیں یہ کہانیاں جو بکھر گئی ہیں یہاں وہاں
یہ چمن میں لالہ و گل نہیں، یہ فلک پہ کہکشاں نہیں
نہ وہ بتکدہ میں کہیں ملا، نہ حرم میں اس کا پتا چلا
یہ اب اعترافِ شکست ہے، یہ جرس نہیں، یہ اذاں نہیں
دل و جاں کے بدلے میں کیا ملا، یہ سوال اہلِ ہوس سے کر
کہ میرا عشق عالمِ کیف ہے، یہ دیارِ سود و زیاں نہیں
میرے ٹوٹے دل کو تو دیکھیے کہ یہ بنتے بنتے بنا ہے دل
میری عمر بھر کا ریاض ہے جو یہ آشنائے فغاں نہیں

خدا ہی جانے، اب اس دل کا حال کیا ہو گا
کہ اس غریب کو مرنے کی بھی خوشی نہ رہی

بہار کیسی، کہاں کی خزاں، خدا جانے
خیالِ دید میں کچھ فکرِ زندگی نہ رہی
ہمیں سجودِ ملائک نے یوں کیا برباد
کہ بزمِ خاص میں کچھ قدرِ بندگی نہ رہی

غمِ دوراں پہنچ آیا غمِ جاناں کے قریب
آخر آہی گیا ہالۂ مہِ تاباں کے قریب
یہ تیری یاد ہے، یا دردِ محبت کی خلش
اک کسک ہوتی ہے رہ رہ کے رگِ جاں کے قریب
آبِ حیواں نے کیا، ذوقِ فنا سے محروم
ورنہ یہ خضر کبھی ہوتے کہیں انساں کے قریب

ابھی ہے زخم کا احساس، فکرِ مرہم ہے
ہنوز منزلِ اوّل ہے، غم فقط غم ہے
متاعِ غم کبھی نہ لٹ جائے اس اندھیرے میں
چراغِ راہِ محبت میں روشنی کم ہے
نہ کوئی ربط، نہ ترتیب، بزمِ انجم کی
مگر غزل کی طرح دلکش و منظّم ہے
نہ مل سکا، نہ ملیگا کسی کو روزِ ابد
مگر صحیفۂ عالم کا اک ورق گم ہے
خللِ دماغ کا ہو یا سکونِ دل اعجاز!
یہ عشق جو بھی ہو، وجہِ قیامِ عالم ہے

نگاہوں کا ملنا تو پل بھر سے کم تھا
وہ تہمت مگر جاوداں ہو گئی ہے

کمندِ زیں تا بہ افلاک پہنچی
بلندی کی پستی عیاں ہو گئی ہے
ہمہ نامرادی، ہمہ زندگانی
محبت بھی اک داستاں ہو گئی ہے

اپنی بیگم کی وفات پر جو مرثیہ کہا تھا، اس کا پہلا بند ہے:

یاد آتا ہے کہ جب سودائے بیش و کم نہ تھا
دامنِ عہدِ جوانی آنسوؤں سے نم نہ تھا
عالمِ شعر و شباب و مجمعِ احباب میں
زندگی کا راستہ سیدھا تھا، پیچ و خم نہ تھا
ذہن کی تکمیل ان ہاتھوں میں تھی، جن کے لیے
کاسۂ علم و ہنر بھی جامِ جم سے کم نہ تھا
گردشِ ایام کی اس چلچلاتی دھوپ میں
کاروانِ شوق لطف اندوز تھا، برہم نہ تھا
تلخیِ حالات بن جاتی تھی، پیغامِ حیات
راہ کا پتھر عصائے موسوی سے کم نہ تھا
اس فضائے جانفزا میں ایک تبدیلی ہوئی
چادرِ یکسانیت پر چڑھ گیا رنگِ دوئی

شفقت کاظمی، سیّد فضل الحسن

یہ خاندان اہلِ تشیّع کے امامِ ثامن حضرت امام رضا علیہ السّلام کا نام لیوا تھا جب ۲۰۳ھ ۸۱۸ء میں امام رضا کا انتقال ہوگیا، تو ان کے خلاف عراق سے نکل کھڑے ہوئے جسے جہاں جگہ ملی، اس نے وہاں پناہ لی۔ شفقت کے اسلاف بھی کابل، غزنی سے ہوتے ہوئے آکر شمال مغربی سرحدی صوبے میں بس گئے۔ یہاں ان کا قیام مدّتوں مختلف مقامات پر رہا۔ ایک زمانہ بعد پھر ایک شاخ نے وہاں سے بھی نقلِ مکان کیا، اور آکر ڈیرہ غازی خان (قدیم[^1]) میں رختِ سفر کھول دیا۔

جناب فضل الحسن شفقت نے اپنے نام کے ساتھ کاظمی کی نسبت حضرت امام رضا کے والد حضرت موسیٰ کاظم (امامِ ہفتم) کے باعث اضافہ کی تھی۔ بلکہ وہ کاظمی کبھی کبھی بطورِ تخلص بھی استعمال کرتے رہے۔ وہ ۱۴ فروری ۱۹۱۴ء کو ڈیرہ غازی خان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سیّد علی تھا (سیّد جزوِ عَلَم ہے) وہ پولیس میں ملازم تھے اور آخر تک اسی محکمے سے منسلک رہے۔ لطیفہ یہ ہے کہ بہت کم لوگوں کو معلوم

---

[^1]: قدیم اس لیے کہ موجودہ شہر نیا ہے۔ پرانا شہر دریائے سندھ کے ۱۹۰۸ء کے سیلابِ عظیم کی نذر ہوگیا۔ یہ شہر اس کے بعد وجود میں آیا۔ پرانے شہر کی نشانی چھاؤنی رہ گئی تھی؛ دریا کے رخ سے اندیشہ ہے کہ یہ بھی اب کچھ ہی دن کی مہمان ہے۔

تھا کہ وہ پولیس میں ہیں۔ گھر سے اپنے روزمرّہ کے معمولی کپڑوں میں تھانے جاتے اور وہاں پہنچ کر وردی پہن لیتے۔ کام کے بعد اسے وہیں چھوڑ آتے اور اپنے ذاتی لباس میں مکان پر آجاتے۔ بے ضرر منکسر اور مرنجان مرنج آدمی تھے۔ محرّم کی مجلسوں میں بڑے ذوق و شوق سے شرکت کرتے، اور بعض اوقات اس کے لیے خاصی لمبی مسافت طے کر کے جاتے۔ ۱۹۴۵ء میں انتقال ہوا۔ اور کربلائے قبرستان ٹالھی والا ڈیرہ غازی خان میں دفن ہوئے۔

شفقت صاحب نے دسویں درجے تک تعلیم پائی۔ اسکول میں جو کچھ پڑھا، وہ اپنی جگہ، لیکن اس کے علاوہ انھوں نے ذاتی طور پر اردو اور فارسی ادب کا اور اس میں بھی شعر کا مطالعہ خاص طور پر کیا۔ انھیں بےشمار شعر یاد تھے؛ جن سے نہ صرف شعر گوئی میں مدد ملی، بلکہ وہ علمی اور ادبی مجلسوں کی بھی گویا جان بن گئے۔

اتنی تعلیم پر کسی اچھی ملازمت کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔ بارے، گھر میں قناعت اور توکّل کا ماحول تھا۔ والد کی پنشن ۱۲ ۔ ۱۴ روپے مہینا تھی۔ ان کی والدہ کڑھائی کا کام بہت اچھا جانتی تھیں۔ اڑوس پڑوس کی عورتیں انھیں کپڑے کڑھائی کے لیے دیتی رہتی تھیں۔ اس طرح بسر اوقات ہو جاتی تھی۔ بہر حال تنگدستی کا زمانہ تھا۔ اب شفقت نے مقامی انڈسٹریل اسکول میں داخلہ لے لیا۔ اور وہاں بڑھئی کا کام، خاص کر فرنیچر بنانا سیکھ لیا اور اس طرح مہینے میں پندرہ بیس روپے کی یافت کا سامان ہو گیا۔

اسی زمانے میں وہ مرگی کے موذی مرض میں مبتلا ہو گئے۔ مدّتوں اس کے دورے پڑتے رہے۔ بصد آزار دوا دوش سے کوئی بارہ برس بعد اس سے چھٹکارا ملا۔ لیکن اس کا اثر زبان کی خفیف سی لکنت کی شکل میں آخر تک رہا۔ وہ "ر" اور "ڑ" ٹھیک طرح سے نہیں ادا کر سکتے تھے۔

اب وہ مقامی میونسپل کمیٹی میں چپراسی مقرر ہو گئے۔ سب افسر اُن کے کام سے بہت مطمئن تھے۔ چونکہ یہ لکھنا پڑھنا جانتے تھے، اس لیے انھیں ترقی دے کر محرّر چنگی

بنا دیا گیا۔ جب ملک تقسیم ہوا ہے، تو اس کے بعد وہ ریکارڈ کیپر مقرر ہو گئے اور اسی جگہ سے سبکدوش ہوتے۔ اپنی معمولی تنخواہ کے علاوہ انھیں کمیٹی کے تمام اجلاسوں کی کارروائی قلمبند کرنے کا خاص وظیفہ بیس روپے ماہانہ الگ ملتا تھا۔ تنخواہ کے ساتھ ایسے ملا کر تنگی ترشی سے بسر اوقات ہو جاتی تھی۔ آخری ایام میں انھیں ایک افسوسناک تجربہ ہوا۔ کمیٹی کے نئے منتظم ایک ایسے شخص مقرر ہو کر آئے، جو ان سے کسی بات پر ناراض ہو گئے۔ انھوں نے جا و بیجا انھیں دق کرنا شروع کیا۔ بات بات پر ڈانٹ ڈپٹ اور دھمکی ان کا معمول وغیرہ ہو گیا، اور بالآخر اس شخص نے ان کی تنخواہ میں سالانہ اضافہ بند کر دیا۔ شفقت نے محسوس کر لیا کہ اب خودداری کا خون کیے بغیر یہاں رہنا ممکن نہیں۔ اس پر انھوں نے مقررہ میعاد سے تین سال قبل پنشن کی درخواست دے دی اور نوکری سے الگ ہو گئے۔

شفقت نے شعر گوئی بعمر ۱۸ سال ۱۹۲۳ء میں شروع کی۔ ابتدائی مشق کے بعد انھوں نے مولانا حسرت موہانی (ف: مئی ۱۹۵۱ء) سے درخواست کی کہ انھیں شاگردی میں قبول کر لیں۔ نجانے کیوں، انھوں نے یہ درخواست منظور نہ کی۔ اس پر انھوں نے پہلے فیض احمد ندیم جعفری سے رجوع کیا۔ ندیم ڈیرہ غازی خان ہی کے رہنے والے ہیں؛ ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ عمر بھر کوآپریٹو محکمے میں ملازم رہے۔ افسر صدیقی امروہوی کے شاگرد ہیں۔ ایک مجموعۂ کلام "خانۂ زنجیر" شائع ہو چکا ہے۔ بفضلہٖ بقیدِ حیات ہیں۔

شفقت نے ندیم کے علاوہ صادق ایوبی (حاجی محمد) سے بھی مشورہ کیا تھا۔ صادق ۱۹۰۸ء میں ڈیرہ غازی خان میں پیدا ہوئے۔ شعر خاصا کہہ لیتے تھے۔ لیکن ان کا اصلی کام افسانے کے میدان میں ہے۔ انھوں نے انگریزی سے یورپ کی مختلف زبانوں کے بلامبالغہ بیسیوں افسانوں کا ترجمہ کیا۔ میاں بشیر احمد (مدیر ہمایوں) ان کے بڑے قدردان تھے، چنانچہ صادق کے بیشتر افسانے ہمایوں میں شائع ہوئے۔ معلوم نہیں کیوں، انھوں نے ۱۹۳۲ء میں ادبی میدان ترک کر دیا۔ اور خرافات

نویسی کا پیشہ اختیار کیا۔ قانون کی پیچیدگیوں کو خوب سمجھتے تھے۔ اس پیشے میں بہت کمایا اور خوشحال زندگی بسر کی۔ ۱۹۴۷ء میں انتقال ہوا۔

شفقت نے چار برس کی مشق کے بعد ۱۹۴۰ء میں دوبارہ حسرت سے اصلاح کی خواہش ظاہر کی۔ اب کے انھیں کامیابی ہوئی، اور حسرت نے ان کی درخواست منظور کر لی۔ حسرت کی وفات تک وہ ان سے مشورہ کرتے رہے۔ اس کے بعد ہمیشہ اپنے نام کے ساتھ "خاک پائے حسرت موہانی" لکھتے رہے۔

شفقت شروع میں نظم اور غزل دونوں کہتے تھے۔ لیکن حسرت کی شاگردی کے بعد غزل کے لیے وقف ہو کر رہ گئے۔ ان کے کئی مجموعے شائع ہوئے۔ بالکل ابتدائی کلام ان کے دوستوں نے "نغمۂ ناہید" کے نام سے چھاپا تھا۔ یہ تو دیکھنے کو نہیں ملا۔ بعد کے مجموعے، حسرتکدہ (مظفر گڑھ ۱۹۵۸ء)؛ نغمۂ حسرت (مظفر گڑھ ۱۹۵۹ء)؛ داغِ حسرت (لاہور ۱۹۷۰ء)؛ زخمِ حسرت ملتے ہیں۔ بہت پختہ کلام ہے۔ غزل کی تمام خصوصیات ان کے کلام میں بدرجۂ وافر ملتی ہیں۔

ابتدائی عسیر الحالی کے باعث صحت ہمیشہ خراب رہی۔ ۱۹۶۱ء / ۱۹۶۲ء میں ذیابیطس کا گھلا دینے والا عارضہ لاحق ہو گیا اور آخر تک وبالِ جان رہا۔ جون ۱۹۶۳ء میں دل کے مرض میں مبتلا ہو گئے۔ جیسے یہ تمام عوارض کافی نہ ہوں، اواخر ۱۹۷۴ء میں جسم کے بائیں حصے کو فالج نے بیکار کر دیا اور وہ مستقلاً صاحبِ فراش ہو گئے۔ حکومت نے توجہ کی اور انھیں علاج کے لیے مقامی اسپتال میں لے گئے۔ وہیں ۱۸ مارچ ۱۹۷۵ء کو فالج کا ذہنی طرف حملہ ہوا، جس سے بیہوش ہو گئے۔ اسی حالتِ غشی میں ۱۲ مارچ ۱۹۷۵ء کو ظہر کے وقت روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ چونکہ یہ ۲۸ رجب تھی، اس لیے اسے مبارک خیال کرتے ہوئے اسی شام انھیں اپنے والد کے جوار میں (کربلائے ٹاہلی والا میں) سپردِ خاک کر دیا گیا۔

کئی اصحاب نے قطعاتِ تاریخ کہے۔ سید فدا بخاری نے "مرگِ دلخراش" سے تاریخ نکالی (۱۳۹۵ھ)۔ عیسوی تاریخ میں سید چراغ علی شاہ آزاد نے یہ قطعہ

لکھا :-

توڑی گردوں نے ہم پہ یہ کیا جفا، ہائے! سینہ اپنا ہے، اور ترکشِ قضا، ہائے!
اٹھ گئی رسمِ اخلاصِ دل زمانے سے بجھ گئی شمعِ غمخانۂ وفا، ہائے!
شاعرِ بے بدل، قادر الکلام ادیب نغز گو، نکتہ سنج و سخن سرا، ہائے!
تاجدارِ غزل، سحر شیوہ حسرت پر سدا خود کو سمجھا وہ خاکپا، ہائے

فکرِ تاریخ پر آئی یہ ندا، آزاد!
"سیّدِ شفقتِ کاظمی چلا، ہائے" (۱۹۷۵ء)

شفقت کی شادی اپنے چچا سیّد جند وشاہ کی بیٹی سکینہ بی بی سے ہوئی تھی سیّد جند وشاہ پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر تھے۔ مدتوں حکومت کی ملازمت کی۔ اس سے سبکدوش ہوئے، تو اپنا مطب جاری کر لیا۔ اس سے اچھی خاصی آمدنی تھی۔ آرام و آسایش کی زندگی گزاری۔ شفقت کی جسمانی اولاد صرف ایک لڑکا نجیب الحسن رضوی ان سے یادگار ہے۔ انھوں نے بی، اے تک تعلیم پائی ہے۔

کافی ہے اپنے رفعِ تردد کے واسطے
ان کی "نہیں" بھی عرضِ وفا کے جواب میں
بیزار ہو سکے نہ تری آرزو سے ہم
تھی شانِ اعتنا جو ترے اجتناب میں

دلچسپیاں بہت تھیں دلِ مرحوم! تجھ سے تھیں
جب تو نہیں، تو رونقِ بزمِ جہاں نہیں
تجھ سے بچھڑ کے، سب کی نظر میں ذلیل ہیں
تو مہرباں نہیں، تو کوئی مہرباں نہیں

مقدر میں لکھی تھی باہم جدائی نہ تم بیوفا ہو، نہ ہم بیوفا ہیں

بسر ہو ہی گئے دن زندگی کے تجھے کیا، شاد یا ناشاد تھے ہم

اسباب اور بھی مری بربادیوں کے تھے
کیا جانے کیوں زباں پہ ترا نام آگیا!

بات جب بڑھ گئی، تو کیا کرتے ـــــ ہم کو یارائے اختصار نہ تھا

بڑے مزے میں گزرتی تھی زندگی شفقت!
خوشا وہ عہد کہ ان سے نہ تھی شناسائی

سرگزشتِ حیات کیا کہیے! ـــــ خیر، اچھی بری گزر ہی گئی

بات اپنی وفا کی جھوٹ نکلی ـــــ آخر میں تری جفا سے ہارا
کیوں روئیں وہ تری دشمنی کو ـــــ جن کو تری دوستی نے مارا
کچھ اور بھی آسرے تھے، لیکن ـــــ جب وقت پڑا، تجھے پکارا

تری نگاہ تو اٹھی تھی بے سبب مجھ پر ـــــ یہ اور بات ہے کہ مجھ کو فریب کھانا تھا

ایفائے عہد کر نہ سکے وہ، تو کیا ہوا
خود اپنی زندگی کو بھی ممکن تھا ثبات

باغ پر اپنا بھی کچھ حق تھا، مگر ـــــ باغ میں جب تک نہ آئی تھی بہار

خوش ہو کے سہہ رہا ہوں تری ہر جفا ہنوز
ثابت نہیں اگرچہ کچھ اپنی خطا ہنوز

وہ ایک درد جس نے بنا دی ہے جان پر
وہ ایک درد جان سے پیارا ہے آج تک

گزری ہے قفس میں عمر، لیکن ـــــ بھولے نہیں یادِ آشیاں ہم
کچھ بس نہ چلا تری جفا پر ـــــ دیکھا کیے سوئے آسماں ہم
اپنی قسمت تھا داغِ رسوائی ـــــ کیا کریں اب تجھے پشیماں ہم!

سب کا مقصود ذکر تھا تیرا ـــــ جتنے قصے تجھے سناتے ہیں

کیا ختمِ سفر پہ یاد کرتے ـــــ گزریں جو مصیبتیں سفر میں
ہر راہ سے بے نیاز ہو کر ـــــ لوٹ آتے ہیں تیری رہگزر میں

ظلم ڈھائیگی، کہاں تک دنیا! کہیں اپنا بھی خدا ہے کہ نہیں؟
جن کو تیری نگاہ بھول گئی اب کوئی ان کو پوچھتا بھی نہیں

تھکا دیا ہے زمانے کی گردشوں نے بہت
تری گلی میں اجازت ملے، تو دم لے لوں
زمانہ دیکھ چکا ہے مری وفا کا مآل
کسی پہ اب نہ چلیگا تری نظر کا فسوں

جب سزاوارِ غم بھی نہ سمجھے گئے ہم کریں اور امید کیا آپ سے!
آج حیراں ہیں یوں، آپ سے مل کے ہم جیسے اب تک نہ تھے آشنا آپ سے
اس زباں سے ترا گلا کیوں ہو! جس زباں سے تری تمنا کی ہو
رو دھو کے یہ سال بھی گزارا اب کے بھی پھرے نہ دن ہمارے
خود ہی ان تک جا پہنچے ہم قاصد سے کچھ کہتے کہتے

تری ادائے کرم، لاکھ دلفریب سہی
مگر وہ دل جو تری بے رخی پہ مرتا ہے
جب اٹھ کے آ گئے ہیں، تو اب اس سے کیا غرض
ہم بھی کبھی تھے آپ کی محفل میں، یا نہ تھے
کیا کیا ہوا ہے ترکِ محبت پہ انفعال
آئی ہے تیری یاد جو پھر ناگہاں مجھے
جینے کی ہوس وہ کیا کریگا مرنے کو بھی جو ترس رہا ہے

جفائے خاص کے لائق مجھی کو ٹھیرایا
اب اور اس کے سوا کیا کرے وفا کوئی!
کسے خبر کہ حدیثِ جہاں کے پردے ہیں
خود اپنے غم کا فسانہ سنا گیا کوئی

ایسے نکلے تری انجمن سے کہ ہم عمر بھر کے لیئے بے ٹھکانا ہوتے

جو رِیجا کے لائق تو سمجھا ہمیں
اتنی امید بھی تھی کہاں آپ سے

یاد کرنے پہ بھی یاد آتا نہیں
کس گھڑی ہم ملے تھے کہاں آپ سے

ان کا خیال، ان کا تصور ہے آج تک جن سے کہیں ملے، نہ کبھی جن سے بات کی

لگتا ہے یوں کہ جیسے ابھی دل کی دل میں ہے
حال آں کہ ان سے قصۂ غم بار ہا کہا

شمیم کرہانی، شمس الدین حیدر

اگرچہ اعظم گڑھ (یو پی) کا قصبہ کرہان آبائی وطن تھا لیکن ان کی ولادت ۸ جون ۱۹۱۲ء (۲ رجب ۱۳۳۱ھ) کو اپنی نانہیال پارہ (ضلع غازی پور) میں ہوئی۔ کرہان کے سادات حضرت میر شمس الدین عرف میر شمسی (ف: ۱۰۶۰ھ) کے نام لیوا ہیں۔ میر شمسیؒ کا اپنے زمانے کے مشہور صوفیہ اور اہل اللہ میں شمار ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی میں سات حج پیادہ پا کیے تھے۔ اس علاقے میں ان کی کرامات کے دسیوں قصے زبانزدِ خاص و عام ہیں۔ اسی لیے جب یہ پیدا ہوئے، تو ان کے والد سید محمد اختر نے بطورِ تفاؤل ان کا نام شمس الدین حیدر رکھا۔ گھر میں پیار کا نام شمسو تھا۔ ان سے تین بڑے بھائی تھے، علی بخش غضنفر، اعظم حسین، حسام الدین حیدر۔ ایک بھائی علی حیدر، اور ایک بہن نرگس خاتون ان سے چھوٹے تھے۔

جب تعلیم کی عمر کو پہنچے، تو اس زمانے کے دستور کے مطابق بسم اللہ گھر پر ہوئی جب یہ مرحلہ طے ہو گیا، تو انھیں بڑے بھائی سید علی بخش غضنفر کے پاس گورکھپور بھیج دیا گیا، جو وہاں ملازم تھے۔ وہاں کچھ پڑھا لکھا ہو گا۔ لیکن گورکھپور کا قیام بہت مختصر رہا، جلد ہی وہاں سے واپس آ کر انھوں نے وثیقہ عربی اسکول فیض آباد میں داخلہ لے لیا۔ اس مدرسے میں دینیات کی رسمی تعلیم کے علاوہ عربی اور فارسی پڑھانے کا خاص انتظام تھا۔ چنانچہ یہاں انھوں نے عربی اور فارسی

کی تعلیم پائی اور اسی سے یونیورسٹی کے "مولوی" اور "کامل" کے امتحان بھی پاس کیے۔ اس زمانے میں انھوں نے انگریزی نہیں پڑھی۔ یہ کمی انھوں نے بہت دن بعد پوری کی۔ پہلے دسویں کی سند حاصل کی اور پھر انٹر کی۔ اپنی منصبی مصروفیتوں کے باعث بی اے کے امتحان کی تیاری نہ کر سکے؛ اور اس کمی کا احساس انھیں آخر تک رہا۔

وثیقہ عربی اسکول سے فارغ ہونے کے بعد انھوں نے ڈی، اے وی ہائی اسکول اعظم گڑھ میں ملازمت اختیار کر لی۔ یہاں وہ فارسی اور اردو پڑھاتے تھے۔ مقررہ تنخواہ قلیل تھی، اور جو کچھ واقعی ملتا تھا وہ قلیل تر تھا؛ اور ستم یہ کہ اس کی بھی وقت پر ادائی ہمیشہ غیر یقینی رہتی۔ یہ صورتِ حال کسی عنوان اطمینان بخش نہیں تھی۔ بالآخر انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ مدرسی کو خیر باد کہہ کر کوئی اور پیشہ اختیار کیا جائے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ہندستان کی صنعتِ فلمسازی روز افزوں ترقی کر رہی تھی، اور ہمارے بیشتر شاعر اور ادیب اس سے منسلک ہو گئے تھے ـــ اعظم گڑھ کے قیام کے زمانے میں ان کا تعارف ماسٹر سیّد منوّر حسین رضوی سے ہو گیا، جو وہاں کے سماجی حلقوں میں خاصی معروف اور ذی اثر شخصیت تھے۔ سیّد منوّر حسین کے ایک بھائی سیّد شوکت حسین رضوی فلمیں بناتے تھے، مشہور ملکۂ ترنّم نورجہاں ان کی بیوی تھیں۔ سیّد شوکت حسین نے شمیم کو مشورہ دیا کہ وہ ان کے ساتھ لاہور چلیں، اور پنچولی پکچرز کی فلموں کے لیے گانے لکھیں۔ یہ مدرسی سے اور قلیل آمدنی سے تنگ تو آ ہی چکے تھے؛ کچھ ان ادیبوں کی اچھی اوقات ان کے سامنے تھی، جنھوں نے فلم کی راہ اختیار کی تھی، کچھ سیّد شوکت حسین نے بھی سبز باغ دکھائے، انھوں نے لاہور جانے پر آمادگی کا اظہار کر دیا۔

وہ لاہور پہنچے، چند فلموں کے لیے گانے لکھے۔ اپنے مخصوص خاندانی ماحول کے زیرِ اثر وہ موسیقی پہلے سے جانتے تھے اور اس کے بنیادی اصول سے انھیں اچھی

واقفیت تھی، فلموں کے لیے یہ علم بہت مفید ثابت ہوا۔ بلکہ اس میں اور گہرائی پیدا ہو گئی، آواز بھی بہت اچھی تھی۔ یہ سب باتیں بعد کو مشاعرہ بازی کے دور میں بہت کار آمد ثابت ہوئیں۔ لیکن انھیں فلم کا خالص کاروباری ماحول راس نہ آیا۔ انھوں نے گھر کی زمینداری دیکھی تھی، اگرچہ ان تک آتے آتے وہ رئیسانہ ٹھاٹ باٹ سب ختم ہو چکا تھا، تاہم ابھی رسّی کا بل نہیں گیا تھا۔ غرض کہ جلد ہی ان کا دل اچاٹ ہو گیا اور وہ واپس اعظم گڑھ چلے آئے۔

اعظم گڑھ میں اب ڈی لے وی اسکول کی وہ پہلی نوکری اُن کی دسترس سے باہر تھی کیونکہ ان کی غیر حاضری میں وہاں اور انتظام ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ اب ان پر دلّی کی کشش غالب آنے لگی، جو اردو، فارسی علوم کا بہتر مرکز تھا۔ انھوں نے بعض دوستوں سے اپنی خواہش کا اظہار کیا اور کوشش کرنے سے انھیں ۱۹۵۰ء میں اینگلو عربک ہائر سیکنڈری اسکول میں فارسی کے مدرّس کی جگہ مل گئی۔ وہ اپنی وفات کے وقت اسی اسامی پر متمکن تھے۔

انھیں اختلاج قلب کا عارضہ بہت دن سے تھا، توہّم کے بھی شکار تھے۔ اسی باعث اکیلے سفر کرنے سے بالعموم اجتناب کرتے، کوئی نہ کوئی دوست یا ان کا اپنا بچّہ ان کے ہمراہ جاتا۔ اس کے باوجود اس کا سان گمان بھی نہیں تھا کہ انجام اتنا قریب ہے۔ ۱۸ مارچ ۱۹۷۵ء شام کے وقت وہ ایک مقامی مشاعرے میں شریک ہوتے۔ وہیں طبیعت بگڑ گئی اور بیہوش ہو گئے۔ فوراً قریب کے ارون اسپتال میں پہنچا دیے گئے۔ معاینے پر تشخیص ہوئی کہ دماغ کی نس پھٹ گئی ہے۔ اگلے دن (۱۹ مارچ) صبح ساڑھے سات بجے بیہوشی کے عالم ہی میں جاں بحق ہو گئے۔ جنازہ اسی شام اٹھا اور ان کی خواہش کے مطابق جامعہ ملّیہ اسلامیہ، جامعہ نگر کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔ انّا للّٰہ وانّا الیہ راجعون۔

ان کا نکاح ۳۰ جنوری ۱۹۴۴ء کو نگرام کے میر حسن عسکری صاحب کی بڑی صاحبزادی کاظمی بیگم سے ہوا تھا۔ پروفیسر سید احتشام حسین مرحوم (ف: ۲ء۱۹۷۲ء) ان کے

ہمزلف تھے۔ دونوں براتیں ایک ہی دن گئی تھیں۔ بڑی بہن شمیم کے عقد نکاح میں آئیں اور چھوٹی ہاشمی بانو، سید احتشام حسین کے۔ شمیم نے تین صاحبزادے اپنی یادگار چھوڑے ہیں: سید حسین اختر (عرف مراد) سید عابد اختر (عرف عماد) اور سید باقر اختر (عرف سلمان)۔ ان ناموں میں اختر کا لاحقہ شمیم مرحوم کے والد سید محمد اختر کی نسبت سے ہے۔

ان کے گھر کا ماحول علمی اور ادبی تھا۔ والد شاعر تھے؛ اختر ان کا تخلص تھا۔ بڑے منجھلے بھائی اعظم حسین کا تخلص اعظم تھا، حکیم زکی حسین اور ان کے دونوں چھوٹے بھائی سید احمد علی احمد اور سید محمد علی رسا سب شاعر اور رشتے میں ان کے چچا ہوتے تھے۔ غرض ان کے بچپن میں ان کے اردگرد شاعری کا چرچا تھا۔ اس کا اثر ہونا ہی چاہیے تھا، یہ بھی کمسنی میں تُک بندی کرنے لگے۔ خاندان کی مذہبی روایت کے باعث شروع میں سوزخوانی پر بھی توجہ رہی اور خود بھی سلام اور نوحے لکھتے رہے۔ بعد کو غزل اور نظم کو ترجیح دینے لگے۔ چندے آرزو لکھنوی (ف: اپریل ۱۹۵۱ء) سے اصلاح لی۔ لیکن چونکہ اس زمانے میں ان کا رجحان نظم کی طرف زیادہ تھا، اس لیے آرزو سے استفادہ بہت محدود رہا۔

ان کی شاعری کا آغاز ہماری سیاسی تحریک کے متوازی رہا۔ اس دور میں ان پر جوش ملیح آبادی کا بہت اثر تھا۔ انھوں نے بھی سیاسی نظمیں لکھیں، جن کا مجموعہ بعد کو "روشن اندھیرا" کے عنوان سے چھپا۔ (۱۹۴۳ء) اس کا سارا خرچ رفیع احمد قدوائی مرحوم (ف: اکتوبر ۱۹۵۴ء) نے اپنی جیب سے دیا تھا۔ ان کے بعض دوسرے شعری مجموعے یہ ہیں: برق و باراں (منظومات)؛ عکسِ گل (لکھنؤ: ۱۹۶۴ء)؛ حرفِ نیم شب (دلی: ۱۹۷۲ء)؛ جانِ برادر (دلی: ۱۹۷۳ء) پروفیسر احتشام حسین کا مرثیہ؛ صبحِ فاراں (دلی: ۱۹۷۲ء) انھوں نے پنڈت جواہر لال نہرو مرحوم (ف: مئی ۱۹۶۴ء) کی فرمایش پر جنگِ آزادی کی منظوم تاریخ "تلاشِ سحر" کے عنوان سے لکھنا شروع کی تھی۔ اس کے متعدد ابواب موقت الشیوع جرائد میں

شائع ہوئے تھے، لیکن افسوس کہ یہ نظم مکمل نہ ہو سکی۔ اور بھی معتد بہ غیر مطبوعہ کلام موجود ہے۔

ان کا کلام بیحد پختہ اور بلیغ ہے، اس لیے بجا طور پر ان کا اس دور کے صفِ اوّل کے شعراء میں شمار ہوتا تھا۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

آنکھوں سے لگا مجھ کو، گردِ رہِ منزل ہوں
برباد سہی لیکن، بربادِ غمِ دل ہوں

جشنِ حیات ہو چکا، جشنِ ممات اور ہے
ایک برات آ چکی، ایک برات اور ہے
ان کو شمیم! کس طرح نامۂ آرزو لکھیں
لکھنے کی بات اور ہے، کہنے کی بات اور ہے

شکستِ دل کی بھلا آپ کو خبر کیوں ہوا
گرا تھا جام، نہ ٹوٹا تھا کوئی آئینہ
یہ بات پیار میں ہوتی تو ہے، مگر کیوں ہوا
کبھی نہ روٹھنے والے بھی روٹھ جاتے ہیں

دل سے شمیم! گفتگو، کیجیے کب تلک چلے
رات بھی مختصر نہیں، بات بھی مختصر نہیں
جو میکدے میں ہو جھگڑا، تو پہلے یہ دیکھو
کہ میکدے میں کہیں شیخ و برہمن تو نہیں

وہ سرزمیں جو مآلِ گناہِ آدم ہے
بہشت سے بھی زیادہ حسین نظر آئی

آدابِ جنوں مانگے، آئینِ وفا مانگے
کیا دل ہے کہ اک دنیا، دنیا سے جدا مانگے
اک جانِ طلب تم ہو، تم مل ہی نہیں سکتے
دنیا سے یہ دل آخر، مانگے بھی تو کیا مانگے
دنیا کے اجالوں نے لوٹا ہے، شمیم! ایسا
دل بزمِ چراغاں میں، آندھی کی دعا مانگے

چاک ہے کس لیے انسان کا سینہ، نہ کہو
یہ بتاؤ کہ تبسم بھی ہے اک زخم کا نام

احساسِ انا کیا ہے، احساسِ وجود اپنا
ہم کو نہ چھڑا ہم سے، رہ جائیںگے ہم تنہا
ہمیں بھی دیکھ کہ شاید تجھے نہیں معلوم
"جہاں نگر" ہمہ عالم ہے "خود نگر" تنہا
اب اپنے ساتھ ہجومِ غمِ زمانہ ہے
چلے تھے جب تو غمِ دل تھا ہمسفر تنہا
نہ جانے غربتِ اہلِ نظر پہ کیا گزرے
زمانہ سنگ بکف اور شیشہ گر تنہا
ایسا نہ ہو کہ جوشِ جنوں تھک کے بیٹھ جائے
ہوتی رہے خرد سے ملاقات گاہ گاہ
شگفتِ گُل کا تبسم بھی حرف دلکش ہے مگر کہاں ترے اندازِ گفتگو کی طرح
تمھاری بات نہیں، تم تو باوفا ٹھہرے گلہ ہے ان سے، جو ایفائے عہد تک نہ جیے
زخمِ جبیں کا ماجرا، تم سے، تبسم! کیا کہیں!
کوچۂ غیر سے نہیں، اپنی گلی سے آئے ہیں
سمجھے ہے مفہوم نظر کا، دل کا اشارہ جانے ہے
ہم تم چپ ہیں، لیکن دنیا حال ہمارا جانے ہے
ہلکی ہوا کے اک جھونکے میں، کیسے کیسے پھول گرے
گلشن کے گل پوش نہ جانیں، گلشن سارا جانے ہے
شمعِ تمنا، پچھلے پہر تک، درد کا آنسو بن ہی گئی
شام کا تارا کیسے ڈوبا، صبح کا تارا جانے ہے
کیا کیا ہیں آئینِ تماشا، کیا کیا ہیں آدابِ نظر
چشمِ ہوس یہ سب کیا جانے، وہ تو نظارہ جانے ہے

اپنے شمیمؔ رسوا کو تم جانو ہو انجان کوئی
بستی ساری پہچانے ہے، صحرا سارا جانے ہے

شمیمؔ! عہدِ گذشتہ کی گفتگو نہ کرو وہ دن گئے، وہ محبت گئی، وہ بات گئی

سکوں کی چمک پہ گرتے ہوئے، دیکھا ہے شیخ و برہمن کو
پھر میرے کھنڈر کی قیمت کیا، جب دیر و حرم بِک جاتے ہیں

جو کہہ رہے ہیں کہ آتی نظر نہ منزلِ دوست
وہ لوگ جانبِ دیر و حرم گئے ہونگے

غمِ عشق دل کو بخشے، جو نشاطِ جاودانی
تو حیاتِ مختصر کا غمِ بے ثبات کیا ہے

جو مذاقِ رنگ و بو ہو، تو دلوں کا بھید کیسا
کہیں موجِ گل نے پوچھا کہ صبا کی ذات کیا ہے؟

خاموش نہ تھا دل بھی، خوابیدہ نہ تھے ہم بھی
تنہا تو نہیں گزرا، تنہائی کا عالم بھی

مانی ناگپوری، بشیر خان

ان کا خاندان در اصل بھوپال کا رہنے والا تھا، جہاں سے ان کے جدِ مرحوم امیر خان ۱۸۵۷ء کی شورش کے زمانے میں ترکِ وطن کر کے ناگپور چلے آئے؛ اور پھر یہیں کے ہو کے رہ گئے۔

امیر خان کے چار بیٹے تھے: کریم خان، منیر خان، نظیر خان، نصیر خان، سب سے بڑے کریم خان ہی بشیر مانی کے والد تھے۔ کریم خان کی شادی ناگپور کے مشہور پٹھان گل میر خان کی دختر امتیاز بی سے ہوئی تھی۔ امتیاز بی اپنی ننھیال کی طرف سے ایک نو مسلم گونڈ خاندان سے تھیں، جو گونڈ حکمرانوں کے یہاں ملازم تھے۔ بشیر خان سے بڑی ایک بہن حور خانم تھیں۔ ان کا عنفوانِ شباب میں انتقال ہو گیا۔ گویا اس کے بعد بشیر خان اپنے والدین کی اکلوتی اولاد رہ گئے۔

بشیر خان اپنی ننھیال میں ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو پیدا ہوئے، جہاں ان کے والد کریم خان، خانہ داماد تھے۔ اپنے زمانے کی فارسی، عربی، اور اردو تعلیم کے علاوہ دسویں درجے تک انگریزی بھی پڑھی۔ والد کا انتقال ۱۹۲۷ء میں ہو گیا، جب یہ آٹھ برس کے تھے؛ والدہ ۱۹۳۸ء میں سدھاریں۔ ان کی ساری تعلیم و تربیت نانا کی نگرانی میں ہوئی۔ ان کا ۱۹۵۹ء میں انتقال ہوا، کہتے ہیں کہ اس وقت ان کی عمر ۱۲۰ سال کی تھی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

بشیر خان شروع سے منحنی اور کمزور قوام کے ہونے کے باعث کسی محنت کے کام کے گون نہیں تھے۔ لہٰذا عمر بھر کہیں مستقل ملازمت نہیں کر سکے۔ چندے ایک قریب کی مینگانیز کی کان میں کلرکی کی؛ معلمی کی؛ اور کچھ جگہوں پر بھی عارضی کام کرتے رہے۔ لیکن آخر تک کم و بیش پریشان حال ہی رہے۔

ضعفِ معدہ کے دائمی مریض تھے۔ پھر کچھ اور پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔ انھیں میں مبتلا ہو کر میو جنرل اسپتال، ناگپور میں علاج کی خاطر داخل ہوئے۔ وہیں ہفتے کے دن ۳ مئی ۱۹۷۵ء شام کو مالکِ حقیقی کا بلاوا آ گیا۔ اور اگلے دن (۴ مئی) دوپہر بعد مومن پورہ کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

ان کی شادی اپنے چچا منیر خان کی صاحبزادی انوری خانم سے ۱۹۴۸ء میں ہوئی تھی۔ ڈیڑھ دو سال بعد بیوی کا زچگی کے ایام میں انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد دوسرا نکاح مرحومہ ہی کی چھوٹی بہن طاہرہ خانم سے ہوا۔ اس بیگم کے بطن سے آٹھ بچے ہوئے: چار بیٹے اور چار بیٹیاں۔ ماشاءاللہ سب زندہ و سلامت موجود ہیں۔

مانی ابھی اسکول کے آخری درجوں میں تھے کہ شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا۔ اس زمانے میں پروفیسر منظور حسین شور، اور محمد حبیب اللہ خان غضنفر تلمیذِ شفیق اردہوی (ف: ۱۹۲۲ء) وہیں ہائی اسکول، ناگپور میں فارسی اور اردو پڑھاتے تھے۔ شہر میں بھی مولانا ناطق گلاؤٹھوی (ف: مئی ۱۹۶۹ء) اور ان کے تلامذہ کی موجودگی کے باعث شعر کے لیے فضا سازگار تھی۔ مانی بھی شعر کہنے لگے۔ انھوں نے کوشش کی کہ اقبال احمد خان سہیل، اعظم گڑھی (ف: نومبر ۱۹۵۵ء) انھیں اپنی شاگردی میں قبول کر لیں۔ لیکن مرحوم نے کسی وجہ سے معذرت کر دی۔ اس کے بعد مانی نے کسی سے مشورہ نہیں کیا۔ طبیعت بھی عزلت پسند اور نام و نمود سے متنفر تھی، اس لیے کسی کے در پر نہیں گئے۔

افسوس کہ مجموعۂ کلام زندگی میں شائع نہیں ہوا، اگرچہ اسے خود ہی "صحیفۂ صنم" کے نام سے مرتب کر لیا تھا۔ اس کا مسودہ ان کے خاندان میں موجود ہے۔ اسی سے چند شعر

نمونے کے طور پر درج کر رہا ہوں، جو ان کے شاگرد عرفان قنوجی اور محمد عبدالحلیم (ناگپور) کی مہربانی سے حاصل ہوتے ہیں:

میعادِ گرفتاری بڑھ جاتی، تو اچھا تھا
شرم آتی ہے گھر جاتے، چھوٹے ہوئے زنداں سے

سخنوروں کا شعر ہیں خیال جیسے لڑ پڑے
جو بات ان کے دل میں ہے، وہی ہے میری آرزو

نوازشِ غمِ دوراں سبھی پہ یکساں ہے
گنہگار کا دل ہو کہ بیگناہ کا دل

تیر و سناں نگاہ کو باندھ گئے سخن طراز
چوٹ لگی ہے پھول سے، زخم کھلے ہیں بات سے

کام کچھ گردشِ دوراں کبھی نہ آئی، مانی!
پھر کہیں لوٹ کے وہ لیل و نہار آتے ہیں

اہلِ دانش نہ سنوار ینگے جہاں کو، یارب!
کوئی دیوانہ، اسی آب، اسی گل سے اٹھا

باوضو سجدہ گزارانِ حرم صف بستہ
تیری پلکیں ہیں کہ حجاج کا کعبہ میں ہجوم

کتنے دل ہو گئے احساسِ گناہ سے خالی
حسن نے دیکھ لیا، جب بنگاہِ معصوم

تبصرے لاکھ ہوئے، خالِ رخِ جاناں پر
ایک نکتہ ہے کہ کھلتا نہیں جس کا مفہوم

گم کردہ کیوں ہیں خلاؤں میں، یہ عالم نو کے دیوانے
مانی! اپنی اپنی دنیا، ہے شایانِ طوافِ شمس و قمر

بہتر ہے نگاہوں کی پناہ نگاہ مرا دل
کیسے ہیں گرفتار نہیں ہوتے ہیں قاتل

دل کو محرومیِ دانش پہ ہنسی آتی ہے
کچھ درِ علم سے ہاتھ آیا، نہ حکمت سے ملا

مانی! منبر کوئی مقام نہیں
عشق کا راز، دار پر سمجھا

مضطر حیدری، دلاور حسین

ان کا خاندان آگرے کا رہنے والا تھا، جہاں سے یہ لوگ ۱۸۵۷ء کے فوجی ہنگامے کے بعد ہجرت کر کے دلّی، پھر لکھنؤ اور پٹنے کے مختصر قیام کے بعد کلکتے پہنچے۔ یہیں دلاور حسین ۱۹۲۰ء میں پیدا ہوئے

تعلیم کا آغاز مدرسۂ عالیہ سے ہوا، جہاں پانچویں درجے تک رہے۔ یہاں سے فارغ ہوئے تو سانٹ جیمز اسکول میں پہنچے۔ لیکن کچھ صحت کی خرابی اور کچھ طبیعت کے اُبالی پن کے باعث تعلیم میں کوئی ترقی نہ کر سکے، دسویں درجے کے امتحان سے پہلے ہی یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ اس کے بعد یہ گویا ڈور کٹا پتنگ بن گئے جس کا کوئی مرکز نہ رہا ہو۔

روزگار کی طرف سے ہمیشہ پریشان رہے۔ جب کلکتے میں کوئی اطمینان کی صورت نہ نکلی، تو بمبئی کی راہ لی کہ شاید وہاں کسی فلمی کمپنی میں گیت یا نظمیں لکھنے کا کام مل جائے۔ وہاں بعض احباب کے سہارے کچھ کام ملا، اور انھوں نے ایک دو فلموں کے گانے لکھے بھی، لیکن کوئی مستقل انتظام نہ ہو سکا اور معاوضہ بھی اتنا کم تھا کہ جلد ہی یہ دل برداشتہ ہو کر واپس کلکتے چلے گئے۔

ان کا بچپن اپنے نانا ابا کی سرپرستی میں گزرا تھا؛ وہ شعر اور موسیقی کے رسیا تھے۔ دلاور حسین بھی انھیں کے رنگ میں رنگے گئے۔ تعلیم کے دوران ہی میں ان کے بعض دوست شعر کہنے لگے تھے، ان سے بھی متاثر ہوتے۔ ادھر نانا جان اللہ کو

پیارے ہو گئے۔ اب گویا سر پر کوئی نہ رہا۔ انھوں نے نانا کے مختصر ذخیرۂ کتب سے استفادہ کیا اور ان کا ہارمونیم لے کر موسیقی کی دُھنیں بجانے لگے۔ رفتہ رفتہ خود شعر کہنے کی تحریک ہوئی، اور انھوں نے ۱۹۴۴ء میں باقاعدہ اس میدان میں قدم رکھ دیا۔ شعر پر مستقل اصلاح کسی سے نہیں لی جو کچھ کہا، اُسے اپنے مطالعے اور ذوقِ سلیم کے بھروسے پر مشاعروں میں سناتے رہے۔ البتہ کلکتے کے بیشتر بزرگ اساتذہ سے راہ و رسم تھی، انھیں کے مشورہ سے مستفید ہوتے رہے۔ ۱۹۶۷ء میں ایک مختصر مجموعہ 'جامِ جم' کے عنوان سے اردو سبھا، کلکتہ کی طرف سے چھپا تھا۔ اس میں رباعیاں، غزلیات اور نظمیں ہیں۔

ان کے کلام میں ہمعصر سیاسی حالات پر تنقید بہت نمایاں ہے؛ ترقی پسند تحریک کے اثر سے بھی یہ خالی نہیں۔ افسوس کہ عمر نے وفا نہ کی۔ وہ پچاس برس کی عمر میں کینسر کے عارضے میں مبتلا ہو گئے، جس سے صحتیابی کی کوئی امید نہیں تھی۔ اس سے گھبرا کر انھوں نے ۱۳ مئی ۱۹۷۵ء کی رات میں ڈوب کر خودکشی کرلی۔ اگلے دن لاش حاجی محمد حسن اسکویر (کلکتہ) کے تالاب سے ملی۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو بچے جسمانی یادگار چھوڑے۔

چمن والوں کے ہونٹوں پر ہیں شادابی کے افسانے
مگر افسردگیِ گلستاں کچھ اور کہتی ہے
سکوتِ بحر کو تم دائمی کہہ لو، مگر مضطر!
سبک رفتاریِ موجِ رواں کچھ اور کہتی ہے

سوچا ہے کہ اک بت کو اب دل میں بسائیں گے
ویران رہیگا یہ اللہ کا گھر کب تک!

وقت پر جھوٹی تسلی بھی سکون افزا ہے
پھر بھی مضطر! یہ مرے درد کا درماں تو نہیں

ہماری داستاں اب نامکمل رہ نہیں سکتی
زباں رک بھی گئی تو آنکھ سے آنسو رواں ہونگے

خلوص ہو تو کہیں بندگی کی قید نہیں
صنمکدے میں طواف حرم بھی ممکن ہے
رات کی بات کیا؛ رات گئی، بات گئی
صبح سے آنکھ ملاؤ کہ سحر ہوتی ہے

یہ رسم عام نہیں پھر بھی ہم نے دیکھا ہے
خود اپنی آگ میں پروانے جلنے لگتے ہیں
عجیب حال ہے اس دل کا ان دنوں مضطرؔ!
ہنسی ہنسی میں بھی آنسو نکلنے لگتے ہیں

کنجِ قفس مقفل تو نہیں ہے، جان بچی اور لاکھوں پائے
صحنِ چمن کا ذکر نہ چھیڑو، بال و پر کا نام نہ لو
مے ان کی، میخانہ ان کا، جام ان کے، شیشہ ان کا
تلخیٔ مے کا شکوہ کیسا! کیف و اثر کا نام نہ لو
کل کی بات ہنسی کل تک، مضطرؔ! جھوٹی قسمیں کھانے کی
آج قسم کھانے کے لیے بھی ان کے سر کا نام نہ لو

یہ ہمیں سمجھے کہ بھرم آپ کا رکھا ہم نے
ہم کبھی حسرتِ دیدار سے آگے نہ بڑھے

عبث ہے تشنہ لبی کا شکوہ نظامِ فطرت سے میگسارو!
نگاہِ ساقی بدل گئی ہے شراب کی کچھ کمی نہیں ہے

رباب و تیشہ و سیف و قلم تراشے ہیں
ہمیں خدا ہیں، ہمیں نے صنم تراشے ہیں
یہ سنگ و خشت کو عظمت ہمیں نے بخشی ہے
ہمیں نے دیر ہمیں نے حرم تراشے ہیں

اضطرابِ دلِ ناکام سے ڈر جاتے ہیں
رات تو دور ہے ہم شام سے ڈر جاتے ہیں
تہمتِ عشق تو معراج ہے ہم تو مضطرؔ!
ہونگے وہ اور جو الزام سے ڈر جاتے ہیں

شبنمی رات ڈھلتی ہے، ڈھلنے دو، کھِل اٹھیگا چمن، رُت بدلنے تو دو
صبحِ روشن کا سورج نکلنے تو دو، ہر کلی پھول بن کر نکھر جائیگی
ظلمتِ شب سے اے دل! ہراساں نہ ہو، تارے گِن گِن کے ناحق پریشاں نہ ہو
لاکھ بھاری سہی، رات پھر رات ہے خود گذرتے گذرتے گذر جائیگی

ہم ٹھہرے مدہوش شرابی، بہکی باتیں کرتے ہیں
ذہن میں واعظ کے بھی خلل ہو، یہ بھی تو ہو سکتا ہے
اک لمحے کا اذنِ تبسم بھی، ہے بہت، مایوس نہ ہو
عمر کا حاصل اک یہی پل ہو، یہ بھی تو ہو سکتا ہے
شامِ ابد کے دھندلے بادل چھائے ہیں ہر سمت مگر
رات کٹے، پھر صبحِ ازل ہو، یہ بھی تو ہو سکتا ہے

مری چارہ سازی کی فکر ہے، مرے ساتھ تیرا بھی ذکر ہے
مرا حال دیکھ کے، چارہ گر ترے نام تک تو پہنچ گئے
وہ نگاہِ ناز اٹھی ادھر، تو پیام تک تو پہنچ گئے
کبھی ہمکلام بھی ہونگے ہم کہ سلام تک تو پہنچ گئے

اب تو اظہارِ تمنا سے بھی جی ڈرتا ہے
اتنے سہمے ہوئے جذبات کہاں تھے پہلے

منتِ جاں بھی ہے، جاں بلب بھی ہے
دل کا عالم جو کل تھا، اب بھی ہے

فطرتِ حسن کو تی کیا سمجھے
بے نیازی بھی ہے، طلب بھی ہے

مضطرؔ بروزِ حشر بھی ٹھہرے گناہگار
وہ بچ گئے وہاں بھی، عجب اتفاق ہے

اف، یہ خاموشی، یہ اشکِ غم، یہ شمعِ انجمن
چھیڑ دی کس نے بھری محفل میں پروانے کی بات

کیا جانیے کیسی آگ ہے یہ، شعلوں کا پتا ہے، اور نہ دھواں
محسوس مگر ہوتا ہے یہی، جیسے کہ میں جلتا رہتا ہوں

فطرت میں ازل ہی سے میری، نیرنگی و ندرت ہے مضطرؔ!
افسانہ تو ہوں میں ایک، مگر عنوان بدلتا رہتا ہے

کچھ اور مسافر بھی ہیں ہمراہ ہمارے — ہم اپنے سفینے کو ڈبو بھی نہیں سکتے۔
ان سفینوں کا ڈوبنا بہتر — جن کو ساحل نظر نہیں آتا

ترے فراق کی لذت پہ ناز کرتا ہوں — ترا وصال تو خواب و خیال ہے اے دوست!
شب کی تنہائی مزہ دینے لگی — دن کبھی اب یوں ہی گزارا چاہیے

منتظر کل بھی تھے کسی کے ہم — آج بھی انتظار کرتے ہیں
کم نظروں کے ادراک وگماں سے آگے — اس مقصدہ پرواز جہاں سے آگے

اے قافلے والو! نہ یہاں پر ٹھہرو — منزل ہے ابھی دور، یہاں سے آگے
بجلی کی چمک قید کرو، تو جانیں — کوندے کی لپک قید کرو، تو جانیں

مانا کہ گلشن پہ تمھارا قبضہ — پھولوں کی مہک قید کرو، تو جانیں

میخانے میں یہ پند و نصیحت کیسی!
اسراف و قناعت کی حکایت کیسی!
مے اپنی ہے، جام اپنا، صراحی اپنی
اے پیرِ مغاں! تیری اجازت کیسی!

ذوالفقار علی بخاری، سیّد

ان کے خاندان کا مسقط الرّاس وسطی ایشیا کا مشہور مرکزِ علومِ اسلامیہ شہر بخارا تھا، جہاں سے ان کے اجداد اٹھارھویں صدی عیسوی میں ہجرت کر کے کشمیر جنّت نظیر میں آ بسے تھے۔ ایک زمانہ بعد ذوالفقار علی بخاری سے تین چار پشت اوپر یہ لوگ کشمیر سے نکلے، اور صوبہ سرحد کے دارالحکومت پشاور میں آ گئے۔ ان کے والد سیّد اسد اللہ شاہ بخاری کا شہر کے علما اور برگزیدہ اشخاص میں شمار ہوتا تھا۔ شاہ صاحب مرحوم پیر کی حیثیت سے بھی معروف تھے، اور ان کے مریدوں کا حلقہ خاصا وسیع تھا۔

سیّد اسد اللہ شاہ بخاری کے تین صاحبزادے تھے۔ جن میں سے دو نے خاصی شہرت حاصل کی۔ سب سے بڑے پیر سیّد محمد شاہ تھے۔ یہ شعر بھی کہتے تھے؛ رفعت تخلص تھا۔ منجھلے سید احمد شاہ بخاری تھے، جنھیں اردو دنیا "پطرس" کے نام سے جانتی ہے اور اگر چاہے بھی، تو انھیں بھلا سکتی۔ ان کا ۵ دسمبر ۱۹۵۸ء کو نیویارک میں انتقال ہوا۔ اردو والوں کی بےحسی اور بےتوفیقی کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہوگا کہ آج تک ان کی سوانحمری نہیں شائع ہوئی۔

سب سے چھوٹے یہی سیّد ذوالفقار علی بخاری تھے، جن کے بارے میں یہ چند سطریں پیش کر رہا ہوں۔

ذوالفقار علی ۱۹۰۴ء میں پشاور ہی میں پیدا ہوئے۔ دسویں درجے تک تعلیم بھی وہیں گورنمنٹ ہائی اسکول میں پائی۔ اس کے بعد مزید تعلیم کے لیے لاہور آ گئے۔ ان دونوں بھائیوں نے "پیر" کے سابقے سے کس طرح چھٹکارا پایا، اس کا قصہ ذوالفقار علی نے اپنی کتاب "سرگزشت" میں بیان کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ بھائی جان کا پورا نام پیر سیّد احمد شاہ بخاری تھا، اور میرا پیر سیّد ذوالفقار علی شاہ بخاری ـــــ چونکہ والد مرحوم کے بعد ہم دونوں کسی سے بیعت لینے کے اہل نہیں تھے، لہٰذا ہم نے خیال کیا کہ ہمارا کوئی حق نہیں کہ پیر کا لفظ اپنے نام کا جزو بنائے رکھیں۔ چنانچہ بھائی جان "پیر احمد شاہ" سے احمد شاہ ہو گئے، اور میں "پیر سیّد ذوالفقار علی شاہ" سے ذوالفقار علی بخاری بن گیا۔ پشاور میں ان کے اسکول کے ہیڈ ماسٹر ڈاکنز تھے۔ وہ احمد شاہ کی صلاحیتوں کے پیشِ نظر اور خاص کر ان کی انگریزی میں قابلیت کے باعث ان سے بہت محبّت کرتے تھے؛ اور انھیں صرف "پیر" کے نام سے پکارتے تھے۔ لیکن لفظ پیر کا تلفظ اس طرح کرتے جس طرح یہ فرانسیسی میں بولا جاتا ہے، یعنی پیئیر (بالکل اسی طرح جیسا کہ پیئر سوپ میں ہے) فرانسیسی پیئر، انگریزی میں پیٹر ہے اور فرانسیسی میں پطرس۔ آپ نے حضرت عیسیٰ کے حواری سینٹ پیٹر کا نام سنا ہو گا؛ انھیں بھی یونانی میں (اور اسی سے عربی میں بھی) پطرس کہتے ہیں۔ غرض جب احمد شاہ نے لاہور کالج میں پہنچنے کے بعد انگریزی میں مضمون لکھنا شروع کیے، تو ان پر وہ اپنے نام کی جگہ پیٹر لکھنے لگے؛ بلکہ انھوں نے اپنے استاد سے اپنی عقیدت اور ارادت کا اظہار یوں کیا کہ ان مضامین کے ساتھ اپنا پورا نام پیٹر واٹکنز لکھتے رہے۔ چنانچہ اس زمانے میں ان کے جو مضامین لاہور کے انگریزی روزنامے "سول اینڈ ملٹری گزٹ" میں چھپے تھے، ان کے ساتھ نام پیٹر واٹکنز (Peter Watkins) ہی تھا۔

اب یہ قصہ ختم ہی کر لوں:

سیّد امتیاز علی تاج (ف: اپریل ۱۹۷۰ء) نے ۱۹۱۸ء میں ماہنامہ "کہکشاں"

جاری کیا، بڑے ٹھاٹ کا پرچہ تھا یہ۔ چونکہ اس وقت بیشتر صفِ اوّل کے ادیبوں سے تاج کے ذاتی مراسم تھے، وہ تاج کی فرمائش پر اس میں مضمون لکھنے لگے۔ انہیں میں احمد شاہ بخاری بھی تھے، یہ کالج میں تاج کے ہمجماعت بھی رہے ہیں۔ بخاری نے "کہکشاں" کے لیے ایک سلسلۂ مضامین لکھا: "یونانی حکما اور ان کے خیالات" اور موضوع کی مناسبت سے ان پر اپنے اصلی نام کی جگہ "پطرس" کا قلمی نام استعمال کیا۔ ان کی ہدایت تھی کہ میرا نام نہ چھپے اور نہ کسی کو بتایا جائے کہ یہ مضامین میرے لکھے ہوتے ہیں۔ پہلی دو تین قسطوں میں تو ان کی ہدایت پر عمل ہوا، لیکن اس کے بعد ایک قسط پر کاتب نے سہواً "پطرس" کے ساتھ ان کا پورا نام "احمد شاہ بخاری" بھی لکھ دیا۔ اور یوں یہ راز فاش ہو گیا کہ "کون معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں"۔ اب چونکہ سب کو معلوم ہو ہی گیا تھا، اس لیے اس کے بعد خود احمد شاہ بخاری نے بھی یہ قلمی نام اختیار کر لیا، اور کھلے بندوں اسے اپنی تحریروں میں استعمال کرنے لگے۔

تو اسی موقع پر یہ چھوٹے بھائی "ذوالفقار علی بخاری" ہو گئے۔ اور بعد کو انگریزیت نے ترقی کی، تو اس میں تخفیف کر کے زیڈ۔ اے بخاری بن گئے۔

ان کے سرکاری ملازمت میں شامل ہونے کا واقعہ اتفاقاتِ زمانہ کی حیرتناک مثال ہے۔ ہوا یہ کہ ایک دن پشاور میں ان کے کسی دوست نے انھیں بتایا کہ اخبار میں بینام کا اشتہار چھپا ہے کہ ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے، جو انگریزی، اردو، فارسی، عربی، پشتو، پنجابی زبانوں سے واقف ہو۔ اس دوست نے مذاق سے کہا کہ بھلا بتاؤ، اتنی ساری زبانیں جاننے والا اس شخص کو کہاں ملیگا؟ وہ دوست تو صرف اتنا کہہ کر چلے گئے، ذوالفقار علی بخاری نے "ٹربیون" اخبار کا وہ پرچہ تلاش کیا، جس میں اشتہار چھپا تھا اور چونکہ وہ کم و بیش یہ سب زبانیں جانتے تھے، لطف لینے کو مندرجہ اشتہار پتے پر درخواست بھیج دی، اور اس میں مشورہ طلبی کے لیے علامہ اقبال (ف: اپریل ۱۹۳۸ء)

اور پروفیسر محمد سعید کے نام لکھ دیے کہ اگر میرے بارے میں مزید پوچھ گچھ کرنا منظور ہو، تو ان اصحاب سے رجوع کیا جائے۔ قصہ کوتاہ، وہ ان اصحاب کی سفارش پر ملازم ہو گئے۔ یہ ۱۹۲۵ء کی بات ہے، جب ان کی عمر صرف ۲۱ برس کی تھی۔

فورٹ ولیم کالج، کلکتہ کے ختم ہونے پر حکومتِ ہند کے فوجی دفتر کے جنرل اسٹاف نے ایک "منتخبین کا بورڈ" قائم کیا تھا، تاکہ اس کی مدد سے انگریز افسروں کی قابلیت اور اہلیت کی جانچ کی جا سکے۔ اس محکمے کا صدر دفتر شملے میں تھا۔ وہ اشتہار اسی دفتر کی طرف سے شائع ہوا تھا، اور اسی بورڈ کے رکن ذوالفقار علی بخاری مقرر ہوتے تھے۔

یہ بہت ذمے داری کا عہدہ تھا۔ ان سے پہلے شمس العلماء خان بہادر مولوی محمد یوسف رنجور (ف: جون ۱۹۲۳ء) اس بورڈ کے رکن تھے۔ جس جگہ پر ذوالفقار علی بخاری کا تقرر ہوا تھا، یہ ۱۹۲۰ میں رنجور کے پنشن پر سبکدوش ہونے سے خالی ہوئی تھی۔ بخاری اس عہدے پر دس ساڑھے دس برس متمکن رہے۔

اگرچہ بمبئی اور کلکتے میں بعض لوگوں نے پہلے سے معمولی صلاحیت کے ریڈیو ٹرانس میٹر لگا رکھے تھے، لیکن سرکاری محکمے کی حیثیت سے آل انڈیا ریڈیو یکم جنوری ۱۹۳۶ء کو قائم ہوا۔ اس کی تنظیم و ترویج کے لیے بی بی سی، لندن نے حکومتِ ہند کی درخواست پر مسٹر لائینل فیلڈن (ف: لندن، ۲ جون ۱۹۷۴ء) کو ہندستان بھیجا۔ ظاہر ہے کہ فیلڈن کو موزوں کارکنوں کی ضرورت تھی، جو اس نئے محکمے کی تنصیب و ترقی میں ان کے معاون ثابت ہو سکیں۔ ذوالفقار علی بخاری کے ایک انگریز دوست نے فیلڈن سے ان کا ذکر کیا؛ بخاری نے بھی درخواست بھیج دی، اور بالآخر انتخابی بورڈ نے ان کا دلی اسٹیشن میں پروگرام ڈائرکٹر کے عہدے پر تقرر منظور کر لیا۔

فیلڈن آل انڈیا ریڈیو کے کنٹرولر جنرل تھے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ عہدے کا نام

سمجھ رکھیے، وہ محکمے کے سیاہ و سپید کے مالک تھے۔ لارڈ ولنگڈن والیسرائے سے
ان کی ذاتی ملاقات ہی نہیں، گہری دوستی تھی۔ اس لیے جب بھی کوئی محکمانہ یا دفتری
قسم کی دشواری پیش آئی جس سے فیلڈن کو اپنی من مانی کرنے میں رکاوٹ
محسوس ہوئی، وہ سیدھے ولنگڈن کے پاس چلے گئے؛ اور ان سے، جو حکم چاہا،
جاری کرالائے۔

ذوالفقار علی بخاری کی فیلڈن سے پہلی ہی ملاقات میں دوستی ہوگئی تھی۔ اور
دوستی بھی ایسی کہ دونوں ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ تھوڑے دن بعد
فیلڈن کی خواہش پر پروفیسر احمد شاہ بخاری (پطرس) بھی دلی آگئے۔ اور یہاں
دلی ریڈیو اسٹیشن کے ڈائرکٹر مقرر ہوگئے۔ اس پر ذوالفقار علی بخاری کو
ترقی ملی اور یہ ان کے نائب اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائرکٹر
بن گئے۔ ذرا خیال فرمائیے؛ بڑا بھائی اسٹیشن ڈائرکٹر، اور چھوٹا بھائی اسسٹنٹ
ڈائرکٹر؛ اور کنٹرولر جنرل، فیلڈن، ان دونوں کا یارِ غار، گویا ان کی جیب میں۔
اس پر سردار دیوان سنگھ مفتون (ف: جنوری ۱۹۷۵ء) نے پھبتی کسی کہ ایک
بی بی سی لنڈن میں ہے، اور ایک بی بی سی دلی میں، یعنی بخاری برادرس
کارپوریشن، جو آل انڈیا ریڈیو کی کرنا دھرتا ہے۔
تھوڑے دن بعد جب ڈپٹی کنٹرولر کاؤس جی بہرام جی سیٹھنا کا بمبئی تبادلہ ہوگیا،
تو ان کی جگہ پطرس ڈپٹی کنٹرولر بن گئے، اور ذوالفقار علی اسٹیشن ڈائرکٹر
مقرر ہوگئے۔ اسی زمانے کا ایک لطیفہ یاد آیا:
کسی نے پوچھا: حضرت! اب یہاں ریڈیو اسٹیشن پر دو بخاری ہیں۔ بات چیت
میں جب تک پورا نام نہ لیا جائے معلوم نہیں ہوتا کہ آپ ان دونوں میں سے
کن صاحب کا ذکر کر رہے ہیں؛ محض بخاری کہہ دینے سے التباس کا اندیشہ
ہے۔ کوئی ایسا نشان مقرر ہونا چاہیے کہ پورا نام بھی نہ لینا پڑے اور تعین بھی
ہوجائے۔ سامع نے کہا کہ اس میں کیا مشکل ہے، بڑے بھائی (احمد شاہ بخاری)

'صحیح بخاری'، اور چھوٹے (ذوالفقار علی بخاری) 'غلط بخاری'۔ اس بات پر ایک قہقہہ پڑا۔ لیکن یہ لطیفہ کچھ ایسا چپک کے رہ گیا کہ اس کے بعد بے تکلف دوستوں کی مجلسوں میں ان دونوں بھائیوں کی طرف واقعی صحیح بخاری اور غلط بخاری کے ناموں ہی سے اشارہ ہوتا رہا۔

۱۹۳۷ء کے شروع میں حکومت ہند نے (یا کہیے فیلڈن نے) فیصلہ کیا کہ ہندستان میں ریڈیو اور براڈکاسٹنگ کو فروغ دینے کے لیے ضروری ہے کہ بعض لوگوں کو انگلستان بھیجا جائے، جو وہاں بی بی سی میں کچھ دن رہ کر اپنے کام کی تعلیم و تربیت حاصل کر سکیں۔ اس پر دو آدمیوں کا انتخاب ہوا۔ ایک فیلڈن کے پرائیوٹ سکتر (مسٹر آچاریہ) اور دوسرے ذوالفقار علی بخاری کا۔ غرض سال بھر سے کچھ کم بی بی سی، لندن میں تربیت حاصل کرنے کے بعد بخاری واپس آ گئے، لیکن دلّی پہنچنے پر انھیں معلوم ہوا کہ اب ان کا دلّی میں قیام نہیں رہے گا۔ چنانچہ بہ اسی عہدے پر بمبئی ریڈیو اسٹیشن بھیج دیے گئے۔ بمبئی ریڈیو کا موجودہ اسٹوڈیو اور دفتر انھیں کے زمانے میں تیار ہوا۔ قیام بمبئی کے دوران میں انھوں نے روزمرّہ کے کام کے لیے گجراتی اور مراٹھی دونوں زبانیں اچھی خاصی سیکھ لی تھیں، اگرچہ خود اٹک کے بات کرتے تھے، لیکن سمجھنے خوب تھے۔

۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو دوسری عالمی جنگ شروع ہوئی۔ عہدِ حاضر میں جنگ صرف فوجوں یا میدان ہی تک محدود نہیں رہ گئی ہے، بلکہ فریقین کی پوری پوری آبادی اس کے نرغے میں آجاتی ہے۔ حکومت جب تک اپنے لوگوں کو اس بات کا یقین نہ دلا دے کہ جنگ مفادِ عامہ کے لیے لڑی جا رہی ہے، اور سرکار کا موقف صداقت اور انصاف پر مبنی ہے، اُسے عوام کی ہمدردی اور اعانت حاصل نہیں ہو سکتی۔ نہ صرف یہ، بلکہ فریقین غیر جانبدار ممالک کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے بھی پوری سعی کرتے ہیں۔ صورتِ حال کی اس تبدیلی کا یہ اثر ہوا

ہے کہ فوج تو لڑنے کو میدانِ جنگ میں جاتی ہے، اور حکومت کے تمام ذرائع نشر و اشاعت حرکت میں آجاتے ہیں، لوگوں پر یہ واضح کرنے کو۔ اور انھیں اس بات کا یقین دلانے کے لیے کہ حکومت جنگ کرنے پر اس لیے مجبور ہوتی ہے کہ ملک کی آزادی، بلکہ ہستی اور وہ تمام اقدار جن کی لوگ قدر کرتے ہیں، دشمن کی وجہ سے معرضِ خطر میں ہیں۔ پس، عوام کا فرض ہے کہ وہ حکومت کے اقدام کی تائید کریں اور جنگ جیتنے کے لیے اس سے پورا تعاون کریں۔ چنانچہ جب جنگ شروع ہوئی، تو حکومتِ برطانیہ کی پراپیگنڈے کی مشین بھی پورے زور شور سے حرکت میں آگئی۔ بی بی سی، لندن نے بھی اپنی سرگرمیاں تیز سے تیز تر کر دیں۔ اس کے سامعین میں اردو بولنے والے دو محاذوں پر تھے؛ ایک خود ہندستان میں؛ دوسرے وہ ہندستانی فوجی جو یورپ اور ایشیا اور افریقا کے جنگ کے میدانوں میں ڈیرے ڈالے پڑے تھے۔ اس لیے بی بی سی نے اپنے عملے میں کئی اردو داں حضرات کا اضافہ کیا، جو نہ صرف اس کے نشریات کو بہتر بنانے کے لیے مشورہ دیتے، بلکہ حسبِ ضرورت مختلف محاذوں پر جاکر ہندستانی فوجیوں سے ملتے، ان کی حوصلہ افزائی کرتے، اور ان کی حالت کی بہتری کے لیے منصوبے بناتے اور سفارشیں پیش کرتے تھے۔

اسی سلسلہ میں ذوالفقار علی بخاری بھی لندن بلا لیے گئے۔ حکومتِ برطانیہ کی وزارتِ اطلاعات نے ایک اتحادی ادارۂ نشر و اشاعت قائم کیا تھا، بخاری صاحب اسی ادارے کے ہندستانی رکن کی حیثیت سے گئے تھے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا، اس ادارے کے فرائض میں یہ بھی داخل تھا کہ مختلف ممالک کے اصحابِ مجاز کو برطانی اور اتحادی پراپیگنڈے کی تائید پر آمادہ کرے۔ بخاری صاحب اس دوران میں یورپ کے کئی محاذوں پر دورے کو گئے تھے۔ اس زمانے میں انھیں عارضی طور پر "میجر" کا عہدہ بھی دے دیا گیا تھا۔

لندن سے واپسی کے تھوڑے دن بعد ہی ان کا تبادلہ کلکتے ہو گیا۔ یہاں انھوں

نے بنگالی سیکھی۔ ان کا بنگالی کا علم اور معیار گجراتی اور مراٹھی سے کہیں بہتر تھا۔ اس میں بے تکلف تقریر کر سکتے تھے۔ کلکتے سے انھیں پھر بمبئی جانا پڑا۔ ۱۹۴۷ء میں جب ملک کو آزادی ملی ہے، تو وہ بمبئی ہی میں تھے۔

لیکن درمیان میں ایک بات رہ گئی۔ وہ بمبئی ہی میں تھے کہ ۱۹۴۶ء کے اواخر میں انھیں امریکا کی مشہور فلم ساز کمپنی میٹرو گالڈون میئر نے فلمیں تیار کرنے کے لیے امریکا بلایا۔ انھوں نے حکومت سے رخصت لی اور امریکا سدھارے۔ وہاں کوئی چھ مہینے قیام رہا۔ واپس آئے، تو تقسیمِ ملک کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ۱۹۴۷ء میں یہ بھی پاکستان گئے اور وہاں ریڈیو پاکستان کے (یہ نام بھی انھیں کا رکھا ہوا ہے؛ اس سے پہلے نام پاکستان براڈکاسٹنگ کارپوریشن تھا) ڈائرکٹر جنرل مقرر کیے گئے۔ وہ اس عہدے سے ۱۹۶۱ء یا ۱۹۶۲ء میں سبکدوش ہوئے۔ اگرچہ اس کے بعد بھی وہ اپنی وفات تک ریڈیو پاکستان سے بحیثیت مشیر وابستہ رہے۔

آخری تین چار سال دل کے عارضے میں مبتلا رہے۔ ۱۹۷۴ء میں وہ علاج کے لیے لندن گئے تھے۔ علاج سے مرض میں کچھ افاقہ ہو گیا، اور وطن واپس آ گئے۔ آغاز جولائی ۱۹۷۵ء میں وہ گر گئے اور ان کے کولھے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ آپریشن ہوا؛ اتنے میں دل کی تکلیف بڑھ گئی۔ اس پر اسپتال میں داخل ہوئے، جہاں ان کا ہفتے کے دن ۱۲ جولائی ۱۹۷۵ء (یکم رجب ۱۳۹۵ھ) کو انتقال ہو گیا۔ جنازہ اگلے دن اتوار کو اٹھا، اور انھیں پی۔ سی۔ ایچ سوسائٹی، کراچی کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔ اولاد میں تین بیٹیاں ان کی یادگار ہیں۔

بہت لوگوں نے ان کی تاریخِ وفات کہی۔ نیسان اکبر آبادی کا قطعۂ تاریخ ہے:

خبر مرگِ زیڈ اے بخاری کی سن کر   مری آنکھ سے ہو گئے اشک جاری
یہ تاریخ فکرِ رسا سے ملی ہے   جہاں سے اٹھے آج زیڈ اے بخاری"
(۱۳۹۵)

رئیس امروہوی کے قطعے میں "ذوالفقارِ حقائق پناہ" سے ۱۳۹۵ برآمد ہوتے

ہیں۔
اس برصغیر — ہندوستان اور پاکستان میں ریڈیو اور براڈکاسٹنگ کے فروغ اور ترقی میں ذوالفقار علی بخاری نے جو نمایاں خدمات انجام دیں۔ ان کا انکار ممکن نہیں۔ ان کی ذہانت اور طبّاعی کا ایک زمانہ معترف ہے۔ میں انھیں ۱۹۳۶ء سے جانتا تھا۔ اس میں شمّہ بھر مبالغہ نہیں کہ ان کی بذلہ سنجی، حاضر جوابی، معاملہ فہمی کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ جن لوگوں کو ان سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا، ان سے کچھ کہا جائے، تو انھیں مشکل سے اعتبار آئیگا۔
ڈراما اور موسیقی ان کے مرغوب موضوع تھے، علماً اور عملاً دونوں طرح۔ اور انھیں ان میں ایسی گہری بصیرت حاصل تھی کہ بڑے بڑے جغادری ان کا لوہا مانتے تھے۔ غالب نے ایک جگہ عیش کی تعریف یہ کی ہے کہ کسی کو اپنا دلپسند مشغلہ بطورِ پیشہ اختیار کرنے کا موقع مل جائے۔ یہی ذوالفقار علی کے ساتھ ہوا؛ اور وہ زندگی بھر عیش کرتے رہے۔
انھیں نظم و نثر دونوں پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ افسوس کہ ان کی تحریریں عموماً شائع نہیں ہوئیں؛ وہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہے۔ خدا کرے اب شائع ہو جائیں!
انھوں نے "حریت" کراچی کے لیے اپنی یادداشتیں قلمبند کی تھیں۔ یہ ۱۹۶۳ء اور ۱۹۶۴ء میں ہفتہ وار اس پرچے میں چھپتی رہیں۔ بعد کو ان کا مجموعہ "سرگزشت" کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہوا (کراچی ۱۹۶۶ء) معلوم ہوا ہے کہ انھوں نے اس کا دوسرا حصّہ بھی مرتب کر لیا تھا؛ یہ بھی چھپ جانا چاہیے۔
ذوالفقار علی بخاری شعر بھی کہتے تھے۔ وہ کلاسیکی انداز کے خوش فکر شاعر تھے۔ اگرچہ وہ نئے طرزِ فکر سے دامن کشاں نہیں گزرتے، لیکن بنیادی طور پر انھوں نے روایتی اسلوب سے رُو گردانی بھی نہیں کی۔ افسوس کہ ان کا مجموعۂ کلام شائع نہیں ہوا۔ ذیل میں نمونے کے طور پر ان کے چند شعر پیش کیے جاتے ہیں:

اے میرے شہر سے آنے والو! کچھ تو کہو، ہاں کچھ تو کہو
اُس شہر کے گھر آباد ہیں، یا آباد ہیں زنداں؟ کچھ تو کہو

دامن کے چاک سے دور ہے کتنا چاکِ گریباں، کچھ تو کہو
یا اب کے بھی بیصرفہ گذری فصلِ بہاراں، کچھ تو کہو

کیا جوشِ جنوں کا رنگ رہا؟ کیا وحشت کے سامان ہوئے؟
یا اب کے بھی بے فیض رہی برسی رحمتِ باراں، کچھ تو کہو

کیا صبح کو اب بھی بادِ صبا، پیغامِ محبت لاتی ہے؟
کیا شام کو اب بھی لہراتی ہے کاکلِ پیچاں؟ کچھ تو کہو

کیا بزم میں اب بھی ساغرِ مے سے چہرے روشن ہوتے ہیں؟
کیا شام میں اب بھی ہوتا ہے محفل میں چراغاں؟ کچھ تو کہو

وہ شہر کا واعظ، جو ہر ایک پہ کفر کا فتویٰ جڑتا تھا
کس حال میں ہے وہ مردِ خدا؟ اے مردِ مسلماں! کچھ تو کہو

ہاں موت سبھی کو آنی ہے، ہم سب کو مرنا ہے، لیکن
اس شہر میں زندہ رہنے کا بھی کوئی ہے امکاں؟ کچھ تو کہو

گم کردہ راہ، خاک بسر ہوں، ذرا ٹھہر
اے تیز رَو! غبارِ سفر ہوں، ذرا ٹھہر

رقصِ نمود یک دو نفس اور بھی سہی
دوشِ ہوا پہ مثلِ شرر ہوں، ذرا ٹھہر

اپنا خرام تیز نہ کر، اے نسیمِ زیست!
بجھنے کو ہوں، چراغِ سحر ہوں، ذرا ٹھہر

موہوم سی امید ہوں، مجھ سے گریز کر
اپنی کسی دعا کا اثر ہوں، ذرا ٹھہر

———

سجدۂ شوق کرے کون ادا، میرے بعد
آپ پھرتے رہیں، بَن بَن کے خدا، میرے بعد
ایک میں ہوں کہ مری یاد دلوں سے نہ مٹی
ورنہ مٹنے کو تو کیا کیا نہ مٹا! میرے بعد
میں ہوں سرسبز خزاں میں بھی بہاروں کی طرح
کس کو راس آئیگی یہ آب و ہوا، میرے بعد
کس کو آئیگا اسیری میں رہائی کا مزا
کس کو پہنائینگے زنجیرِ وفا، میرے بعد

موجِ دل بیتاب طلب ہے
وصل کی شب بھی ہجر کی شب ہے،
تو آقا ہے، میں بندہ ہوں
تجھ سے شکوہ، سوءِ ادب ہے،
میرا جینا تیری خاطر
مرنے کا بھی کوئی سبب ہے
جس نے مجھ کو دل بخشا ہے
ساری دنیا کا وہ رب ہے
دل کا آنا، دل کا جانا
ایک سے بڑھ کر ایک غضب ہے،
مجھ کو بس تیرا ہی جنوں ہے
میرے جنوں میں بھی اک ڈھب ہے،
اس دنیا میں، اس دنیا میں
جس کی طلب تھی، اُس کی طلب ہے
ہم ہیں اور دیوار کا سایہ
کوئی ہمارا بھی منصب ہے
حسن کا نغمہ، اللہ اللہ!
عشق کا مطرب مہر بلب ہے
وہ بھی میرے دوست نہیں ہیں
جن سے عداوت جب تھی نہ اب ہے
دل حاضر ہے، دل کے مالک!
مالِ عرب تھا، پیشِ عرب ہے

تیرا میرا منھ تکتے ہیں
سب پیاسے ہیں، کون پلائے!
حسن کا جلوہ، اللہ اللہ!
آنکھیں دیکھیں، جی للچائے
ایمانوں کا اللہ بیلی
جب وہ کافر سامنے آئے

اللہ رے، آشیانۂ پرخار کی کشش
صحرا سے لوٹ لوٹ کے آتا ہوں گھر کو میں

ہم شناسا بحر کی تہ کے ہوئے
اور ساحل کے ستم سہہ کے ہوئے

اس توقع پر رہے کانٹے عزیز
دیکھ لوں وہ گل کہیں مہکے ہوئے

ہم کو دیکھو، میکدے کے دشمنو!
جو بھی کچھ ہم ہیں، یہیں رہ کے ہوئے

پھر ہے گمراہیوں کی مجھ کو تلاش
پھر کوئی راہبر نہ ہو جائے

مجھ کو محفل میں باریاب کرو!
سجدہ گاہ، سنگِ در نہ ہو جائے

دانہ دانہ بہم شود خرمن
بجلیوں کو خبر نہ ہو جائے

عیب کی وولیعت عشق، عشق کی عنایت غم
غم ہزار نعمت ہے، کوئی غم کو کیا جانے!

اک صدا ہے جس پر ہم رقص کرتے رہتے ہیں
وجد میں جو آجائے، زیر و بم کو کیا جانے!

بزم میں تو ہم دونوں اجنبی سے رہتے ہیں
کوئی تم کو کیا سمجھے، کوئی ہم کو کیا جانے

بہت ہو گئے، جو دردِ دل کو دردِ دل سمجھتے ہیں
مگر ہم دردِ دل کو زیست کا حاصل سمجھتے ہیں

عشق ہے آخر، موت نہیں ہے
ٹل جائیگا ٹلتے ٹلتے

تیرے الطافِ گزشتہ مجھے یاد آتے ہیں
غم فراموش تو ہوں، لطف فراموش نہیں

شورشِ عقل ہے برہم کُن جمعیتِ دل
ہمہ تن حرف ہے تُو، میں ہمہ تن گوش نہیں

مندرجۂ ذیل ان کی آخری غزل ہے، جو انھوں نے اپنی وفات سے چند دن پہلے کہی تھی:

شام ہو، دوست ہوں، سُبُو بھی ہو
اور خدا رکھے تجھ کو، تو بھی ہو

ذکرِ حق میں، ہوں صوفیانِ کرام
میگساروں کی ہاؤ ہُو بھی ہو

بزمِ یاراں میں، باہمہ آداب
تو ہی موضوعِ گفتگو بھی ہو

ہو اگر تیرا طرّۂ دستار
گل کی گلشن میں آبرو بھی ہو

اور باتوں کے ساتھ حسبِ محل
آنکھوں آنکھوں میں گفتگو بھی ہو

کچھ تو آئے نظر، سراب سہی
کچھ تو انعامِ جستجو بھی ہو

ذہن کافر ہے دل مسلماں ہے
ان میں ممکن ہے، دوبدو کبھی ہو

نشتر جالندھری، محمّد عبد الحکیم خان

ضلع جالندھر (پنجاب) میں ایک چھوٹا سا گاؤں "میاں والی مولویاں" (تحصیل نکودر)
ہے، محمد عبد الحکیم خان وہیں ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے؛ ضلع کی نسبت سے اپنے نام
کے ساتھ جالندھری لکھتے تھے۔ یہ بستی بڑی مردم خیز رہی ہے۔ عہدِ مغلیہ کے بعض مشہور
علما یہاں کی خاک سے اٹھے۔ اورنگ زیب عالمگیر کے مرشد حضرت بدرالدین اولیاء
جب کابل سے ہجرت کر کے ہندستان آئے، تو انھوں نے بھی یہیں قیام کیا
تھا، بلکہ میانوالی مولویاں کی بنیاد ہی انھوں نے رکھی تھی۔
نشتر کے والد مولوی محمد اشرف خان مقامی پرائمری اسکول کے صدر مدرّس
تھے۔ نشتر کا تعلیمی دور بہت ممتاز رہا؛ اپنے درجے میں ہمیشہ اوّل آتے۔
دسویں کا امتحان انھوں نے گورنمنٹ ہائی اسکول، کوئٹہ سے پاس کیا تھا، جہاں
اس وقت ان کے بھائی مولوی عبد الغفور خان مقیم تھے۔ اس امتحان میں بھی اوّل
آئے، اور اس طرح لالہ جمعیت رائے گولڈ میڈل کے مستحق ٹھہرے، جو وہاں کے ایک
رئیس لالہ جمعیت رائے نے اپنے مرحوم اکلوتے بیٹے کی یاد میں جاری کیا تھا۔ اس
کے بعد وہیں اسلامیہ اسکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہو گئے۔
شاعری بہت کمسنی میں شروع کی۔ جب ایک مرتبہ گرمی کے زمانے میں امساکِ
باراں سے خلقِ خدا بہت پریشان تھی، ان کے استاد نے درجے کو بارش پر مضمون

لکھنے کو کہا۔ نشترؔ نے مضمون تو نثر میں لکھا، لیکن اس کے آخر میں اس شعر کا اضافہ کر دیا:

الٰہی! قبول اس کی کر لے دعائیں
کہ میٹھو کو زیبا ہے ساری خدائی

اس وقت ان کی عمر بمشکل دس برس کی ہو گی۔ کوئٹہ میں فوجی ملازمت کے امیدواروں کے لیے کیڈٹ کالج قائم تھا۔ اس میں اردو کے استاد کی جگہ خالی ہوئی۔ نشترؔ نے بھی ٹیچر شپ کا امتحان پاس کر کے درخواست دے دی۔ اور مقابلے کے امتحان میں یہاں بھی اوّل آئے۔ اس پر کالج کے پرنسپل نے انھیں ڈیڑھ سو روپے کے مشاہرے پر ملازم رکھ لیا۔ یہاں بعض اوقات اساتذہ کو فیلڈ سروس پر یعنی باہر بھی جانا پڑتا تھا۔ نشترؔ نے فیلڈ میں جانے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ترقی کے تمام راستے بند ہو گئے اور عمر بھر ڈیڑھ سو روپے سے آگے بڑھنے کی امید نہ رہی۔ اس پر انھوں نے کچھ مدّت بعد ملازمت سے استعفٰی دے دیا۔

اس کے بعد چندے "وکیل" (امرتسر) کے ایڈیٹر رہے اور پھر لاہور آ گئے۔ اب انھوں نے مختلف ناشروں کے وہاں کام کرنا شروع کیا۔ بیسیوں کتابیں معمولی اجرت پر لکھ کر دوسروں کے حوالے کر دیں، جو ان اصحاب کے نام سے شائع ہوئیں۔ غرض ناشروں کے وارے نیارے ہوتے رہے، لیکن نشترؔ غریب نے زندگی بھر کبھی فارغ البالی کا منھ نہ دیکھا۔ مثنوی مولانا روم کا منظوم ترجمہ سیماب اکبر آبادی (ف جنوری ۱۹۵۱ء) نے کیا تھا۔ اس کے لیے مشہور ناشر مولوی فیروز الدین (ف: اپریل ۱۹۴۹ء) نے انھیں دو پیسے فی شعر معاوضہ دیا تھا۔ سیماب بیچارے بھی کیا کرتے، انھیں روپے کی ضرورت تھی۔ بیماری کی حالت میں بھی انھوں نے اس کے پانچ دفتر کا ترجمہ مکمل کر دیا اور اس کے بعد کام چھوڑ دیا۔ نشترؔ نے نہ صرف اس ترجمے پر نظرِ ثانی کی، بلکہ خود چھٹے دفتر کا ترجمہ اضافہ کر کے کتاب مکمّل کر دی۔ یہی ترجمہ بعد کو الہامِ منظوم کے عنوان سے فیروز الدین اینڈ سنز کی طرف سے شائع ہوا۔

اس دوران میں نشتر نے ۱۹۲۴ء میں منشی فاضل اور ۱۹۲۵ء میں انٹر کے امتحان پاس کر لیے تھے۔ بی۔اے کی تیاری کر رہے تھے کہ شادی ہو گئی۔ اس کے بعد کسبِ روزگار کا مسئلہ کھڑا ہو گیا اور یوں تعلیم سے دست بردار ہونا پڑا۔

نشتر نے شروع میں کچھ دن نظم طباطبائی سے مشورۂ سخن کیا، لیکن جلد ہی استاد نے فارغ الاصلاح قرار دے دیا۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ نشتر کو جملہ اصنافِ سخن پر پوری قدرت حاصل تھی۔ ان کے اپنے نام سے جو کتابیں شائع ہوئیں، ان میں سے بعض نام یہ ہیں: نشترِ ادب؛ روحِ ادب؛ شرحِ بالِ جبریل وغیرہ۔

اتوار ۲۲ جون ۱۹۷۵ء کو لاہور میں انتقال ہوا۔

افسوس کہ باوجود تلاش، ان کے دونوں دیوان مہیّا نہ ہو سکے۔ ایک تذکرے میں تین غزلیں ملیں، انھیں میں سے چند شعر بطور نمونہ پیش کر رہا ہوں۔

رخصت ہوا شباب، زمانہ گذر گیا
وہ ہم، نہ وہ جواب، زمانہ بدل گیا

پہلی سی وہ زمین نہیں، وہ آسماں نہیں
دنیا ہے جیسے خواب، زمانہ بدل گیا

ہنگامے عشق و حُسن کے افسانہ ہو گئے
اللہ انقلاب، زمانہ بدل گیا

ارشاد جو حضور کا ہے، ہاں بجا، درست
بدلے نہیں جواب، زمانہ بدل گیا

نشتر جو شکوہ سنجِ تغافل ہوا کبھی
ہنس کر دیا جواب: "زمانہ بدل گیا"

یہ طُرفہ بحر ہے، ساحل ہے موج موج اس کی
بظاہر ایک بھی ساحل نظر نہیں آتا

رواں دواں ہیں مسافرِ تلاشِ منزل میں
اگرچہ جادۂ منزل نظر نہیں آتا
بہ اشک اشک نہیں، ننگِ اشک ہیں، نشترؔ!
جگر کا خون جو شامل نظر نہیں آتا

جو گلشن میں بہارِ فتنہ ساماں دیکھ لیتا ہوں
تو دامن دیکھ لیتا ہوں، گریباں دیکھ لیتا ہوں
نگاہ و بیرخی، دو رُخ ہیں تصویرِ محبّت کے
گلستاں دیکھ لیتا ہوں، بیاباں دیکھ لیتا ہوں
خود اپنا رہنما ہوں میں، بیابانِ تمنّا میں
کہ ہر ذرّے میں کوئے جاناں دیکھ لیتا ہوں

منظر لکھنوی، سیّد منظر حسن

نجیب الطرفین یعنی ددھیالی اور ننھیالی دونوں سلسلے امام دہم حضرت نقی علیہ السّلام سے جا ملتے ہیں۔ ان کے بزرگوں میں ایک صاحب نجم الدّین سب سے پہلے سبزوار سے ہندستان آئے۔ یہی لکھنؤ کے مشہور خاندانِ اجتہاد کے بھی مورثِ اعلیٰ ہیں۔ یہاں ان کی مناسب آؤ بھگت ہوئی، اور نصیر آباد کا علاقہ بطور جاگیر عطا ہوا۔ ایک زمانے تک خاندان نے خوشحالی کا دور دیکھا۔ لیکن کسی چیز کو دوام نہیں۔ رفتہ رفتہ حالات بگڑتے گئے، یہاں تک کہ ان کے جدِ امجد سیّد وارث حسین صرف "رئیس روضہ" (ضلع رائے بریلی، یو، پی) ہو کے رہ گئے۔ منظر کے والدِ بزرگوار شمس العلما مولانا سیّد سبط حسن کسی تعارف کے محتاج نہیں، بلحاظِ خطیب ان کا ملک بھر میں شہرہ تھا۔ ان کا پنجشنبہ ۲۸ محرم ۱۳۵۴ھ (۲ مئی ۱۹۳۵ء) کو لکھنؤ میں انتقال ہوا اور وہیں اماحباطرہ غفران مآب میں دفن ہوئے۔

منظر کی ٹھیک تاریخِ ولادت تو معلوم نہیں ہو سکی، لیکن اندازہ ہے کہ وہ ۱۹۱۴ء کے شروع میں اپنے آبائی مکان (بنجاری ٹولہ لکھنؤ) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی عربی و فارسی کی تعلیم گھر ہی پر مولانا آغا جون مرحوم کی نگرانی میں ہوئی، جو خاندانِ اجتہاد

مآخذ: سیّد باسط حسن ماہر لکھنوی؛ مرزا احمد اشفاق (شیعہ کالج لکھنؤ)؛ کاظم علی خان صاحب (شیعہ کالج لکھنؤ)

کے فرد تھے۔ اس کے بعد سلطان المدارس لکھنؤ میں داخلہ لیا لیکن بدقسمتی سے اسی دوران میں ان کے والد مولانا سبط حسن کا انتقال ہوگیا؛ مجبوراً اس کے بعد انھیں تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا۔

تعلیم نامکمّل رہ جانے سے قدرتاً دنیوی ترقّی کی سب راہیں بند ہوگئیں، جس سے لازماً عمر بھر قلیل، بلکہ ناکافی آمدنی میں گزارا کرنا پڑا۔ زندگی بھر مختلف پریشانیوں کی آماجگاہ بنے رہے۔ صحت ہمیشہ متوسط درجے کی رہی، نہ بہت اچھی، نہ بری، لیکن آرام و آسایش کے مسلسل فقدان نے رفتہ رفتہ رنگ دکھایا؛ ۱۹۷۲ء میں تپِ دق میں مبتلا ہوگئے۔ کافی وسائل نہ ہونے کے باعث مناسب علاج بھی نہ ہوسکا۔ تپِ دق اب مہلک نہیں رہا اور قابلِ علاج ہے۔ لیکن اس کا صرفہ ہنوز خاصا گراں ہے؛ اور اسی کا سامان ان کے پاس نہیں تھا۔

بالآخر اسی مرض سے ۲۲/۲۳ جون ۱۹۷۵ء کی شب میں تقریباً ڈیڑھ بجے (یعنی ۲۳ جون کے ابتدائی حصے میں) اپنے گھر پر جان، جان آفریں کے سپرد کردی۔ ۲۳ جون دوپہر کے وقت امامباڑہ غفراں مآب (لکھنؤ) کے اندرونی صحن میں (شمالی پھاٹک کے مقابل) سپردِ خاک ہوئے۔

بہت کم عمری میں شعر کہنے لگے تھے، اور یہ اثر تھا خاندانی ماحول کا۔ والد کا میدانِ علم و فضل میں ڈنکا بجتا تھا۔ وہ شعر بھی کہتے تھے، فاطر تخلص تھا۔ منتظر کے ایک چچا مولانا ظفر مہدی ماہنامہ "سہیلِ یمن" لکھنؤ کے مدیر تھے؛ دوسرے مولانا سیّد کامل حسین کامل (سکریٹری لنس جعفر علی خاں اثر رامپوری) شعر کہتے تھے اور مختلف علوم و فنون میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ خود منتظر کے بڑے بھائی سیّد محمد حسن سالک تخلص اور چھوٹے بھائی سیّد باسط حسن ماہر بھی شعر کہتے تھے۔ (تیسرے بھائی سیّد محمد وارث حسن انگلستان میں مقیم ہیں) غرض یہ بھی شعر کہنے لگے۔ ساری عمر کسی سے اصلاح نہیں لی۔

ان کے قطعات کا مجموعہ "ہفت رنگ" کے عنوان سے چھپ چکا ہے۔ معلوم ہوا تھا

کہ ان کے برادرِ خرد ماہر صاحب ان کے قصائد" منظر و نظارہ" کے نام سے مرتب کرکے چھپوانے کا انتظام کر رہے ہیں۔ لیکن کچھ شائع نہیں ہوا (۱۹۷۸ء) اس کے علاوہ بھی ان کا بہت غیر مطبوعہ کلام (سلام، غزل وغیرہ) ان کے خاندان میں موجود ہے۔

منظر مرحوم ساری عمر مجرد رہے تاہل کے جنجال میں پڑے ہی نہیں۔ بڑی بذلہ سنج، شگفتہ اور باغ و بہار طبیعت پائی تھی۔ صاف دل اور مرنجان مرنج، کسی کے بُرے میں نہیں تھے۔ اپنے قریبی حلقۂ احباب میں سب انھیں" منظر بھیّا" کہہ کر پکارتے؛ اور وہ اس سے بہت خوش ہوتے تھے۔

انّا للہ وانّا الیہ راجعون

کلام میں کوئی خاص بات نہیں۔ زبان پر قدرت ہے۔ فنّی پہلو سے بھی بے عیب ہے۔

چند قطعات ملاحظہ ہوں:

رشتۂ صبر ٹوٹ جائیگا آبلہ دل کا پھوٹ جائیگا
مسکرا کر نہ دیکھیے، ورنہ جام ہاتھوں سے چھوٹ جائیگا

دل کی خاموش دنیا جگا دیجیے جو جو بات ہیں، وہ اٹھا دیجیے
آسرے ڈھونڈتی ہے نگاہِ وفا ہو سکے، تو صدا پر صدا دیجیے

نقابِ رخ الٹ کر دیکھ لیجیے زرا دنیا سے ہٹ کر دیکھ لیجیے
اگر ہے مصلحت سے چشم پوشی بہانے سے، پلٹ کر دیکھ لیجیے

ذرا کچھ محبّت کے ماروں سے کہہ دو
جئیں کس طرح جاں نثاروں سے کہہ دو

بتاؤ تو، کیا فیصلہ ہے تمھارا!
جو منھ سے نہ بولو، اشاروں سے کہہ دو

زباں سے نہ رُودادِ غم کہہ سکینگے
نہ ایذائے شامِ اَلم، کہہ سکینگے
یونہی دل کے ارمان، دل میں رہینگے
نہ تم کہہ سکو گے، نہ ہم کہہ سکینگے

اب اذیت، اذیت نہیں ہے زحمتِ شامِ فرقت نہیں ہے
یہ ندامت سرِ قبر کیسی! جاؤ، کوئی شکایت نہیں ہے

وقت کے ساتھ چھل کے نکل جاؤ گے
پھیر لوگے نظر، چال چل جاؤ گے
تھام کر ہم کلیجے کو رہ جائینگے
تم بدلتے بدلتے، بدل جاؤ گے

حامد الہ آبادی، حامد حسین

شیوخ صدیقی کے ایک متوسط الحال، لیکن معزز گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ ضلع الہ آباد کی تحصیل چائل میں ایک مختصر موضع "بہکا" ہے: یہ انھی کے بزرگوں نے آباد کیا تھا، جب وہ عہدِ عالمگیری کے آخری زمانے میں یہاں آ کر بس گئے تھے۔ حامد حسین جون ۱۹۳۲ء میں بہکا میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حکیم اختر حسین خاصی سماجی حیثیت کے مالک تھے۔ بزرگوں کی پیدا کردہ جاداد ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی نذر ہو گئی؛ انھوں نے اپنی محنت اور معاملہ فہمی، سوجھ بوجھ اور انتظامی قابلیت سے خاندان کو پھر سے اپنے پانؤ پر کھڑا کر دیا۔ اس سے املاک میں بھی وسعت ہوئی؛ اور وقار میں ترقی بھی۔

حامد حسین اپنے والدین کی سب سے بڑی اولاد تھے۔ ۱۹۵۸ء میں ان کے والد حکیم اختر حسین کسی مقدمے کے سلسلے میں کچہری گئے تھے، وہاں بھری عدالت میں کسی مخالف نے انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اب خاندان کی پوری ذمہ داری حامد حسین کے کندھوں پر آ پڑی۔ یہی مصیبت کیا کم تھی کہ کچھ مدت بعد ۱۹۵۹ء میں حکیم اختر حسین کے بعض مبینہ قاتلوں کا پُراسرار طریقے پر قتل ہو گیا اور اس سلسلے میں جو بندوق استعمال ہوئی تھی، بدقسمتی سے تفتیش پر کھلا کہ وہ خود حامد حسین کی تھی (جو قاتلوں نے اسی جرم کے ارتکاب کے لیے چوری کی تھی)۔ اس

پر حامد حسین گرفتار کر لیے گئے۔ مقدمہ چلا اور اس سلسلے میں آٹھ مہینے نینی تال جیل میں کاٹنا پڑے۔ لیکن بالآخر استغاثہ جرم ثابت نہ کرسکا اور یہ باعزت بَری کر دیے گئے۔

دسویں درجے تک تعلیم باقاعدہ اسکول میں پائی تھی۔ اس کے بعد ناسازگار حالات کے باعث یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ملازمت کے دوران میں پرائیوٹ طور پر انٹر اور ادیب ماہر اور ادیب کامل کے امتحانات پاس کر کے آخر کار بی۔ اے کی سند بھی لے لی۔ ملازمت محکمۂ تعلیم میں رہی جہاں نیک نامی سے بسر ہوئی۔

وہ شعر تو بہت ابتدا میں کہنے لگے تھے، لیکن ۱۹۵۰ء سے اس پر زیادہ توجہ دینے لگے۔ یہ شوق انھیں گویا ورثے میں ملا تھا۔ ان کے والد حکیم اختر حسین بھی شعر کہتے تھے؛ اختر اور تسنیم تخلص کرتے تھے۔ ان کے تین چار شعر دیکھیے جن سے ان کے اندازِ سخن کا کچھ اندازہ ہو جائیگا (اس سے مقصد یہ بھی ہے کہ اس طرح ان کے چند شعر محفوظ ہو جائیں)

حریصِ لذّتِ آزار، مجھ کو دیکھ کر، ہمدم!
کسی نے میرے دل میں جستجوے لامکاں رکھ دی

حاضر ہیں آپ کے درِ دولت پہ دیر سے
ہوش و حواس، عقل و خرد، جسم و جاں سے ہم

اک بے نیازِ عشق و محبّت کی یاد میں
اختر! خدا گواہ، گئے دو جہاں سے ہم

کبھی بے آینہ جلووں کی ارزانی بھی دیکھی ہے
اگر مقصود ہو، لا شیشۂ دل، دیکھنے والے

بساطِ کون و مکاں پر یقین کی چال چلا
تو راز مجھ پہ کھلا کہ کیا ہوں میں

پہلے مدّتوں حامد بہکاوی کے نام سے لکھتے رہے، بعد کو احباب کے کہنے پر حامد حسین

حامد لکھنے لگے۔ الہ آباد کے ماہنامے "شب خون" سے اس کے روز اول سے تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ اگرچہ انھوں نے ابتدا غزل سے کی تھی، لیکن "شب خون" سے تعلق کے بعد نظم پر بھی توجہ کرنے لگے۔ اور اس میں کامیاب بھی رہے۔ "شب خون" میں کبھی کبھی تبصرے بھی لکھا کرتے تھے۔ ۱۹۶۷ء میں مشہور نقاد شمس الرحمٰن فاروقی کے ساتھ مل کر انھوں نے جدید شاعری کا ایک نمایندہ انتخاب "نئے نام" کے عنوان سے مرتب کیا تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے بچوں کے لیے بھی بہت کچھ لکھا؛ ان میں سے دو کتابوں، "ایجادات کی کہانی" (۱۹۷۳ء) اور "بھارت کے نامور سائنسدان" (۱۹۷۴ء) پر انھیں یو پی اردو اکیڈمی نے انعام دیا تھا۔

افسوس کہ ان کا مجموعۂ کلام ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا، اگرچہ اس کا نام "الفاظ کی خوشبو" مشتہر ہو چکا تھا۔ اس میں کچھ ان کی بے نیازی کو بھی دخل رہا۔

۱۵ اگست ۱۹۷۵ء کو معمولی بخار میں مبتلا ہو گئے؛ علاج ہونے لگا۔ انھیں متاثرالیہ قید کے زمانے سے دل کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا، اور دل پہلے سے کمزور تھا؛ اب کچھ پھیپھڑے بھی متاثر پائے گئے، تو علاج کے لیے میڈیکل کالج، الہ آباد میں داخل ہو گئے۔ پانچ دن تک زیست اور موت کی کشمکش میں رہنے کے بعد ۱۰ دسمبر ۱۹۷۵ء کو رحلت کی۔ لاش ان کے وطن بہکا گئی اور وہاں خاندانی قبرستان میں سپردِ خاک ہوئی۔

۱۹۵۱ء میں ان کی شادی الہ آباد کے جوار کے ایک مقام "سید سراداں" میں ہوئی تھی۔ جسمانی اولاد میں چار بیٹے (اعظم، معظم، اسلم، اکرم) اور دو بیٹیاں (نسرین اور تمکین) اپنی یادگار چھوڑیں۔

افسوس کہ کلام آج تک جمع نہیں ہو سکا۔ کچھ غزلیں ماہنامہ "شب خون" میں ملیں۔ ان کی بیاض سے کچھ کلام شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے مہیا کیا جس کے لیے ان کا ممنون ہوں، اسی کا انتخاب بطور نمونہ پیش ہے:

پامالِ جنوں شہرِ تمنا ابھی کرینگے
یہ شرط اگر ہے تو ہم ایسا بھی کرینگے
مستقبلِ زرّیں پہ بھروسا بھی کرینگے
جینا ہے تو جینے کا سہارا بھی کرینگے
خاکسترِ ماضی میں شرر ڈھونڈنے والے!
کہتے ہیں کہ راہوں میں اجالا بھی کرینگے
ہم برسرِ پیکار ہیں امروز کے غم سے
ہاں، ہم ہی علاجِ غمِ دوراں بھی کرینگے
دشواریِ حالات، حوادث کے تھپیڑے
منزل کا یقین ہے تو گوارا بھی کرینگے
یہ بزم کا عالم ہے، تو پھر اہلِ تمنا
ساقی سے توجہ کا تقاضا بھی کرینگے
بیداریِ غم آج کہ ہر اک پہ گراں ہے
کیا اہلِ جہاں اس سے کنارہ بھی کرینگے؟

کتابِ شوق، لیکن بے ورق ہوں — یکے از کشتگانِ با خلق ہوں
مری پہنائیوں کا راز سمجھو — مجھے دیکھو، طبق اندر طبق ہوں
ہزاروں طور ہیں خاشاک جن سے — انھیں سچائیوں کی میں رمق ہوں

ہزاروں لفظ ہیں لیکن ہر اک کی جیب خالی ہے
یہ افلاسِ لباسِ شاعری، یارو! مثالی ہے
لگے ہیں کان آوازوں پہ، لیکن لفظ گونگے ہیں
گذرتے موسموں کی داستان سب سے نرالی ہے
کسی تعریف ہی کی روشنی میں آنکھ کھلنی ہے
بتانے کی ضرورت ہے، یہ کالی رات کالی ہے۔

ہمیں تنہا نہیں ہیں، جستجو کی دوڑ میں لیکن
ہمیں سے کس لیے پھر آج ہر ذرّہ سوالی ہے
یہ یکتائی ہماری، ہم سے ہی منسوب ہے، حامد!
یہ اپنی وضع، اپنی طرز خود ہم نے نکالی ہے

اک شخص تھا سو اب وہ بیاباں نورد ہے
اس شہر میں ہمارے سوا کون مرد ہے
چہرہ ہر ایک مدِ مقابل کا زرد ہے
عشقِ نبرد پیشہ طلب گارِ مرد ہے
یک جہتیِ نگاہ کو آواز کون دے
ہر دفترِ خیال یہاں فرد فرد ہے
اس جستجو کی دوڑ میں یہ بھید بھی کھلا
رنگِ سخن تلاشِ معانی کی گرد ہے
غرفے سے لمحے کے جھانکیگا اصل رنگ
چہرے پہ ہم سمجھوں کے اگر آب زرد ہے
دستِ سخن میں تیشۂ باطل نہ دیجیے
دشمن اگرچہ راہ کا ہر سنگ سرد ہے
اس میں حرارتوں کی نئی روح پھونک دو
خواہش کی لاش ایک زمانے سے سرد ہے

یقیں کی حد سے گزر کر گماں تک آئے ہیں
کہاں سے اہلِ محبت کہاں تک آئے ہیں
یہیں تو ختم نہیں راہِ جستجو، اے دوست!
چراغ دل کے سہارے جہاں تک آئے ہیں
روایتوں کے سمندر کو پیر کر، ہم لوگ
مقامِ عشقِ حقیقت نشاں تک آئے ہیں
تمہارے بام سے، تم کو خبر بھی ہو شاید
ہزار سنگ سرِ دستاں تک آئے ہیں

منزل و رہ کا یقیں کیسا چل پڑے آپ تو چلتے رہیے
اپنی تشہیر کی خاطر ہی سہی گھر سے باہر بھی نکلتے رہیے
رُوح کی موت سے بچنے کے لیے اپنے قالب کو بدلتے رہیے

کچھ گفتگو سے اس کو سروکار بھی تو ہو یہ خامشی علامتِ اظہار بھی تو ہو
بکتے ہیں ہم بھی، کوئی خریدار بھی تو ہو بازار کی طرح کوئی بازار بھی تو ہو
جس کی بشارتیں ہیں کتابوں میں جابجا وہ صبحِ زندگی کی نمودار بھی تو ہو
یہ کاروانِ شوق، یہ راہیں، یہ منزلیں حائل کسی جگہ کوئی دیوار بھی تو ہو
تاریکیوں میں ہم سبھی اماں ڈھونڈنے چلیں لیکن وجودِ صبح سے انکار بھی تو ہو

آؤ، ان لمحوں کو ہم لوگ مقیّد کر لیں
تاکہ آنکھوں میں یہ اندازِ جہاں رہ جائے
بات بننے کی نہ صورت، نہ کوئی شکلِ فرار
پاس لے دے کے اگر، عجزِ بیاں رہ جائے

آنکھوں کے ساتھ ذہن کا دروازہ بند کر
ہر صاحبِ کمال پر یوں زہر خند کر
یہ ایسی ویسی بات نہیں ہے، گرہ میں رکھ
جو تجھ کو مل گیا، اسے مٹھی میں بند کر
وہ تیرگی کا زہر، یہ تابندگی کا قہر
اب تجھ کو اختیار ہے، جو بھی پسند کر

راشد، ن، م (نذر محمد)

پاکستان کے ضلع گوجرانوالہ میں، وزیر آباد۔ لائل پور لائن پر ایک خاصا بڑا قصبہ (جو اب شہر کی حیثیت اختیار کر گیا ہے)، علی پور چٹھہ ہے؛ یہ تحصیل کا صدر مقام بھی ہے تقسیم ملک سے پہلے اس کا نام "اکال گڑھ" تھا۔ اس زمانے میں یہاں کا مولویوں کا خاندان عمائد میں شمار ہوتا تھا۔ (شاید اب بھی ہو)۔ اگرچہ یہ لوگ قوم کے جنجوعہ تھے، لیکن انھوں نے دینیات کو اپنا پیشہ بنایا، اور پشتوں تک منبر و محراب کے مکین رہے۔ سکھوں کے عہد میں ان کی خاصی عزت تھی اور ان کا یہ مقام انگریزی زمانے میں بھی قائم رہا۔ اسی خاندان کے ایک فرد جناب فضل الٰہی چشتی صوبے کے محکمۂ تعلیم میں ملازم ہوئے۔ وہ بتدریج ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس کے عہدے تک پہنچے اور وہیں سے پنشن پر سبکدوش ہوئے۔ ان کے دو بیٹے تھے: نذر محمد اور عبدالماجد۔ یہی نذر محمد بعد کو، ن م راشد کے نام سے دنیائے شعر و ادب میں مشہور ہوئے۔ ماجد صاحب بھی مدتوں محکمۂ تعلیم سے منسلک رہے۔ وہ کسی زمانے میں ملتان میں سیکنڈری تعلیم کے دفتر میں کام کرتے تھے۔ آج کل غالباً کسی ناشرِ کتب کے یہاں نوکر ہیں۔

راشد صاحب یکم اگست ۱۹۱۰ء کو اکال گڑھ[1] میں پیدا ہوئے۔ "خضر عمر" تاریخی

[1] ایک صاحب نے مقامِ ولادت "کیلیان والا" کہا ہے یہ ٹھیک نہیں

نام ہے، جس سے (۱۹۱۰ء) نکلتے ہیں۔ ابتدائی تعلیم مقامی گورنمنٹ ہائی اسکول میں پائی، جہاں سے ۱۹۲۶ء میں دسویں کی سند ملی۔ اس کے بعد گورنمنٹ انٹر کالج لائل پور پہنچے، اور ۱۹۲۸ء میں وہاں کا نصاب مکمل کر کے لاہور چلے آئے اور گورنمنٹ کالج میں داخلہ لے لیا۔ یہیں سے چار برس بعد ۱۹۳۲ء میں ایم، اے (اقتصادیات) کی سند حاصل کی۔

ان کی شعر گوئی اکال گڑھ کی طالب علمی کے زمانے میں شروع ہو چکی تھی۔ روایت ہے کہ انھوں نے سب سے پہلی نظم ۱۹۱۷ء میں "انسپکٹر اور مکھیاں" کے عنوان سے سات برس کی عمر میں کہی۔ ہوا یہ کہ ایک انسپکٹر صاحب ان کے اسکول کا معاینہ کرنے کے لیے آئے۔ ان کے سر کے گرد مکھیوں کا جھرمٹ منڈلا رہا تھا، جو ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں ان کے ساتھ منتقل ہوتا رہا۔ یہ نظارہ دیکھ کر نذر محمد کو سخت تعجب ہوا اور اس پر انھوں نے یہ نظم لکھی۔ اس نظم میں انھوں نے اپنا تخلص "گلاب" لکھا تھا۔ ان کے والد جناب فضل الٰہی نے نظم دیکھی، تو بہت خوش ہوئے اور اس پر بیٹے کو ایک روپیہ انعام دیا۔ خود اُن کے والد (یعنی راشد کے دادا) جناب غلام رسول جو پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر تھے، اور اردو، فارسی میں شعر بھی کہتے اور "غلامی" تخلص کرتے تھے، جناب فضل الٰہی نے بیٹے کی یہ نظم اپنے ابا کی خدمت میں بھیج دی۔ دادا نے اس پر ہونہار پوتے کو یہ شعر لکھا:

میرے میاں گلاب! دہن میں گلاب ہو
خوشبو سے تیری بابا ترا فیضیاب ہو

اور کہا کہ شعر گوئی سے اجتناب کرو، ورنہ کسی کام کے نہیں رہو گے؛ بس اپنی تعلیم سے کام رکھو۔ لیکن یہ نشہ ایسا نہیں، جسے ترشی اتار دے۔ چنانچہ ان کا یہ مشغلہ جاری رہا۔ کالج پہنچے، تو اس شوق نے اور ترقی کی اور پختگی اختیار کر لی۔ گورنمنٹ کالج، لاہور کے زمانے میں یہ کالج کی بزمِ سخن کے سکتر اور کالج کے

ماہانہ رسالے "راوی" کے اردو حصّے کے مدیر مقرر ہو گئے۔ اسی زمانے میں ان کی غزلیں اور نظمیں ہمایون اور نگار میں بھی شائع ہوئیں۔ وہ نثر بھی لکھتے تھے؛ اس میں زیادہ توجہ تنقید پر تھی۔ غرض کہ کالج سے فارغ ہونے سے پہلے وہ لاہور کے ادبی حلقوں میں شاعر اور ادیب کی حیثیت سے متعارف ہو چکے تھے۔

اس زمانے میں وہ "راشد وحیدی" کے نام سے لکھتے رہے۔ یہ نسبت انھوں نے اپنے خالو محمد وحید کیلانی سے اظہارِ ارادت کے طور پر اختیار کی تھی۔ کیلانی صاحب بھاٹی دروازہ، لاہور کے اسلامیہ ہائی اسکول میں مدرّسِ ثانی (سیکنڈ ماسٹر) تھے۔ ۱۹۲۴ء میں نیرنگِ خیال جاری ہوا؛ اور واقعتًا "ستارۂ درخشندہ و ماہِ کامل شد" والی بات ہو گئی۔ تاثیر اس کے ایڈیٹر تھے۔ ان کے ساتھ پورا "نیاز مندانِ لاہور" کا حلقہ ان کی پشت پر، چغتائی کی مصوری کے شاہکار بھی ہر شمارے میں شامل ہوتے۔ اور ان تمام خوبیوں کے باوجود چندہ صرف تین روپے سالانہ! چھ مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ پرچے کی اشاعت پانچ ہزار تک پہنچ گئی۔ اس پر بعض اور اصحاب کے منھ میں بھی پانی بھر آیا۔ حافظ محمد عالم نے "عالمگیر" اور وحید کیلانی نے "قوسِ قزح" جاری کیے۔ "عالمگیر" تو چل نکلا، کیونکہ حافظ محمد عالم کا اپنا مطبع تھا اور ان کی مالی حالت بھی بودی نہیں تھی؛ لیکن "قوسِ قزح" نے دو ہی برس (۱۹۲۷ - ۱۹۲۹ء) میں دم توڑ دیا۔ خیر، یہ تو جملۂ معترضہ تھا، جو ذرا طویل ہو گیا۔ کہہ یہ رہا تھا کہ ن۔ م راشد ان دنوں راشد وحیدی کے نام سے لکھا کرتے تھے۔ راشد تخلص بھی کیلانی صاحب ہی نے دیا تھا۔

کالج کے دور میں وہ اسی نام سے روایتی شاعری کرتے رہے۔ اس زمانے میں وہ اختر شیرانی (ف: ستمبر ۱۹۴۸ء) اور روش صدیقی (ف: جنوری ۱۹۷۱ء) اور سید عابد علی عابد (ف: جنوری ۱۹۷۱ء) کے زیرِ اثر رہے، بلکہ ایک مرتبہ روش صدیقی نے خود مجھ سے کہا تھا کہ ابتدا میں راشد نے اپنے کلام پر ان سے اصلاح

لی۔ لیکن جلد ہی وہ روایتی عشقیہ اور غنائیہ شاعری کو ترک کر کے میراجی (ف: نومبر ۱۹۴۹ء) اور تصدق حسین خالد کے ساتھ مل کر آزاد نظم نگاری کرنے لگے۔

ایم اے کرنے کے بعد، اپنی افتادِ طبع کے باعث، انھوں نے چاہا کہ والد کے اثر سے کہیں محکمۂ تعلیم میں ملازمت مل جاتے۔ جناب فضل الٰہی اس زمانے میں شیخو پورہ میں تعینات تھے۔ یہ ان کے پاس پہنچے، لیکن یہاں کوئی کامیابی نہ نہ ہوئی۔ جلد ہی والد کا تبادلہ ملتان ہو گیا، اور یہ بھی ان کے ساتھ وہاں چلے گئے۔ یہ وہ زمانہ ہے، جب حکومتِ پنجاب نے دیہات سدھار کا کام وسیع پیمانے پر شروع کر رکھا تھا۔ (سر) مالکم ڈارلنگ اس محکمہ کا کرتا دھرتا اور مسٹر برین اُن کے دستِ راست تھے۔ من جملہ اور باتوں کے مختلف مقامات سے ایسے رسالے شائع ہونے لگے، جن میں دیہاتی زندگی کی بہتری اور دیہاتیوں کی بہبودی کے موضوع پر مضامین چھپتے تھے۔ اسی طرح کا ایک ماہنامہ "نخلستان" ملتان سے بھی نکلتا تھا۔ راشد اس کے ادارۂ تحریر سے وابستہ ہو گئے۔ یہاں وہ دو برس رہے، اور پھر ۱۹۳۴ء میں واپس لاہور آ گئے۔

لاہور کے علمی حلقوں میں وہ اجنبی نہیں تھے۔ مولانا احسن اللہ خان تاجور نجیب آبادی (ف: جنوری ۱۹۵۱ء) اس زمانے میں اپنا مشہور ماہنامہ "شاہکار" شائع کرتے تھے۔ انھوں نے راشد کو نائب مدیر کی جگہ پیش کی۔ مشاہرہ صرف ۳۵ روپے تھا، لیکن مرتا کیا نہ کرتا؛ تنخواہ کم ہونے کے باوجود راشد نے یہ پیشکش قبول کر لی۔ مگر یہاں کی فضا سے جلد ہی دل اچاٹ ہو گیا۔ تاجور نے رسالے کا کاروباری صیغہ اپنے برادرِ نسبتی سلیمان خان کے سپرد کر رکھا تھا؛ راشد کی ان سے کسی بات پر چل گئی۔ تنخواہ پہلے ہی ناکافی تھی؛ ۱۹۳۵ء میں شادی بھی ہو گئی تھی، جس سے ذمہ داریاں المضاعف ہو گئیں۔ انھوں نے تنخواہ میں اضافے کی درخواست کی، جو مولانا تاجور نے رد کر دی۔ اس پر دل برداشتہ ہو کر راشد نے استعفیٰ دے دیا اور ملتان کی راہ لی؛ اور وہاں کمشنر کے دفتر

میں کلرک بن گئے۔

ملتان کے زمانۂ قیام کا ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے:

یہ خاکسار تحریک کے شباب کا زمانہ تھا۔ یہ تحریک علامہ عنایت اللہ مشرقی (ف: اگست ۱۹۶۳ء) نے ۱۹۳۱ء میں شروع کی تھی۔ یہاں اس کے حسن و قبح پر بحث کرنا بیجا ہوگا۔ جن لوگوں نے اس زمانے میں خاکساروں کو خاکی وردی ڈانٹے، کندھوں پر بیلچے رکھے، بازاروں میں فوجی مارچ کرتے دیکھا ہے، وہی کچھ ان کے عزائم کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ راشد شروع سے نظم و ضبط کی زندگی کے قائل رہے تھے۔ انھیں خاکساروں کی تنظیم اور باقاعدگی بہت پسند آئی۔ غرض وہ اس تحریک میں شامل ہو گئے؛ اور رفتہ رفتہ ضلع بھر کے رضاکاروں کے سالار کے عہدے تک پہنچ گئے۔ لیکن ان لوگوں کی آمریت ان کے حلق سے نہ اتر سکی اور سال ہی بھر بعد وہ اس سے الگ ہو گئے۔

ملتان کا یہ زمانہ ان کے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔ انھوں نے اپنی آمدنی میں اضافے کی غرض سے روسی مصنف الیگزینڈر کوپرین کے ناول "یاما" کا اردو میں ترجمہ کیا کہ شاید اس سے کچھ یافت ہو؛ لیکن ناشر نے انھیں ایک حبہ بھی نہ دیا، بلکہ کتاب پر بحیثیت مترجم ان کا نام تک شائع نہیں کیا۔

القصہ صورتِ حال سخت ناتسلی بخش تھی۔ خانہ داری کی روز افزوں ذمہ داریاں، تنخواہ قلیل، اور کام ان کے مذاق کے بالکل خلاف۔ ان کے لیے ملتان میں کوئی اور کشش بھی نہیں رہی، لیکن احتیاج انسان کو سب کچھ برداشت کر لینے پر مجبور کر دیتی ہے۔ بہر حال وہ یہاں سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے رہے۔ اور بالآخر مئی ۱۹۳۹ء میں آل انڈیا ریڈیو، لاہور کے دفتر میں پروگرام اسسٹنٹ کی نوکری مل گئی۔ چند ہفتے بعد اسی عہدے پر دلّی تبادلہ ہو گیا اور یہاں ترقی کر کے پروگرام ڈائرکٹر کے عہدے تک پہنچے۔ ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگِ عظیم شروع ہو گئی اور ریڈیو کے محکمے کے ڈائرکٹر جنرل سید احمد شاہ

بخاری "پطرس" مرحوم (ف: دسمبر ۱۹۵۸ء) نے ادیبوں کی کھیپ کی کھیپ کو فوج میں عارضی کمیشن دلوا کر محکمۂ تعلقاتِ عامّہ میں بھرتی کرا دیا۔ اسی ریلے میں راشد بھی کپتان بن گئے اور عراق، ایران، مصر، سری لنکا (سیلون) میں چار برس گزار کر وسطِ ۱۹۴۷ء میں وطن واپس آئے، اور دوبارہ آل انڈیا ریڈیو سے منسلک ہو گئے۔ تھوڑے ہی دن لکھنؤ میں اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائرکٹر رہے تھے کہ ملک تقسیم ہو گیا اور وہ پاکستان چلے گئے۔ پشاور اور لاہور میں دو ڈھائی سال گزارنے کے بعد ان کا ریڈیو پاکستان کے مرکزی دفتر کراچی میں بحیثیت مدیرِ تعلقاتِ عامّہ تقرر ہو گیا۔ اس کے بعد کوئی دو سال پشاور میں ریجنل ڈائرکٹر بھی رہے۔

۱۹۵۲ء میں انھیں اقوامِ متحدہ (نیو یارک) میں ملازمت مل گئی۔ اس سلسلے میں انھوں نے نیو یارک، انڈونیشیا، پاکستان، ایران میں ۱۵-۱۶ برس گزارے ۱۹۷۴ء میں ملازمت سے پنشن پر سبکدوش ہوتے، تو مستقل سکونت انگلستان میں اختیار کر لی۔ پہلے لندن میں ایک کرایے کے مکان میں مقیم رہے؛ ۱۹۷۵ء کے اواخر میں "چیلٹن ہم" میں اپنا مکان خرید لیا۔

ان کی پہلی بیوی ان کے ماموں کی بیٹی تھیں۔ اس بیگم سے ان کے پانچ بچے ہوتے، چار بیٹیاں: نسرین، یاسمین، شاہین اور تمرین؛ اور ایک بیٹا: شہریار۔ بفضلہ سب بچے زندہ ہیں۔ شہریار پاکستانی سفارتخانہ برسلز (بلجیم) میں ملازم ہیں۔ (۱۹۷۵ء) بڑی دونوں لڑکیوں کی شادی ہو چکی ہے۔

اس بیگم کا اکتوبر ۱۹۶۱ء میں انتقال ہو گیا۔ اس زمانے میں وہ نیو یارک میں مقیم تھے۔ یہاں ان کی چھوٹی بچی تمرین یو این او کے اسکول میں پڑھتی تھی۔ اسکول میں اس کی استانی مس شیلا انجیلینی تھیں۔ اس خاتون کے والد اطالوی نسل کے اور ماں انگریز ہے۔ وہ خود ٹرینڈ ٹیچر ہیں۔ مدّتوں روما (اطالیہ) کے انٹرنیشنل اسکول میں پڑھاتی رہیں اور جس زمانے میں راشد نیو یارک میں تھے،

یہ وہاں یو، این، او کے انٹرنیشنل اسکول میں ملازم تھیں۔ جب راشد کی بیوی کا انتقال ہو گیا، تو انھوں نے دو سال بعد ستمبر ۱۹۶۳ء میں ان سے شادی کر لی۔ ان کے بطن سے ۱۹۶۷ء میں بیٹا پیدا ہوا جس کا نام انھوں نے 'نزیل' رکھا۔[۵]

جون ۱۹۷۵ء میں ان کے خسر مسٹر انجیلینی کا لندن میں انتقال ہو گیا، اور ان کی لاش جنوبی لندن کے برقی شمشان میں جلائی گئی۔ راشد بھی جنازے کے ساتھ تھے۔ جب لاش جل رہی تھی انھوں نے وہاں کے منتظمین سے دریافت کیا کہ اس کا طریقہ کیا ہے؟ جب انھیں بتایا گیا، تو کہا یہ تو بہت آسان اور صاف ستھرا طریقہ ہے۔ بیوی سے کہنے لگے کہ جب میں مروں، تو میری لاش بھی اسی طرح جلائی جائے۔ یہ بات انھوں نے بیوی سے پھر ایک موقعے پر دہرائی، بلکہ جب ان کا بیٹا شہریار برسلز سے ملنے کو لندن آیا، تو اس سے بھی کہا کہ "میاں، میرے مرنے پر میری لاش برقی شمشان میں جلا دینا۔"

مسز شیلا راشد کا بھائی روما میں تھا۔ اس کی موت کا تار ملنے پر وہ روما چلی گئیں۔ روانگی سے پہلے انھوں نے راشد سے کہا تھا کہ آپ بعد کو میری والدہ کو ساتھ لے کر روما آجایئے گا۔ راشد ۹ اکتوبر کو اپنے مسکن چیلٹن ہم سے وان اسٹیڈ آئے۔ اسٹیشن پر اُترنے کے بعد وہ بکس ہاتھ میں لیے پیدل اپنی خوشدامن کے مکان گئے۔ انھیں انجائنا کی شکایت پہلے سے تھی۔ ہاتھ میں بوجھل بکس لیے تقریباً میل بھر کے اس پیدل سفر نے انھیں بالکل نڈھال کر دیا۔ منزلِ مقصود پر پہنچنے کے کوئی دس منٹ بعد شام کے ساڑھے سات بجے ان پر دل کا دورہ پڑا اور اس سے پیشتر کہ کوئی طبی امداد پہنچ سکے، وہ جاں بحق ہو گئے۔ بیگم روما سے اور بیٹا شہریار برسلز سے آئے، تو ۱۴ اکتوبر ۱۹۷۵ء دن کے چار بجے ان

---

۵ یہ نام انھوں نے اپنے نام (نذر محمد کے پہلے حصے) اور بیوی کے نام (شیلا کے آخری حصے سے ترکیب دے کر بنایا ہے (وہ بیوی کو شیل کے نام سے پکارتے تھے) یوں عربی میں نزیل کے معنی ہیں مہمان

کے جسدِ خاکی کو ان کی خواہش کے مطابق، جنوبی لندن کے برقی شمشان میں نذرِ آتش کر دیا گیا۔

چونکہ لاش کا جلانا، اسلام کی روایات کے خلاف ہے، اس لیے لندن میں مقیم بیشتر مسلمانوں نے تجہیز و تکفین اور جنازے میں شمولیت نہیں کی تھی؛ مشکل سے آٹھ دس آدمی جنازے کے ساتھ تھے اور وہ بھی ان کے ذاتی دوست۔

راشد کے تین مجموعے چھپ چکے ہیں: (۱) ماورا (۱۹۴۲ء)؛ (۲) ایران میں اجنبی (۱۹۵۵ء)؛ (۳) لا = انسان (۱۹۶۹ء)۔ بعد کا کلام بھی مدوّن شدہ موجود ہے، اور یقیناً چھپ جائیگا۔ اس کے علاوہ انھوں نے بعض ترجمے کیے تھے، ان میں سے بھی تین شائع ہو چکے ہیں۔ کوپرین کے ناول "یاما" کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ ولیم سیبروین کے ناول (Mama, I love you) کا ترجمہ اور لورین آیزلے کا ناول (وقت کا آسمان) بھی چھپ چکے ہیں۔ آخری زمانے میں وہ جدید فارسی کا وسیع مطالعہ کر رہے تھے، اور انھوں نے ۲۰-۲۲ ایرانی شاعروں کی تخلیقات کا اردو میں ترجمہ بھی کیا تھا؛ یہ تراجم بھی شائع ہو رہے ہیں۔

یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ جب ۱۹۴۲ء میں ان کا پہلا مجموعہ "ماورا" شائع ہوا ہے، تو ادبی اور تنقیدی حلقوں میں گویا بھونچال سا آگیا۔ اس سے پہلے ہیئت کے تجربے تو ایک زمانے سے ہو رہے تھے؛ لیکن کہا گیا کہ انھوں نے صنعتِ ابہام کو بدنما حد تک استعمال کیا ہے اور جنسی عریانی کھلے بندوں ان کے ہاں ہے، اتنی اس سے پہلے کہیں اور نہیں ملتی۔ یہ جارحانہ تنقید بیشتر ان اصحاب کی طرف سے ہوئی، جو وکٹوریائی عہد کے اخلاقی قواعد و ضوابط کے زیرِ اثر عورت اور اس کے متعلقات کا برسرِ عام ذکر بھی بد اخلاقی (بلکہ گناہ) تصوّر کرتے تھے۔ حیات اللہ انصاری نے تو اپنی تنقید "ن۔م راشد پر" کے عنوان سے کتابچے کی شکل میں شائع بھی کر دی تھی۔ (دلّی نومبر ۱۹۴۵ء) لیکن دُھن کے پکّے راشد نے ان مخالفانہ حملوں کی پروا نہ کی، اور اپنی انتخاب کردہ راہ پر گامزن رہے۔ "لا = انسان" کے شروع میں

ان کا ایک طویل مصاحبہ (انٹرویو) چھپا ہے، جس سے ان کی شاعری کے کئی گوشے روشنی میں آتے ہیں، اور اس سے ان کے کلام کے سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ بہر حال، اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ اردو شاعری کی تاریخ میں راشد کا مقام محفوظ ہے۔

نمونے کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

بوئے آدمزاد

بوئے آدمزاد آئی ہے کہاں سے ناگہاں ؟
دیو اس جنگل کے سناٹے میں ہیں
ہو گئے زنجیرِ پا خود ان کے قدموں کے نشاں !

یہ وہی جنگل ہے جس کے مرغزاروں میں سدا
چاندنی راتوں میں وہ بیخوف و غم رقصاں رہے
آج اسی جنگل میں ان کے پاؤں شل ہیں، ہاتھ سرد
ان کی آنکھیں نور سے محروم، پتھرائی ہوئی
ایک ہی جھونکے سے ان کا رنگ زرد
ایسے دیووں کے لیے بس ایک ہی جھونکا بہت
کون ہے بابِ نبرد ؟
ایک سایہ دیکھتا ہے چھپ کے ماہ وسال کی شاخوں سے آج
دیکھتا ہے بے صدا، ژولیدہ شاخوں سے انھیں
ہو گئے ہیں کیسے اس کی بُو سے ابتر حال دیو
بن گئے ہیں موم کی تمثال دیو

ہاں اتر آئیگا آدمزادان شاخوں سے رات
حوصلے دیووں کے مات!

گداگر

جن گذرگاہوں پہ دیکھا ہے نگاہوں نے لہو
یا سیہ عورت کی آنکھوں میں یہ سہم
کیا یہ اونچے شہر رہ جائینگے بس شہروں کا وہم
ہیں گداگر اور مرا دریوزہ فہم

راہ پیمائی عصا اور عافیت کوشی گدا کا لنگِ پا،
آرہی ہے ساحروں کی، شعبدہ سازوں کی صبح
تیز پا، گرداب آسا، ناچتی، بڑھتی ہوئی
اک نئے سدرہ کے نیچے، اک نئے انساں کی ہو
تابہ کے روکینگے ہم کو چارسُو!

کیا کہینگے اس نئے انساں سے ہم
ہم تھے کچھ انساں سے کم؟
زنگ پر کرتے تھے ہم بارانِ سنگ
تھی ہماری سازوگل، نغمہ و نکہت سے جنگ،
آدمی زادے کے سایے سے بھی تنگ؟

داشتہ

میں ترے خندۂ بیباک سے پہچان گیا
کہ تری رُوح کو کھاتا سا چلا جاتا ہے

کھوکھلا کرتا چلا جاتا ہے، کوئی الم زہرہ گداز؛
میں تو اس پہلی ملاقات میں یہ جان گیا

آج یہ دیکھ کے حیرت نہ ہوئی
کہ تری آنکھوں سے چپ چاپ برسنے لگے اشکوں کے سحاب
اس پہ حیرت تو نہیں تھی، لیکن
کسی ویرانے میں سمٹے ہوئے خوابیدہ پرندے کی طرح
ایک مبہم سا خیال
دفعتہً ذہن کے گوشے میں ہوا بال فشاں
کہ تجھے میری تمنّا تو نہیں ہو سکتی
آج لیکن مری باہوں کے سہارے کی تمنّا ہے ضرور
یہ ترے گریۂ نمناک سے میں جان گیا ——
تجھ سے وابستگیِ شوق بھی ہے
ہو چکی سینے میں بیدار وہ دلسوزی بھی
~~مجھ سے~~، ~~مجبورِ~~ ازل جس پہ ہیں مجبورِ ازل!
نفسِ خود بیں کی تسلّی کے لیے
وہ سہارا بھی تجھے دینے کو آمادہ ہوں
تجھے اندوہ کی دلدل سے جو آزاد کرے!
کوئی اندیشہ ہے تو یہی
ترے ان اشکوں میں اک لمحہ کی نومیدی کا پرتو ہو لیکن
اور جب وقت کی امواج کو ساحل مل جائے
یہ سہارا تری رسوائی کا اک اور بہانہ بن جائے
جس طرح شہر کا وہ سب سے بڑا مردِ لئیم

جسم کی مُزدِ شبانہ دے کر
بن کے رزّاق، تری تذلیل کیے جاتا ہے
میں بھی باہوں کا سہارا دے کر
تری آیندہ کی توہین کا مجرم بن جاؤں

سبا ویران

سلیماں سر بزانو اور سبا ویران
سبا ویراں، سبا آسیب کا مسکن
سبا آلام کا انبارِ بے پایاں
گیاہ و سبزہ گل سے جہاں خالی
ہوائیں تشنۂ باراں
طیور اس دشت کے منقار زیرِ پَر
تو سرمہ در گلو انساں
سلیماں سر بزانو، اور سبا ویراں

سلیماں سر بزانو، ترش رُو، غمگیں، پریشاں مُو
جہانگیری، جہانبانی، فقط طرّارۂ آہو
محبّت شعلۂ پرّاں، ہوس بوئے گلِ بے بُو
ز رازِ دہر کمتر جُو
سبا ویراں کہ اب تک اس زمیں پر ہیں
کسی عیّار کے غارتگروں کے نقشِ پا باقی
سبا باقی، نہ مہروے سبا باقی
سلیماں سر بزانو
اب کہاں سے قاصدِ فرخندہ پَے آئے
کہاں سے، کس سبو سے کاسۂ پیری میں مَے آئے

شورش کاشمیری، عبدالکریم (آغا)

ان کا خاندان کشمیری، ذات برہمن، گوت ڈار تھی۔ بزرگوں میں کوئی مشرف باسلام ہو گیا تھا۔ غالباً ان کے پردادا سرینگر سے مہاراجا گلاب سنگھ کے عہد میں نقل مکان کر کے امرتسر (پنجاب) میں آ بسے تھے۔ لیکن ان کے دادا (امیر بخش) کسی بات پر ان سے ناراض ہو کر لاہور چلے آئے، اور رایبکہ روڈ (انار کلی) پر ایک تنور لگا کر کشمیری باقرخانی اور قلچے بیچنے لگے۔ خوب کمایا اور خوب اڑایا۔

ان کے دو بیٹے تھے: ایک عبدالکریم کے والد نظام الدین (ف: ۱۳ اپریل ۱۹۵۶ء) اور دوسرے ان سے بڑے جن کا عین عنفوان شباب میں بعمر ۱۶-۱۷ سال تپ محرقہ سے انتقال ہو گیا۔ باپ کی توہم پرستی نے انھیں سجھایا کہ بیٹا اس لیے ہاتھ سے نکل گیا کہ ہر وقت لکھنے پڑھنے میں مشغول رہتا تھا۔ انھوں نے حفظ ما تقدم کے طور پر چھوٹے بیٹے کو اسکول سے اٹھا لیا کہ اس پر کوئی آنچ نہ آئے۔ اکلوتا بیٹا اور گھر میں فراغت، لاڈ چاؤ کی کمی نہیں تھی۔ لیکن جاہل رہ گیا کوئی ہنر بھی نہ سیکھا۔ جب تک باپ کا کاروبار عروج پر رہا، یہ بھی عیش کرتے رہے۔ لیکن باپ کے جو لچھن تھے، ان کے لیے تو قارون کا خزانہ بھی کفایت نہیں کر سکتا تھا۔ دوپہر ڈھلنے لگی، تو فکر ہوئی کہ بیٹا کیا کرے گا! ایک دوست کی وساطت سے ایک ٹین کے کارخانے میں ملازم ہو گئے۔ دو ایک سال میں یہاں چل نکلے، تو ریلوے ورکشاپ میں جگہ مل گئی۔ لیکن بعد کو پرانے کارخانے کے ہندو مالک کے اصرار پر واپس چلے

آئے، اور پھر کہیں اور نوکری نہیں کی۔

عبدالکریم ۱۴ اگست ۱۹۱۷ء کو لاہور میں پیدا ہوئے، تعلیم دیوسماج ہائی اسکول، انارکلی، لاہور میں پائی۔ ۱۹۲۷ء۔ ۱۹۲۸ء کا ہندستان سیاسی سرگرمیوں کے باعث شعلۂ جوالہ بنا ہوا تھا۔ سائمن کمیشن میں کسی ہندستانی کا شامل نہ کرنا پورے ملک نے اپنی توہین تصور کیا اور اس سے تحریک آزادی کی رفتار اور تیز ہوگئی۔ نوجوانوں پر اس کا خاص طور پر بہت گہرا اثر ہوا۔ شہر شہر خفیہ اور دہشت پسند جماعتیں قائم ہوگئیں۔

اسی زمانے میں عبدالکریم نے ایک ہندو دوست کے ساتھ مل کر "بال بھارت سبھا" قائم کی۔ عبدالکریم نے بہت کم عمری میں مولانا ظفر علی خان (ف: نومبر ۱۹۵۶ء) کے روزنامے "زمیندار" کا باقاعدہ مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ یہ اخبار گھر میں آتا تھا؛ ان کی دادی اماں اسے پڑھا کرتی تھیں۔ عبدالکریم نے یہ عادت انھیں سے لی۔ زمیندار کی زبان، ظفر علی خان کی خطابت اور صحافتی شاعری۔ ان سب باتوں کا نوجوان عبدالکریم کے کردار اور مستقبل کی تشکیل میں بڑا ہاتھ رہا۔

اب عبدالکریم باقاعدہ سیاسی تحریک میں شامل ہوگئے۔ انھوں نے سب سے پہلی تقریر جولائی ۱۹۳۵ء میں شہید گنج کے ہنگامے کے دنوں میں شاہی مسجد، لاہور میں کی۔ اس پر گرفتار کر لیے گئے، مقدمہ چلا، اور دو سال قید اور تین سو روپے جرمانے کی سزا ملی۔ لیکن اپیل میں جرمانہ معاف ہوگیا، اور یہ ایک ماہ کی حوالات اور تین ماہ کی قید کے بعد رہا ہوکر، گھر آگئے۔

لیکن اس کے بعد جیل جانا گویا آئے دن کی رسم بن گئی۔ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۹ء تک ہر سال چند مہینے جیل میں گزرتے؛ اور ستمبر ۱۹۳۹ء سے اواخر ۱۹۴۴ء تک مسلسل پانچ سال، اگرچہ سزا سات برس کی ہوئی تھی۔ حالات کی سنگینی کا کچھ اندازہ اس سے سمجھیے کہ ۱۹۴۴ء تک یعنی جب ان کی عمر صرف ۲۷ برس کی تھی، وہ اس کا ایک تہائی (یعنی ۹ برس) جیل میں بسر کر چکے تھے۔ فروری ۱۹۳۹ء میں وہ مجلس احرار میں شامل

ہو گئے۔

اب سوال یہ تھا کہ بسر اوقات کی کیا صورت ہو۔ ان کی صلاحیتوں اور افتادِ طبع کو دیکھتے ہوئے احباب نے سوچ بچار کے بعد طے کیا کہ ان کے لیے ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا جائے۔ ایک ہمدرد و مخیر دوست نے دو ہزار روپے کا عطیہ دیا جس سے "مکتبۂ احرار" کے نام سے ایک ادارہ وجود میں آیا۔ لیکن یہ نام ہی اسے لے ڈوبا۔ شہید گنج کے قضیے کے بعد مجلسِ احرار کی ساکھ عوام میں کوڑی بھر کی نہیں رہی تھی۔ اب بھلا ان کے نام پر قائم کردہ ادارہ کیونکر کامیاب ہو سکتا تھا! نتیجہ یہ ہوا کہ اگرچہ اس مکتبے کی طرف سے تین کتابیں شائع ہوئیں، لیکن نفع جو کچھ رہا ہو، عبدالکریم کو اس میں سے ایک پائی نہیں ملی۔ رفتہ رفتہ سارا سرمایہ بھی منتظمون کی سہل انگاری اور ناتجربہ کاری کے باعث ضائع ہو گیا۔

اب سب لوگ ان سے شادی کے لیے اصرار کرنے لگے۔ بالآخر ۲۷ مئی ۱۹۴۵ء کو ان کی انبالے میں شادی ہو گئی۔ دلھن (خورشیدہ) ان کے ماموں کی بیٹی تھیں۔ یہ انھیں لے کر لاہور واپس پہنچے، تو دعوتِ ولیمہ میں دوسرے احباب کے ساتھ مولانا ظفر علی خان بھی تھے۔ انھوں نے ارتجالاً تین شعر کا قطعہ کہا:

گجر دم لے کے قاصد یہ مسرت زا پیام آیا
کہ انبالے سے شورش ایک چھند ناسی دلھن لایا

مرے دل سے دعا نکلی کہ اس جوڑے کے سر پر ہو
نبیؐ کی رحمتوں کا اور خدا کے فضل کا سایا

مبارک ہو تمھیں شورش! یہ تیری خانہ آبادی
ترے گھر آ گئی اک اور نغمہ ریزوں کی فریادی

بعض وجود بہت بابرکت ہوتے ہیں، خاص طور پر بیوی۔ ذمے داری بڑھ جاتی ہے اور انسان میں کام کرنے کا نیا ولولہ اور نئی امنگ پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی صورت یہاں بھی پیش آئی۔ شادی کے بعد عبدالکریم نے انتہائی سنجیدگی اور فرض شناسی کے احساس سے مستقل

آمدنی کے وسائل پیدا کرنے پر توجہ کی، اور بفضلہٖ اس میں انھیں کامیابی ہوئی۔ انھوں نے مختلف ناشروں کے ہاں سے اُجرت پر کام لیا۔ ان کے مسودوں کی تصحیح، ترتیب، نظرِثانی کے علاوہ خود بھی کچھ لکھتے، اور اس طرح چار پانچ سو روپے ماہانہ یافت ہونے لگی۔ پھر مشہور کانگریسی لیڈر لالہ پنڈی داس (ف، جولائی ۱۹۶۹ء) کے داماد پربودھ چندر کے (جو کسی زمانے میں وزیر پنجاب بھی رہے) ساتھ مل کر ایک پبلشنگ ہاؤس قائم کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد (ف: فروری ۱۹۵۸ء) کی مشہور کتاب "غبارِ خاطر" کا دوسرا ایڈیشن (جس میں موسیقی سے متعلق ایک خط کا اضافہ تھا) اسی ادارہ نے شائع کیا تھا۔[1] اس ادارے کی طرف سے بعض اور کتابیں بھی شائع ہوئی تھیں، لیکن تقسیمِ ملک میں اس کا سارا اثاثہ برباد ہوگیا۔

آزادیِ ملک سے پہلے مجلسِ احرار کی طرف سے تھوڑی مدت کے لیے ایک روزنامہ "آزاد" نکلا تھا۔ اس کے شعبۂ ادارت میں کئی نام تھے، لیکن یہ امر واقع ہے کہ اس کا بیشتر کام شورش ہی کرتے تھے۔ لیکن یہ پرچہ دولتِ مستعجل ثابت ہوا۔ تقسیمِ ملک کے ساتھ ہی یہ بند ہوگیا۔ تقسیم کے ساتھ ہی انھوں نے مجلسِ احرار سے اپنا تعلق منقطع کر لیا اور اس کے بعد کسی سیاسی جماعت کے رکن نہیں بنے۔ اب انھوں نے صحافت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ ۱۹۴۷ء ہی میں انھوں نے اپنا ہفتہ "چٹان" جاری کیا، جو آج تک باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔

مسلسل قید کی زندگی نے ان کی صحت خراب کر دی تھی اور وہ اکثر بیمار رہنے لگے تھے۔ ۲۲ اکتوبر ۱۹۷۵ء کو تبخیر معدہ کا شدید دورہ پڑا، جس پر بغرضِ علاج میو اسپتال (لاہور) میں داخل ہو گئے۔ دو تین دن کی دوا دوش سے کچھ افاقہ ہو گیا، سب نے اطمینان کی سانس لی۔ لیکن جمعہ ۲۴ اکتوبر کی شب میں طبیعت ایک لخت پھر خراب ہو گئی اور نصف شب کے تھوڑی دیر بعد (ساڑھے بارہ بجے) یعنی ۲۵ اکتوبر ۱۹۷۵ء کے اوّل وقت حرکتِ قلب بند ہو جانے سے

---

[1] ضمناً یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ شورش نے اس ایڈیشن کے لیے مولانا آزاد کو دس ہزار روپے بطورِ حقِ تصنیف ادا کیے تھے۔

جان بحق ہو گئے۔ جنازہ بروز ہفتہ ۲۵ اکتوبر ہی کی شام میں اٹھا اور "میانی صاحب" کے (مشہور قبرستان) میں سپردِ خاک ہوئے۔ چار لڑکے اور سات لڑکیاں جسمانی یادگار چھوڑیں۔

رئیس امروہوی نے تاریخ کہی:

یادِ شورش میں ہے اشکوں کی تراوش، اے دل!
اور سینے میں غمِ ہجر سے سوزش، اے دل!
سوزشِ غم میں کہاں فکر کی کاوش، اے دل!
"حاصلِ شورشِ غم" ہے غمِ شورش، اے دل!

۱۹۷۵ء

ان کی تعلیم جیسا کہ کہہ چکا ہوں، نامکمل رہ گئی تھی۔ لیکن انھوں نے وسیع مطالعے سے یہ کمی پوری کرلی۔ خوش بختی سے انھیں اپنے عہد کے مشاہیرِ علم و ادب کی رفاقت اور صحبت کے مواقع ملے اور انھوں نے ان سے پوری طرح استفادہ کیا۔ ان پر مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خان، اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا خاص اثر رہا۔ مولانا آزاد سے نثر کا پرشکوہ انداز سیکھا؛ مولانا ظفر علی خان کے تتبع میں صحافتی شاعری اختیار کی؛ اور عطاء اللہ شاہ بخاری کی پیروی میں وہ شعلہ بیان خطیب بن گئے۔ مولانا آزاد کی معنوی شاگردی پر انھوں نے خود یوں فخر کا اظہار کیا ہے:

کسی ذلیل قلمکار سے تعلق کیا!
خدا کا شکر ہے، تلمیذِ بوالکلام ہوں میں

موضوعاتی ہنگامی شاعری میں ظفر علی خان کو جو یدِ طولیٰ حاصل تھا، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ شورش اس میدان میں ان کے قدم بقدم چلے اور اس میں ایسی حیرتناک کامیابی حاصل کی کہ خود مولانا ظفر علی خان کو یہ سند دینا پڑی:

شورش سے مرا رشتہ ہے، اور وہ ازلی ہے
میں وقت کا رستم ہوں، تو وہ ثانیِ سہراب

اسی باعث رشید احمد صدیقی نے کہا تھا: "شورش کاشمیری ابوالکلام کے طنطنۂ قلم اور ظفر علی خان کے ہمہمۂ انشا کا وارث ہے"۔
انھوں نے مختلف اوقات میں اپنے کلام پر مولانا ظفر علی خان، تاجور نجیب آبادی اور احسان دانش سے اصلاح لی۔ بلکہ احسان تو اپنی سوانحعمری میں لکھتے ہیں کہ پہلے یہ الفت تخلص کرتے تھے، شورش تخلص انھیں احسان ہی نے دیا تھا؛ نیز وہ آخر تک اپنا کلام انھیں دکھاتے رہے۔ وہ کبھی کبھی اسرار/اسرار بصری کے قلمی نام سے بھی لکھتے رہے۔ یہ نام انھوں نے ۱۹۴۴ء میں جیل سے رہائی اور گھر پر نظر بندی کے دوران میں اختیار کیا تھا کیونکہ ان کی نقل و حرکت اور تحریر و تقریر پر پابندی عائد تھی۔
نظم و نثر کا خاصا ذخیرہ ان کی زندگی میں شائع ہو گیا تھا۔ ان میں چار کتابیں: (۱) بوئے گل نالۂ دل، دود چراغِ محفل (۱۹۷۲ء) آزادیِ ملک سے پہلے کی سوانحعمری؛ (۲) پسِ دیوارِ زنداں (آزادی سے پہلے، جیل کی دس سالہ داستان)؛ (۳) موت سے واپسی (عہدِ ایوبی میں اسیری کے ۲۳۲ دن کی کہانی)؛ (۴) تمغۂ خدمت (ساہیوال جیل کے تین مہینے سترہ دن کے حالات) گویا خود نوشت سوانح کا حصہ ہیں؛ (۵) "شب جائے کہ من بودم" سفر نامۂ حجاز ہے۔
ان کے کلام کے تین مجموعے شائع ہوئے: (۱) گفتنی نا گفتنی؛ (۲) چہ قلندرانہ گفتم؛ (۳) الجہاد، الجہاد۔ انھوں نے بعض مشاہیرِ عہد کے تاثراتی خاکے بھی لکھے تھے:
(۱) حسین شہید سہروردی؛ (۲) حمید نظامی؛ (۳) میاں افتخار الدین؛ (۴) سید عطاء اللہ شاہ بخاری۔ چہرے: مختصر خاکے (کراچی، ۱۹۶۵ء)
ایک کتاب "اس بازار میں" بدنام قحبہ خانے کی کہانی ہے۔ "فیضانِ اقبال" میں علامہ اقبال کے "خطبات، مقالات، ارشادات اور خطوط" کا "افشردہ و عصارہ" (لزس) پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں اقبال کے خیالات کو دس مختلف عنوانوں کے تحت جمع کیا ہے۔ اور بھی کئی کتابیں ہیں۔
ان کا کلام بہت ملتا ہے۔ بطورِ نمونہ صرف ایک مختصر نظم پر اکتفا کرتا ہوں۔

شرالدّواب عنداللہ

زباں بگڑی، قلم بگڑا، روش بگڑی، چلن بگڑا
خود اپنے ہاتھ سے کافرگروں کا پیرہن بگڑا
چلا تکفیر کا جھگڑا کہ شرق و غرب کانپ اُٹھے
اُٹھی دشنام کی آندھی، مزاجِ اہرمن بگڑا
حیا مفقود، غیرت سرنگوں، خوفِ خدا غائب
کچھ اس انداز سے بدعت فروشوں کا چلن بگڑا
کروں طولِ سخن، تو بات حرفِ ناروا ہوگی
کلام مختصر یہ ہے کہ ہر لات و وثن بگڑا
میں اکثر سوچتا ہوں کس طرح سے ان کو سمجھاؤں
یہ جو کچھ کر رہے ہیں، اس سے نظمِ انجمن بگڑا
یہی وہ گفتگو ہے، ناز ہے جس کی بلاغت پر
یہی وہ تمہہ ہے، جس سے اسلوبِ سخن بگڑا
خدا کے نیک بندوں کو کہاں تک گالیاں دوگے؟
کروگے کیا، اگر اس پر خدائے ذوالمنن بگڑا؟

"لگے منہ بھی چڑانے، دیتے دیتے گالیاں صاحب!
زباں بگڑی تو بگڑی تھی، خبر لیجے دہن بگڑا"

ہزار لکھنوی، سیّد حسن

ان کے مورث نقوی سادات میں سے تھے۔ روایت ہے کہ ان کے بزرگ عہد شجاع الدولہ (۱۷۵۴ء-۱۷۸۵ء) میں ایران سے لکھنؤ آئے اور یہاں بلند مراتب پر فائز ہو گئے۔
سیّد حسن ہزار نے شاعری گویا ورثے میں پائی۔ ان کے والد سید جعفر حسین عرف محمد صاحب شعر کہتے اور بہار تخلص کرتے تھے؛ وہ لسان القوم سید علی نقی صفی لکھنوی (ف: جون ۱۹۵۰ء) کے شاگرد تھے۔ لالہ سری رام نے انھیں فصاحت کا شاگرد لکھا ہے، لیکن ہزار ایک تحریر میں انھیں صفی کا شاگرد کہتے ہیں۔ ممکن ہے، دونوں سے یکے بعد دیگرے مشورہ رہا ہو، یا شاید لالہ سری رام کو غلط اطلاع ملی ہو لکھنؤ کی انجمن معین الادب اپنی ادبی سرگرمیوں اور خدمات کے لیے کسی زمانے میں معروف تھی۔ اس کے سالانہ مشاعرے بڑے تزک و احتشام سے ہوا کرتے تھے جن میں باہر کے مشاہیر بھی شریک ہوتے۔ بہار تدتوں اس انجمن کے سکرٹری رہے۔ جب ان کا انتقال ہو گیا، تو ان کے احباب نے اثر لکھنوی کی تجویز پر اس انجمن کا نام بدل کر "انجمن بہارِ ادب" کر دیا۔
بہار نوخیز ان کے والد ہی تھے۔ ان کے علاوہ نتھے آغا صاحب زبر لکھنوی، حکیم منّے آغا صاحب آفتاب، سید محمد ہادی عزیز بھی اسی خاندان کے فرد تھے۔ گویا ان کے بچپن میں چاروں طرف

ماخذ: سیّد علی مہدی (ہزار کے بہنوئی)، سید نواب افسر لکھنوی اور کاظم علی خان صاحب (شیعہ کالج لکھنؤ)

شاعری کا چرچا تھا۔ گھر کی مستورات تک اس سے مستثنیٰ نہیں تھیں۔ ہزاد نے اسی ماحول میں پرورش پائی۔ بچپن ہی میں وہ اپنے والد بہار کے ساتھ مشاعروں میں جانے لگے تھے؛ وہاں اپنے والد ہی کے کہے ہوئے چند شعر پڑھ دیتے۔ ہزاد تخلص بھی والد کے تخلص بہار کی مناسبت سے اختیار کیا تھا۔ افسوس کہ بہار کا بہت جلد انتقال ہوگیا، اور یہ ان سے استفادہ نہ کر سکے۔ بالآخر جب باقاعدہ شاعری کرنے لگے تو مولانا عبدالباری آسی (ف: جنوری ۱۹۴۶ء) سے اصلاح کا رشتہ قائم کر لیا۔

ہزار کی ٹھیک تاریخ ولادت معلوم نہیں ہو سکی۔ والد کے بعد ان کے چچا ماسٹر مجتبیٰ حسین ان کے کفیل ہوئے۔ وہ انھیں اپنے ساتھ سیتاپور لے گئے اور وہاں ان کا گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخلہ ہوگیا؛ ۱۹۴۱ء میں دسویں کی سند لی۔ اس کے بعد تعلیم جاری نہ رکھ سکے اور نہ شاعری کی لگن نے انھیں کوئی اور کام کرنے کی فرصت دی۔ اگرچہ رسمی تعلیم کچھ زیادہ نہیں تھی، لیکن انھوں نے ذاتی مطالعے سے اس کی بہت حد تک تلافی کر لی تھی۔

وہ شروع میں لکھنؤ میونسپل بورڈ میں ملازم ہوئے لیکن یہاں غالباً زیادہ دن نہیں رہے۔ ۱۹۴۷ء کے لگ بھگ راجا رائے گڑھ نے انھیں اپنا درباری شاعر مقرر کر دیا۔ بعد کو وہ راجا صاحب موصوف کے ادبی سکریٹری بھی بن گئے۔ ایک موقع پر خوش ہو کر راجا صاحب نے انھیں تین تولے سونے کا میڈل اور "عندلیبِ سخن" خطاب عطا فرمایا تھا۔

انھیں تپِ دق کا پرانا عارضہ تھا۔ اس کے علاوہ خون کے کم دباؤ اور قلب کی تکلیف بھی تھی۔ بہت علاج ہوئے۔ یوپی حکومت نے بھی علاج کے لیے امداد دی اس سے حالت کچھ بہتر ہو گئی۔ ۳ نومبر ۱۹۷۵ء کو کسی کام سے کانپور گئے۔ وہیں شام کے وقت ایک ہوٹل میں دل کا شدید دورہ پڑا، اور آناً فاناً جاں بحق ہو گئے۔ اگلے دن (۴ نومبر ۱۹۷۵ء) کو کانپور ہی میں بساطیوں کے تکیے کے سامنے تکیہ چنو شاہ میں سپردِ خاک کر دیے گئے۔ کہاں عمر بسر کی، اور کہاں کی مٹی قسمت میں لکھی تھی۔ سچ ہے وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ۔

رہ ئے گڑھ کے قیام کے زمانے میں شادی کی تھی ؛ اس بیگم کے بطن سے ایک بیٹی (تسکین) ہوئی یہ ماشاء اللہ زندہ ہیں اور اپنے خاندان کے ساتھ لکھنؤ میں رہتی ہیں۔ ہزاد کی اس بیوی کا جلد ہی انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد انھوں نے نکاحِ ثانی نہیں کیا ؛ بقیۂ عمر تجرد میں گزار دی۔

انھوں نے غزل، سلام، قصیدہ، نظم۔ بہت کچھ لکھا۔ افسوس کہ کوئی مجموعۂ کلام ان کی زندگی میں شائع نہیں ہوا۔ تلاشِ بسیار کے باوجود ان کا کلام دستیاب نہیں ہوا۔ صرف ایک غزل ملی ؛ اسی کو جوں کا توں پیش کر رہا ہوں :-

جلوۂ حق آشنا، آئینۂ باطل نہیں
کوئی بھی سینہ مرے دل کا متحمل نہیں

صاحبانِ فکر جو چاہیں، کریں وہ فیصلہ
میں یہی کہتا رہوں گا : "میں کسی قابل نہیں"

میرے ماتھے کی لکیریں، ہیں جلالِ خسروی
ہیں فقیرِ بےنوا تو ہوں، مگر سائل نہیں

اب خدا ہی ناخدا بن جائے تو ہے اور بات
ورنہ میری حدِ امکاں میں کہیں ساحل نہیں

ظلم ڈھانے کے لیے بھی حوصلہ درکار ہے
تنگدل کے ذہنِ اعلیٰ کا کوئی قائل نہیں

ایک ہے اپنے لیے، وہ دھوپ ہو یا چھاؤں ہو
ہم مسافر ہیں، ہماری کوئی بھی منزل نہیں

مہربانی سے تری، بہتر تغافل تھا ترا
وہ بھی کوئی بات ہے، جس کا کوئی حاصل نہیں

اپنی عزت زعمِ شاہی کی حدوں سے دور ہے
شورشِ طوفاں، رہینِ عشرتِ ساحل نہیں

اے ہزاد! اس دور میں، گفتگو کی منزل دار ہے
یہ صدائے صور، آوازِ شکستِ دل نہیں

طالب دہلوی، شیش چندر سکسینہ

دلّی کے ایک متموّل کائستھ (سکسینہ) گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد رائے صاحب مہیش داس (آنریری مجسٹریٹ) کا انبالہ چھاؤنی میں شراب فروشی کا بڑا وسیع کاروبار تھا۔ کسی زمانے میں پورے پنجاب (قبل آزادی) میں مسکرات کا ٹھیکہ اسی خاندان کے پاس تھا۔ خاندان کے تموّل کا اندازہ کچھ اس سے کیجیے کہ دلّی میں دریائے جمنا کا پرانا پل طالب کے دادا رائے صاحب سالگ رام (ف: ۱۹۱۷ء) نے حکومت سے ٹھیکہ لے کر تعمیر کروایا تھا۔ ایک مرتبہ انھوں نے کالکاجی کے مندر (دلّی) کے پاس کائستھ برادری کا جلسہ کیا۔ اس میں آٹھ ہزار افراد نے شرکت کی تھی، سب لوگ رائے صاحب سالگ رام کے مہمان تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس جلسے پر ان کا ایک لاکھ روپیہ خرچ ہوا تھا۔

زمانہ بدلتے دیر نہیں لگتی۔ کچھ رائے صاحب مہیش داس کی تجارت کے جوڑ توڑ سے ناواقفیت اور بڑی حد تک اسامیوں کی بے ایمانی کے باعث کاروبار میں سخت نقصان ہوا۔ جن لوگوں سے لینا تھا، انھوں نے دینے سے انکار کر دیا؛ جنھیں لینا تھا، وہ تقاضا کرنے لگے۔ رائے صاحب نے کئی لوگوں کو اپنی ضمانت پر مختلف جگہ سے قرض دلوا رکھا تھا؛ قرضخواہوں نے یہ حالت دیکھی تو اپنے واجبات کا مطالبہ ان سے کر دیا، اور یہ بھی دینا پڑے۔ غرض دیکھتے دیکھتے لاکھ کا گھر راکھ ہو گیا۔ لیکن کسی چیز کو دوام نہیں۔ کسی نہ کسی طرح وہ وقت بھی نکل گیا اور خاندان پھر اپنے پانوؤں پر کھڑا ہو گیا۔

طالب کی پیدائش ۱۲ فروری ۱۹۱۰ء کو انبالہ چھاؤنی میں ہوئی تھی۔ ان سے ایک چھوٹے بھائی ایش چند ایم اے (ولادت: یکم مارچ ۱۹۱۵ء) ہیں، جنھوں نے صحافت کو بطور پیشہ اختیار کیا۔ ماشاء اللہ حیات ہیں۔

طالب کی ابتدائی تعلیم انبالہ چھاؤنی میں ہوئی اور انھوں نے ۱۹۲۵ء میں بنارسی داس ہائی اسکول، انبالہ چھاؤنی سے دسویں کی سند لی۔ اس کے بعد سان سٹیفنس کالج، دلّی میں داخلہ لے لیا۔ جہاں سے ۱۹۲۸ء میں دلّی یونیورسٹی سے انٹر کا امتحان پاس کیا۔ اسی دوران میں ۹ اپریل ۱۹۲۷ء کو ان کے والد رائے صاحب مہیش داس کا انتقال ہو گیا۔ انٹر کے بعد انھوں نے بی اے میں داخلہ لے لیا تھا، لیکن گھر کے تبدیل شدہ حالات کے پیش نظر وہ تعلیم جاری نہ رکھ سکے، اور یہ سلسلہ مجبوراً منقطع کرنا پڑا۔ رفتہ رفتہ جب حالات سدھر گئے اور پھر فرصت نصیب ہوئی، تو انھوں نے بی اے ۱۹۳۴ء میں ہندو کالج، دلی سے پاس کیا۔

ہاتھی لاکھ لٹے، پھر بھی سوا لاکھ کا۔ بہت اللّے تللّے نہ سہی تاہم خدا کے فضل و کرم سے گھر کی مالی حالت ایسی نہیں تھی کہ انھیں بسر اوقات کے لیے کسی نوکری کی ضرورت پیش آتی، لیکن بیکار کی زندگی بھی تو نہیں کٹتی! وہ ۱۹۲۷ء سے شعر کہنے لگے تھے، اور اس میں اپنے پھوپھا[۵] منشی مہاراج بہادر برق دہلوی (ف: فروری ۱۹۳۶ء) سے مشورہ رہا۔ برقؔ خود آغا شاعر قزلباش (ف: مارچ ۱۹۴۰ء) کے شاگرد تھے۔ اس طرح گویا طالب کا سلسلہ داغ کے واسطے سے خاندان ذوق سے جا ملا۔

شعر گوئی کے شوق نے طالب کو اکسایا کہ وہ صحافی بنیں گے۔ اس زمانے میں دیش بندھو گپتا (ف: نومبر ۱۹۵۱ء) کے اخبار "تیج" کا طوطی بولتا تھا۔ طالب صحافت کی تربیت حاصل کرنے کو اس کے دفتر پہنچے۔ کسی معاوضے یا تنخواہ کے بغیر چھ ماہ وہاں کام کیا۔ اس کے بعد حکومت ہند کے ماہنامہ "آجکل" (اردو)، امریکن رپورٹر، دستگیر (ماہانہ) اور بعض اور پرچوں سے تعلق رہا۔ کہیں طویل، کہیں مختصر، لیکن کسی جگہ مستقل تعلق قائم نہ کر سکے۔

ان کی وضعداری کا ایک قصہ سنیے:

۵۔ پھوپھا اس طرح کہ برق کی بیوی، طالب کے والد (رائے مہیش داس) کے سگے چچا کی صاحبزادی تھیں۔

منشی مہاراج بہادر برق کا انتقال بہت اچانک اور افسوسناک حالات میں ہوا تھا۔ ۱۲ فروری ۱۹۳۶ء کو وہ اپنے دوست شگن چند روشن پانی پتی کی صاحبزادی کی شادی کی تقریب میں شرکت کے لیے پانی پت گئے، دلّی کے کئی اور شعرا بھی گئے تھے۔ وہیں شب میں ان کی طبیعت خراب ہو گئی، اور اسی حالت میں حرکت قلب بند ہو جانے سے چٹ پٹ ہو گئے۔ طالب نے ۱۹۳۷ء میں ان کی برسی کے دن اپنے مکان پر ایک مشاعرے کا انتظام کیا۔ اس کے بعد ۱۹۴۷ء کو چھوڑ کر چونکہ اس سال فرقہ وارانہ فسادات کے باعث فضا بہت مکدر تھی) یہ سلسلہ بلاناغہ ۱۹۵۰ء تک جاری رہا۔ ۱۹۵۱ء میں شری جگر گیت سبھا نے پیشکش کی کہ آیندہ یہ مشاعرہ ان کی عمارت میں ہوا کرے۔ وہاں ۱۹۶۱ء میں پچیسواں (جوبلی) مشاعرہ ہوا؛ اور اسی کے ساتھ یہ سلسلہ بند کر دیا گیا۔

۱۹۳۲ء میں ان کی شادی گوالیار کے ایک معزز گھرانے میں ہوئی؛ چندر کماری بیوی کا نام تھا۔ اولاد میں خدا نے تین بیٹے اور ایک بیٹی عطا کی۔ تینوں بیٹے صغر سنی میں داغ مفارقت دے گئے۔ بیٹی (سنگیت) بحمدہٖ زندہ ہیں۔ ان کی شادی ڈاکٹر لشن مراری لال سکسینہ کے ساتھ ہوئی تھی؛ جو آج کل کینیڈا کے شہر ہیملٹن کے اسپتال میں ماہر امراض دماغی کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ میاں بیوی اپنے بچوں کے ساتھ وہیں مقیم ہیں۔

طالب صاحب اپنی بیٹی اور اس کے بچوں سے ملنے کے لیے وسط ۱۹۷۵ء میں کینیڈا گئے تھے۔ وہاں سے ستمبر میں واپس آئے۔ بظاہر صحت بالکل ٹھیک تھی۔ لیکن کسے معلوم تھا کہ موت اتنی قریب ہے۔ ۱۴ نومبر ۱۹۷۵ء صبح کے وقت فالج کا حملہ ہوا؛ ۱۵-۱۶ کی شب میں (ڈیڑھ بجے علی الصباح) اروِن اسپتال ہی میں جان بحق ہو گئے۔

طالب کو نظم و نثر دونوں سے یکساں مزاولت تھی۔ ترجمہ بھی اچھا کرتے تھے۔ ان کے ترجمہ شدہ افسانے مختلف رسالوں میں منتشر پڑے ہیں۔ ان کی یہ کتابیں چھپ چکی ہیں: (۱) رتن مالا: شعری انتخاب؛ (۲) حرف ناتمام: برق صاحب سے متعلق مضامین؛ (۳) یادگار برق: برق صاحب سے متعلق مضامین (۱۹۴۵ء)؛ ہمارے جین (دلّی ۱۹۴۵ء) (۵) انوار النظر؛

(۶) خدنگِ ناز؛ (۷) خمستانِ کیفی (دلّی ۱۹۵۱ء)؛ (۸) کشمیر کی سیر: سفرنامہ (دلّی ۱۹۶۶ء)
(۹) سبزۂ بیگانہ: غزلوں کا انتخاب (دلّی ۱۹۶۸ء)؛ (۱۰) یہ تھی دلّی: (۱۹۲۷ تا ۱۹۴۷ء
کی دلّی کی ادبی سرگرمیوں کی داستان (دلّی ۱۹۷۵ء)

کلام پختہ ہے، جس میں ابتذال کا شائبہ تک نہیں۔ مضمون آفرینی کی کوشش ہر صفحے سے عیاں ہے۔ کلام پختہ اور بے عیب ہے۔ کہیں کہیں زبان کی چاشنی بھی ملتی ہے۔ چند شعر بطور نمونہ درج ذیل ہیں:

بعنوانِ دگر، سب ایک ہی افسانہ کہتے ہیں	کسی کو غم کسی کا ہے، کسی کو غم کسی کا ہے
نگاہ دی ہے تو مجبورِ امتیاز نہ کر مجھے	مری خطا تھی نہ دیتے اگر نگاہ مجھے
اسی میں وسعتِ کون و مکان نکلے گی	وہ دل جو تنگ بظاہر ہے اس قدر، ہمدم!
جینے کا لطف حلقۂ دار و رسن میں ہے	اس قید کا مزا نہیں ہر ایک کو نصیب
زیرِ زمیں یگانہ و بیگانہ ایک ہے	یہ امتیاز، نادِ شما ہے بہ یک نفس
اسے کہیں بھی میسّر خوشی نہیں ہوتی	سکونِ دل نہیں جس کے نصیب میں طالب!
محبّت کا کوئی مذہب نہیں ہے	محبّت، ماورائے کفر و دیں ہے
محبّت، حسن سے بڑھ کر حسیں ہے	محبّت، حسن ہے، حسن آفریں ہے
جو اپنا ہے، وہی اپنا نہیں ہے	بھروسا کیا کرے کوئی کسی پر!
ہم زمانے کی بات کہتے ہیں	ہوئے جاتے ہیں آپ کیوں برہم!
تم سے جب دل کی بات کہتے ہیں	تم پہ اپنا گمان ہوتا ہے
جب موت نہیں، حیات کیا ہے!	زینت ہے بہار کی خزاں سے
حدِ نگاہ تک تو ہماری نظر گئی	محرومِ دید ہی رہی، یہ اور بات ہے
جسے احساس ہو تنہائی کا	اسے محفل میں بھی تنہا سمجھو
وقت آیا ہے پذیرائی کا	مانگ لو بڑھ کے کچھ ان سے، طالبؔ!

لگی ہوئی ہے یہاں تو دل سے، نظر میں ان کے یہ دل لگی ہو
یہ دل لگی ہے، تو باز آئے، جناب! ہم ایسی دل لگی سے

نہیں زور منصفی سے کہ دو یقیں کیسے کسی کو آئے
تمہارے وعدے کا ٹھیک ہی کیا، کبھی کسی سے کبھی کسی سے

رکھینگے کیا یاد رکھنے والے کہ آئے تھے بزمِ آب و گل میں
جو زندگی کے یہ چار دن بھی کٹے نہ طالب ہنسی خوشی سے

دکھ دینا آسان بہت ہے — دکھ سہنا آسان نہیں ہے
الفت خود عنوان ہے اپنا — اس کا کچھ عنوان نہیں ہے
اوروں کے جو کام نہ آئے — کام کا وہ انسان نہیں ہے

نہ مجھ سے ذکر کرے کوئی آشیانے کا — چمن پرست ہوں، مجھ سے چمن کی بات کرو

اب خوشی میں بھی بھر آتی ہیں ہماری آنکھیں
دفعتاً بے وقت کی برسات کہاں تھی پہلے!

مٹا ہوگا نہ کوئی اس طرح راہِ محبت میں — کہ وہ اپنا، نہ دل اپنا، نہ پہلو میں جگر اپنا
کرم سے، درد سے، اخلاق سے، مہر و مروت سے — مزاجیں بنائے تو دل دشمن میں گھر اپنا

پردے میں عنایت کے جو ہوتا ہے نمایاں — ناقابلِ برداشت ہے وہ جور و عتاب اور
در پردہ بھی دیکھا، تجھے بے پردہ بھی دیکھا — وہ شانِ حجاب اور تھی، یہ شانِ حجاب اور

یاد بھولے سے کرینگے نہ کبھی — اور، بھولے سے اگر یاد آیا!
یاد آتا تھا بہر حال جسے — شام بھولے، تو سحر یاد آیا

عجیب لطف ہے، کھانے ہیں اور بھی قسمیں — جب اعتبار کے قابل سخن نہیں رہتا
وہ ایک میں، جو ہر اقرار پر یقیں کرلوں — وہ ایک تم، جسے پاسِ سخن نہیں رہتا

عشرتِ ذات نہیں وصلِ دگر پر موقوف — ننگِ قطرہ ہے سمندر میں فنا ہو جانا
دل کی آواز کو کہتے ہیں، خدا کی آواز — ہو مبارک اسے دنیا کی صدا ہو جانا

نہ فرق آیا ازل سے زینتِ گلزار ہستی میں
بہار اس کی، بہارِ جاوداں معلوم ہوتی ہے

ابھی چشمِ قبول اس کی طرف مائل نہیں شاید
ابھی ہر سعی، سعیِ رائگاں معلوم ہوتی ہے

یہ خوش فہمی ہے اپنی، یا نگاہِ ناز کا جادو
"نہیں"، بھی اب تو ظالم تیری "ہاں" معلوم ہوتی ہے

تیری محفل میں پہنچنے کو تو ہم بھی پہنچے
کچھ اس انداز سے اپنوں نے نوازا ہے ہمیں

خیر جانوں کی نظر آئی، نہ ایمانوں کی
شفقتیں یاد بہت آئی ہیں بیگانوں کی

بہر عنوان ہو کر ہی رہیگا، وہ جو ہونا ہے
ترے اندیشۂ سود و زیاں سے کچھ نہیں ہوتا

کبھی راضی برضا ہو کے بھی دیکھو "طالب"!
ہر نفس، کوشش و تدبیر کہاں تک آخر!

مفلسی، ننگ نہیں، عیب نہیں، جرم نہیں
لیکن افلاس کا احساس بُرا ہوتا ہے

بات باریک ہے، مشکل سے سمجھ پاؤ گے
جس کو کہتے ہیں دعا، وہ بھی گلا ہوتا ہے

بے زبانی زباں ہو کے رہی
ہر نظر داستان ہو کے رہی

محوی صدیقی لکھنوی، محمد حسین

لکھنؤ کے ایک سربرآوردہ خاندان کے فرد تھے، جس میں دین اور دنیا دونوں کا اجتماع تھا۔
ان کے دادا مولانا محمد صادق علی جیّد عالم اور حافظِ قرآن بزرگ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ انھیں
"عملیات" میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا۔ ان کے فرزند حافظ علی حسین تھے۔ وہ بھی اپنی خاندانی
روایات کے وارث اور عربی فارسی کے عالم تھے۔ فارسی میں شعر کہتے تھے؛ نوز تخلص تھا۔ کسبِ معاش
کے لیے خطاطی اور خوشنویسی کا پیشہ اختیار کیا، اور اسی سلسلے میں اس زمانے کے مشہور
مطبع نولکشور میں تیس روپیا مشاہرہ پر ملازم ہو گئے۔ یہی زمانہ ہے، جب نواب صدیق
حسن خان مرحوم (ف: فروری ۱۸۹۰ء) نے بھوپال میں تصنیف و تالیف کا کام وسیع
پیمانے پر شروع کیا اور ریاست میں اس کے لیے ایک باقاعدہ دفتر کی تشکیل کی۔ انھوں نے
منشی نول کشور (ف: فروری ۱۸۹۵ء) کو لکھا کہ آپ کے یہاں نستعلیق و نسخ کا جو بہترین
کاتب ہو، اسے بھوپال بھیج دیجیے۔ اس پر منشی صاحب موصوف نے حافظ علی حسین صاحب
کو بھوپال جانے پر آمادہ کر لیا۔ یہ جب بھوپال پہنچے، تو نواب صاحب موصوف نے
ان کی بہت آؤ بھگت کی اور اپنے ہاں کی کتابت کا جملہ کام ان کی نگرانی میں دے دیا۔
پچاس روپیہ ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ نواب صاحب کی زندگی تک وہ یہ کام کرتے رہے
ان کا انتقال بھی بھوپال ہی میں ہوا۔ وہیں قبرستان "گنجِ شہیداں" میں مدفون ہیں۔
یہی حافظ علی حسین ہمارے محوی صدیقی کے والد بزرگوار تھے۔ محوی لکھنؤ میں ۱۵ مئی

۱۸۹۱ء (۶ شوال ۱۳۰۸ھ) کو پیدا ہوئے۔ تعلیم کا مرحلہ آیا، تو اس کا انتظام گھر پر ہوا۔ اس کے بعد فرنگی محل کے مدرسۂ نظامیہ میں داخلہ لیا۔ اور تکمیل اپنے والد کی نگرانی میں بھوپال میں کی؛ مدرسۂ احمدیہ سے عربی کی، اور مدرسۂ سلیمانیہ سے فارسی کی سند فضیلت پائی۔

تکمیلِ تعلیم کے بعد ۱۹۱۱ء میں لکھنؤ آئے اور یہاں ماہانہ "الناظر" سے وابستہ ہو گئے۔ یہاں ۱۹۱۶ء تک یعنی پانچ برس، اولاً اس کے انتظامی اور پھر ادارتی شعبے میں کام کرتے رہے۔ اسی زمانے میں ان کی مشاہیر عہد ــ عبدالحلیم شرر، فصاحت لکھنوی، علی محمد عارف لکھنوی، پیارے صاحب رشید، جالب دہلوی، وحیدالدین سلیم، چکبست لکھنوی اکبر الٰہ آبادی وغیرہ سے ملاقاتیں رہیں۔ اس سے انھیں اپنے دل و دماغ کی مخفی صلاحیتوں پر جلا کرنے اور انھیں بروئے کار لانے میں بڑی مدد ملی۔ ۱۹۱۴ء میں انجمن ترقی اردو کا ایک جلسہ لکھنؤ میں ہوا تھا۔ یہیں محوی کی ملاقات مولوی عبدالحق مرحوم (ف: اگست ۱۹۶۱ء) سے بھی ہوئی، جس سے بعد کو انھیں بہت فائدہ پہنچا۔

۱۹۱۶ء میں ان کے والد حافظ علی حیلی بہت بیمار ہو گئے۔ اس پر محوی صاحب لکھنؤ سے بھوپال چلے گئے، اور یہاں انھیں ریاست کے دفترِ تاریخ میں عربی مترجم کی جگہ مل گئی۔ ان کی کتاب "ازواج الانبیاء" (لکھنؤ ۱۹۱۶ء) اسی زمانے میں لکھی گئی تھی۔ دو سال بعد ۱۹۱۸ء میں وہ لکھنؤ واپس آ گئے۔ یہاں انھوں نے اپنا "دائرۂ ادبیہ" قائم کیا۔ "انسانی قربانیاں" کی تصنیف اور اشاعت اسی زمانے میں ہوئی۔ (لکھنؤ، ۱۹۱۹ء)

لکھنؤ میں کوئی سال بھر قیام رہا ہو گا کہ مولانا عبدالقادر آزاد سبحانی (ف: جون ۱۹۵۷ء) نے انھیں کانپور طلب کیا۔ آزاد سبحانی مرحوم کا نام ہماری تحریکِ آزادی اور تحریکِ خلافت میں بہت نمایاں ہے۔ انھیں فلسفے سے بہت شغف تھا، اسی لیے وہ اپنا نام "سبحانی ربانی" لکھا کرتے تھے۔ انھوں نے کانپور میں "مدرسۂ الٰہیات" قائم کیا تھا۔ محوی صاحب کو اسی مدرسے میں عربی پڑھانے کے لیے بلایا گیا تھا۔ محوی سال بھر کانپور میں رہ کر علی گڑھ چلے گئے، اور جامعۂ ملیہ کے شعبۂ تصنیف و تالیف میں کام کرتے رہے۔ اسی زمانے میں انھوں نے

"طبقات ناصری" اور "تاریخ فیروز شاہی" کا ترجمہ کیا۔
جیسا کہ بیان ہوا "الناظر" کی ملازمت کے زمانے میں ان کا مولوی عبدالحق مرحوم سے تعارف ہو گیا تھا چونکہ یہ روزگار کی طرف سے پریشان تھے، اور اپنی استعداد اور مستعدی کے باوجود انھیں کہیں جم کر بیٹھنے کی جگہ نہیں ملی تھی، انھوں نے مولوی عبدالحق سے رجوع کیا اور ہمدرد کی درخواست کی۔ موصوف نوجوان اور ہونہار ادیبوں کی حوصلہ افزائی پر ہمیشہ تیار رہتے تھے انھوں نے محوی کو اورنگ آباد بلا لیا جہاں وہ خود اس زمانے میں کالج کے پرنسپل اور انجمن ترقی اردو کے سکرٹری بھی تھے۔ سو روپیہ ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی تھی، لیکن جب یہ اورنگ آباد پہنچے تو مولوی صاحب نے از خود یہ بڑھا کر ایک سو پندرہ کر دی۔ یہ ۱۹۲۲ء کی بات ہے۔ اورنگ آباد میں ان کا قیام ۱۹۲۹ء تک رہا۔ اس زمانے میں وہ انجمن کی انگریزی/اردو ڈکشنری کی ترتیب میں بھی شریک رہے تھے۔
۱۹۳۰ء میں وہ مدراس چلے گئے۔ اولاً جمالیہ عربک کالج میں عربی کے استاد رہے، بعد کو مدراس یونیورسٹی میں مدرس (لیکچرر) مقرر ہو گئے۔ یہاں سے وہ ۱۹۵۲ء میں سبکدوش ہوئے۔ یہاں کی تصنیفی و تالیفی زندگی کا سب سے بار آور زمانہ ہے۔ یہاں انھوں نے دیوان میر محمدی بیدار دہلوی (۱۹۳۵ء) واقعات اظفری اور دیوان اظفری، اردو فارسی (۱۹۳۶ء) میر اسمٰعیل خان ابجدی کا انور نامہ (۱۹۴۲ء) اور کلیاتِ فارسی (۱۹۵۰ء-۱۹۵۴ء)؛ کلمات الشعرا سرخوش (۱۹۵۱ء) مرتب کیں؛ ان پر دیباچے اور حواشی لکھے؛ اور یہ سب کتابیں مدراس یونیورسٹی کے زیر اہتمام شائع ہوئیں۔
مدراس کا سلسلہ منقطع ہونے کے بعد انھوں نے بھوپال میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ پڑھنے لکھنے کا سلسلہ یہاں بھی جاری رہا۔ یہاں انھوں نے بچوں کے لیے کئی کہانیاں لکھیں، جو اسی زمانے میں شائع ہو گئی تھیں۔
انھیں شعر گوئی کا شوق ورثے میں ملا تھا۔ ان کا کلام ۱۹۰۷ء ہی سے موقت الشیوع رسائل میں شائع ہونے لگا تھا۔ لیکن ابھی تک انھوں نے کسی سے باقاعدہ اصلاح کا تعلق پیدا نہیں کیا تھا۔ ۱۹۱۰ء میں انھوں نے احمد علی شوق قدوائی (ف: اپریل ۱۹۲۵ء)

کی شاگردی اختیار کی اور استاد کی زندگی بھر ان سے مشورہ کرتے رہے۔ اب بھوپال میں مستقل قیام اختیار کرنے کے بعد انھوں نے اپنا کلام بھی جمع کرنا شروع کیا۔ نعتیہ کلام "نغمۂ فردوس" کے نام سے چھپا (بھوپال، ۱۹۶۸ء) اور رباعیات کا مجموعہ "آبشار" کے عنوان سے (لکھنؤ، ۱۹۷۱ء)۔ اس سے مدتوں پہلے ایک طویل نظم "شاعر کا دل" کے عنوان سے بھی چھپی تھی (مدراس، ۱۹۳۸ء)۔ لیکن افسوس کہ غزلیات کا دیوان نہیں چھپ سکا، حالانکہ ان کی بڑی تمنا تھی کہ یہ محفوظ ہو جائے۔ کسی زمانے میں ان کے شاگرد جوہر چاندوڑی نے ان کے سو شعروں کا ایک مختصر مجموعہ چھاپا تھا۔ (لکھنؤ، ۱۹۴۸ء) اب یہ بھی نایاب ہے۔ بہرحال، اگر پورا کلام نہیں، تو ان کا ایک نمایندہ انتخاب شائع ہو جانا چاہیے۔ انھوں نے اور بھی نظم و نثر کا بہت ذخیرہ چھوڑا ہے۔

ستمبر ۱۹۷۲ء سے علالت کا سلسلہ شروع ہوا۔ اسہال مزمن کی تکلیف تھی۔ ہر طرح کے علاج کیے لیکن کسی سے فائدہ نہیں ہوا۔ ۱۹۷۴ء تک بالکل زار و نزار ہو گئے؛ اٹھنا، بیٹھنا، چلنا پھرنا تک دوبھر ہو گیا۔ اسی میں بدھ کے دن ۱۹ نومبر ۱۹۷۵ء صبح آٹھ بجے کے بعد روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ اِنّا للہ وَ اِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔ بھوپال کے شاہی قبرستان "بڑے باغ" میں دفن ہوئے۔ سید حسن حامدی، حکیم عبدا دہلوی (جامعہ نگر، نئی دلی) نے تاریخ کہی، جس کے پہلے مصرع سے عیسوی اور دوسرے مصرع سے ہجری سال برآمد ہوتا ہے:

اٹھ گیا دنیا سے کیسا شاعرِ شیریں مقال (۱۹۷۵ء)

خادمِ اردو زباں مرحوم محوی لکھنوی (۱۳۹۵ھ)

محوی مرحوم نے اپنی زندگی میں چار نکاح کیے۔ پہلی بیوی لکھنؤ کی تھیں۔ شادی کے ایک سال بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ دوسری شادی بھی لکھنؤ میں ہوئی۔ ان کے ایک بچہ ہوا تھا، جس کے بعد وہ مسلسل بیمار رہنے لگیں۔ پہلے ان کی موت ہوئی اور پھر نومولود بھی چل بسا۔ تیسری بیوی بھوپال کی تھیں۔ ان سے دو لڑکے ہوئے: (۱) حامد جبین صدیقی، جو آج کل نیو کالج، مدراس میں صدرِ شعبۂ اردو فارسی ہیں۔ (۲) محمود جبین، روزنامۂ انقلاب، بمبئی

بمبئی کے دفتر میں ملازم ہیں۔ چوتھی بیگم بھی بھوپال ہی کی تھیں۔ ان سے تین صاحبزادے (سعید حسین، جمیل حسین، منیر حسین) اور ایک صاحبزادی (نورجہاں بیگم) ہیں۔ ماشاءاللہ سب اپنی اپنی جگہ خوش و خرم ہیں۔

ذیل میں چند شعر بطور نمونۂ کلام ملاحظہ ہوں، جو ان کے صاحبزادے منیر المحوی (منیر حسین) کے عنایت کردہ کلام سے انتخاب کیے گئے ہیں:

اللہ رے طلسمِ جمالِ سخن فریب
کچھ تجھ سے کہنے آئے تھے، یاد اب مگر نہیں

بچپن کیا ہے مجھے، افسانۂ شب نے
اظہار کا بھی شوق ہے، رسوائی کا ڈر بھی

نعمتِ شکرِ جفا، اہلِ نظر نے پائی
بوالہوس شکوۂ بیدادِ ستمگر میں رہے

مذاقِ عیشِ بھی پامال، ذوقِ غم بھی افسردہ
یہی کیا ہم شکستہ خاطروں کی زندگانی ہے!

نگاہِ شوق بھی ناکام، ذوقِ عشق بھی رسوا
مگر دل ہے کہ سرشارِ فریبِ شادمانی ہے

مصوّر کی نظر، شاعر کا دل، سجدے میں ہیں دونوں
جوانی بن کے وہ حسن و ادا کا شاہکار آئی

وہ پھیلی چاندنی، تارے وہ چھٹکے، چاند وہ نکلا
وہ صبحِ عید کے پیکر میں شامِ انتظار آئی

ہر گام پہ بتاتی ہے راہیں نئی نئی
اس عقلِ نکتہ رس سے بھی اکتا رہے ہیں ہم

یہ عدم کے جانے والے، ہیں تمہارے ہی تو شیدا
کوئی رہ گیا ہے پیچھے، کوئی لے گیا ہے بازی

گیا دل بھی، جوانی بھی، نشاط و کیف کے دن بھی
تمنا جس کو کہتے ہیں، وہ دیوانی نہیں جاتی

بس ہوں، اور سارے جہاں کے حادثات
امتحاں ہوتے ہیں مشتِ خاک کے

مدت کے بعد آج جو نظریں ہوئیں دوچار
وہ بھی کس اشتیاق سے دیکھا کیے مجھے

مدّت کے بعد، گھر کو جو آئے سفر سے ہم
اب یہ پتا چلا کہ وطن کیوں عزیز ہے

جو اپنے گھر کے لیے ہے، نہ تیرے در کے لیے
تو ہی بتا، دلِ دیوانہ پھر کہاں جائے!

دلوں سے یاس رخصت، درد رخصت، بےکلی رخصت
وہ جانِ حسن، جانِ آرزو، جانِ شباب آیا

آ کر قفس میں اور دل آزاد ہو گیا
ذکرِ چمن، نہ فکرِ نشیمن، خدا کی شان!

لبوں پر آہ، بالیں اشک سے تر، ہاتھ دل پر ہے
کسی کی یاد ہے، اور رات کا خاموش منظر ہے

سکوں کی شورشِ آبادِ جہاں میں آرزو کیسی!
ارے ناداں! یہ نعمت کنجِ تربت میں میسّر ہے

کچھ روز محبّت میں یہ کام بھی کر دیکھا
رونے سے بھی کچھ دل کی تسکین نہیں ہوتی

مرے عزمِ وفا کی لاج رکھ لی، سخت جانی نے
ہجومِ آرزو میں ورنہ جینا کوئی آساں تھا؟

ہنس رہے ہیں ہم زمانے کو دکھانے کے لیے
رو رہا ہے دل، مگر اللہ ری مجبوریاں

بسمل الٰہ آبادی، سکھ دیو پرشاد سنہا (منشی)

۱۱ نومبر ۱۸۹۹ء کو الٰہ آباد میں پیدا ہوئے۔ آبائی وطن سبوانی پور (ضلع رائے بریلی) ہے، جہاں سے ان کے جدّ امجد کسبِ معاش کے سلسلے میں الٰہ آباد آئے، اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ بسمل کے والد کا نام منشی بشیشور دیال سنہا تھا۔ خاندان کی سکونت الٰہ آباد کے مشہور محلے میر گنج میں رہی، جس میں نہرو خاندان بھی رہتا تھا؛ کایستھوں کی عربی فارسی سے رغبت اُن کے حصے میں بھی آئی۔ تعلیم ماڈرن ہائی اسکول اور کایستھ پاٹشالہ کالج، الٰہ آباد میں ہوئی۔ ابھی تعلیمی مراحل ہی میں تھے کہ شعر کہنے لگے۔

۱۹۱۸ء میں نوح ناروی (ف: اکتوبر ۱۹۶۲ء) کی شاگردی اختیار کر لی۔ لیکن بعد کو کسی بات پر ان سے قطع تعلق ہو گیا۔ چونکہ اب ان کی مشق کافی ترقی کر چکی تھی اور زبان و بیان پر اچھی قدرت حاصل ہو گئی تھی، لہٰذا اس حادثے سے انھیں کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا۔ الٰہ آباد اور نواح میں ان کے شاگردوں کا خاصا وسیع حلقہ تھا۔ پڑھتے بھی خوب تھے، ان کے ترنم میں سوز سے زیادہ نشاط کا عنصر نمایاں تھا۔ کلام کے دو مجموعے "جذباتِ بسمل" اور "افکارِ بسمل" کے عنوان سے چھپ چکے ہیں۔ اول پر دیباچہ سر عبدالقادر کے قلم سے ہے، اور دوسرے پر سر تیج بہادر سپرو کے قلم سے۔ لیکن اس پر بھی ایک زمانہ گزر گیا، ابھی بہت کلام غیر مطبوعہ ہوگا۔

ساری عمر الٰہ آباد کے میونسپل بورڈ میں ملازم رہے۔ وہاں سے سبکدوش ہوئے، تو اس کے بعد

کہیں اور ملازمت نہیں کی، اس کی ضرورت بھی نہیں تھی؛ بسرِاوقات کے لیے خدا کا دیا بہت کچھ تھا۔

صحت عموماً ہمیشہ اچھی رہی اور انھوں نے خاصی لمبی عمر پائی۔ چند دن کی معمولی علالت کے بعد ۲۳، ۲۴ نومبر ۱۹۷۵ء کی درمیانی شب (گویا ۲۴ نومبر کے ابتدائی اوقات) میں حرکت قلب بند ہو جانے سے جاں بحق ہوئے۔ موت سے ایک دن پہلے انھوں نے تازہ غزل کہی تھی، جس میں مصرع تھا:

بسمل آیا ہے اکیلا، بسمل جائیگا اکیلا

لیکن اسے غلط کر دکھایا ان کے ۳۸ سالہ بیٹے شیو شنکر لال نے۔ جب بسمل کی چِتا میں آگ لگائی جا رہی تھی، تو شیو شنکر لال صدمے کی تاب نہ لا سکے، اور فوراً ان کے قلب کی حرکت بند ہو گئی۔

بسمل کا شعری رشتہ نوح ناروی کے واسطے سے داغ دہلوی سے ملتا ہے۔ داغ اسکول نے زبان کو سلیس اور صاف ستھرا رکھنے میں جو خدمات انجام دی ہیں، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ اس میدان میں داغ کے شاگردوں میں نوح کو اور بھی امتیاز حاصل تھا۔ بسمل اپنے استاد کے رنگ میں اس حد تک رنگے ہوئے ہیں کہ بیشتر اوقات دونوں کے کلام میں امتیاز محال ہے۔ انھوں نے خود بھی خاندانِ داغ کا فرد ہونے پر اکثر فخر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

یہ کس کے منھ میں زباں ہے، جو کہہ سکے بسمل!
مری زبان نہیں، داغ کے گھرانے کی

ہمارا سلسلہ ہے خاندانِ داغ سے بسمل! تجھے ہو سیکھنا، وہ سیکھ لے اردو زباں ہم سے

چند شعر دیکھیے:

عشق میں ملتی ہے مرکر، اہلِ دل کو زندگی
لطفِ ہستی نیستی کے دور میں پاتا ہوں میں

وقتِ اخیر موت کے آثار دیکھ کر
احباب رو دیے رُخِ بیمار دیکھ کر

مٹ گئی شمع کی تنویر وہ سب رات کے ساتھ
خاک بھی اب نظر آتی نہیں پروانوں کی

ترے در سے، ترے کوچے سے، اٹھنا غیر ممکن ہے
دکھائیگی ہمیں جو گردش تقدیر، دیکھینگے

آپ کی محفل سے اُٹھنے کا نتیجہ یہ ہوا — تنگ آکر اُٹھ گئے دنیا کی بھی محفل سے ہم

نہ آئی نیند، نہ آئی قضا، نہ آئے آپ — تڑپ تڑپ کے شب انتظار دیکھ لیا

گلزار میں آیا موسم گل، اللہ رے جوانی پھولوں کی
اب پھول کے بلبل کہتی ہے، پھولوں سے کہانی پھولوں کی
گلشن میں نہ کیونکر دل بہلے، وہ سنتے ہیں، میں سناتا ہوں
پھولوں سے فسانہ بلبل کا، بلبل سے کہانی پھولوں کی
بلبل کے مقدر سے بیشک، تقدیر اسی کی اچھی ہے
چل پھر کے صبا ہی چومتی ہے، کیا کیا پیشانی پھولوں کی

ہر موج ہے اک پردۂ سازِ ہستی — کھلنے کو حبابوں سے ہے رازِ ہستی
کوشش نہ ابھرنے کی کرو، اے بسمل! — غرقاب فنا ہوگا، جہازِ ہستی

قاصر، برہم ناتھ دت (چودھری)

ایک قدیم موہیال برہمن خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کی ذات دت، اور گوت بھاردواج تھی۔ اور پیدا ہوئے ۱۴ ستمبر ۱۸۹۱ء[ـه] کو صبح پانچ بجے ویرم دتاں تحصیل شکر گڑھ، ضلع گورداسپور (حال پاکستان) میں یہ قصبہ بھی، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے انھیں کے بزرگوں کا بسایا ہوا ہے۔

ان کے والد چودھری گوردتاں دتامل دت تعلیم یافتہ بزرگ تھے۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق اُردو اور فارسی کا پاکیزہ ذوق رکھتے تھے، انگریزی میں بھی دسویں کے سند یافتہ تھے۔ لیکن انھوں نے گھر کی زمینداری کی دیکھ بھال کے علاوہ اور کوئی کام نہیں کیا۔ چودھری گوردتاں دتامل کے دادا (یعنی قاصر کے جدِ اعلیٰ) منشی ہیبتیں داس فارسی کے فاضل اور مہاراجا سوچیت سنگھ کے درباری اور مشیر تھے۔ بعد کو قاصر کے دادا منشی شنکر داس نے درباداری ترک کر دی اور اپنی جاداد کی نگرانی پر اکتفا کی۔ اس سے معلوم ہوگا کہ بفضلہٖ گھر میں علم و فضل بھی تھا اور دولت بھی۔

ـه قاصر نے خود اپنی تاریخ ولادت دو جگہ لکھی ہے: ۱۳ جولائی ۱۸۹۰ء (دل ڈال، پات پات ۱۹۷۱ء)؛ بھادوں ۱۹۴۸ بکرمی (ذکر و فکر: ۵) جنتری کی رو سے یہ تاریخیں ایک دوسرے کے مطابق نہیں ۱۳ جولائی ۱۸۹۰ء مطابق تھی ۱۲ اساڑھ ۱۹۴۷ بکرمی کے؛ اور ۱۱ بھادوں ۱۹۴۸ بکرمی کو ۱۴ ستمبر ۱۸۹۱ء تھی۔ ان کے صاحبزادے ڈاکٹر وشوا ناتھ دت کے نزدیک ۱۴ ستمبر ۱۸۹۱ء کی تاریخ مرجّح ہے کیونکہ بکرمی تاریخ انھوں نے دیگر بھی کئی جگہ لکھی ہے؛ غالباً عیسوی تاریخ کے تعین میں غلطی ہو گئی ہے

چودھری گوردان دتا مل بڑے مخیر اور ہمدرد قسم کے انسان تھے۔ افسوس کہ ان کا انجام بہت المناک حالات میں ہوا جب ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کا اعلان ہوا، اور فیصلہ ہوا کہ گوردا سپور کی تحصیل شکر گڑھ (ویرم دتاں سمیت) پاکستان کا حصہ بنیگی، تو اعزہ و اقارب کے مشورے اور اصرار کے باوجود انھوں نے ویرم دتاں سے ہجرت کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہاں سب میرے دوست ہیں، میں کسی کا مخالف، نہ میرا کوئی دشمن۔ مجھے یہاں کیا تکلیف ہے کہ میں اپنا جنم بھوم اور پرکھوں کا وطن ترک کر کے کسی اور جگہ جاؤں! یہاں تک کہ انھوں نے پاکستان سے اپنی دوستی اور اخلاص اور وفاداری کے اعلان کے طور پر اپنے مکان پر پاکستانی جھنڈا بھی لگا دیا۔ لیکن تقدیر کا نوشتہ پورا ہو کر رہا۔ چند دن بعد لوگوں نے ان کے گھر پر حملہ کر دیا، اور انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔

اب زمانے کی ستم ظریفی کا دوسرا پہلو دیکھیے۔ قاصر صاحب اس زمانے میں امرتسر میں مقیم تھے۔ قسمت کے کھیل، یہاں ان کا مکان جنونیوں نے اس لیے نذرِ آتش کر دیا کہ انھوں نے اپنے مسلمان دوستوں اور ان کے خاندان کے افراد کو یہاں پناہ دی تھی۔ دلاور حسین (پرنسپل ایم، اے او کالج، امرتسر) شیخ حسام الدین (احراری لیڈر) مولانا محمد حسین عرشی (مشہور شاعر اور عالم) وغیرہ انھیں پناہ گزینوں میں تھے۔ قاصر صاحب کا بیش قیمت کتابخانہ بھی اسی حادثے میں جل کر راکھ ہو گیا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ مجھے مکان کے جل جانے کا اتنا افسوس نہیں، جتنا ان قیمتی کتابوں کے تلف ہونے کا، جو مجھے جان سے زیادہ عزیز تھیں۔

میں ان کے والد کی وفات کے واقعے کو بیان کرتے ہوئے بہت دور نکل گیا۔

قاصر صاحب کے ماں باپ نے اپنے گورو کے مشورے سے ان کا نام برہم داس رکھا تھا، لیکن انھوں نے بعد کو اسے بدل کر برہم ناتھ کر لیا کہ بہر حال، داس (غلام) سے ناتھ (مالک، آقا) بہتر ہے۔ پڑھنے لکھنے کی منزل آئی، تو انھیں مقامی پرائمری مدرسے میں بٹھا دیا گیا۔ یہاں پانچویں درجے تک تعلیم کا انتظام تھا۔ مڈل کے درجوں کے لیے گوجرانوالہ جانا پڑا۔ اور دسویں کی سند دیال سنگھ ہائی اسکول، لاہور سے حاصل کی۔ اب انھوں نے دیانند اینگلو ویدک کالج لاہور میں داخلہ لے لیا۔ لیکن خدا معلوم کیا بجوگ پڑا کہ پڑھنے لکھنے

سے دل اچاٹ ہو گیا، بمشکل سال بھر یہاں رہے ہونگے۔ والد نے دیکھا کہ بیٹا پڑھنے کی گوں کا نہیں۔ تو اسے پولیس میں بھرتی کرا دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنے اثر و رسوخ سے اسے جلد ترقی دلوا کر تھانیدار بنوا دیں۔ لیکن یہ پیشہ صاحبزادے کی پسند کا نہیں تھا۔ چنانچہ جب وہاں سے حاضری کا پروانہ آیا، تو یہ حاضر نہ ہوئے۔ والد کو اس کی خبر ملی، تو سخت ناراض ہوئے؛ اور اپنی خفگی کا اظہار اس طرح کیا کہ کہا: اگر ہماری نہیں مانتے، تو جاؤ جہاں سینگ سمائیں، وہاں چلے جاؤ۔ والدہ، جب یہ ابھی دس بارہ برس کے تھے، جنت سدھار چکی تھیں۔ گھر میں اور کون تھا، جو والد کے اس جرنیلی حکم پر احتجاج کرتا۔ یا انھیں پناہ دے سکتا تھا! یہ بھی اپنی ہٹ کے پکے؛ پاپیادہ گھر سے نکل کھڑے ہوئے، اور کہاں کہاں کی خاک چھاننے کے بعد قلیل تنخواہ پر بٹالہ (ضلع گورداسپور) کے ایک تاجر کے ہاں نوکری کرلی پھر اسی کے ساتھ دلی چلے آئے اور یہاں ایک درآمد برآمد کا کام کرنے والی تجارتی فرم میں ملازم ہو گئے۔ کوئی سال بھر یعنی ۱۹۱۲ء تک یہاں رہے۔ اس کے بعد امرتسر چلے گئے اور وہاں ایک دوسری فرم (میسرز بیلی رام بہاری لال) کے ہاں ملازمت کرلی؛ ان کی بدیسی فرموں سے خط و کتابت ان کے ذمے تھی۔

مدتوں بعد انھوں نے یہ ملازمت ترک کر دی اور امرتسر ہی میں اپنا ذاتی کاروبار شروع کر دیا۔ وہ یہاں سے سوتی تاگا وساور کو برآمد کرتے تھے۔ تجربہ موجود ہی تھا اور محنت مشقت گھٹی میں پڑی تھی۔ اس پر زور قلم، اور سب سے بڑھ کر ایمانداری اور خلوص گویا کامیابی کے تمام اسباب موجود تھے۔ خدا نے برکت دی اور وہ کامیاب تاجر بن گئے۔ بدیسی منڈیوں میں ان کی بڑی ساکھ تھی اور وہاں کے تاجروں کو ان پر بھروسا تھا؛ ان کی تین تین مہینے کی ہنڈی صحیح ہو جاتی تھی۔ ان کا یہ کاروبار ۱۹۵۴ء تک بہت کامیابی کے ساتھ چلتا رہا۔ اس سال حکومت نے درآمد برآمد پر سخت پابندیاں عائد کر دیں۔ عمر کے ساتھ صحت بھی آہستہ آہستہ جواب دینے لگی تھی؛ اور وہ یکسوئی اور اطمینان سے کام کرنے کے لائق نہیں رہے تھے۔ لہٰذا انھوں نے یہ سلسلہ بند کر دینے میں عافیت دیکھی؛ اور اس کے بعد ہمہ تن علم و ادب کے لیے وقف ہو گئے۔

شعر گوئی انھوں نے ۱۹۰۷ء میں شروع کی، جب وہ ہنوز آٹھویں درجے کا طالب علم تھے؛ مگر پانچ چھ برس تک کسی سے مشورہ نہیں کیا۔ جب ۱۹۱۲ء میں امرتسر آئے، تو حکیم فیروز الدین فیروز طغرائی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔

حضرت فیروز طغرائی اس پایے کے صاحب علم و فضل بزرگ تھے، جن پر خطۂ پنجاب کو بجا طور پر ناز ہو سکتا ہے۔ افسوس، ان کی کما حقہٗ قدر نہیں ہوئی، جس کے لیے ان کی گوشہ نشینی اور استغنا بھی بہت حد تک ذمے دار ہیں۔ وہ ۱۸۸۲ء میں امرتسر کے ایک سربرآوردہ کشمیری گھرانے میں پیدا ہوئے۔ خاندان میں پشتوں سے تجارت کا سلسلہ چلا آ رہا تھا قیمت کی بات، کاروبار میں لاکھوں کا خسارہ ہوا۔ ان کے والد اس صدمے کی تاب نہ لا سکے، اور حرکت قلب بند ہو جانے سے آناً فاناً جان بحق ہو گئے۔ اس وقت فیروز الدین احمد کی عمر یہی ڈیڑھ دو برس کی تھی۔ بچی کھچی جائداد لواحقین نے خرد برد کر دی، اور فیروز الدین احمد گویا ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی قلاش ہو گئے۔ تلک الایام نداولھا بین الناس۔

جہاں دو وقت کی روٹی کے لالے پڑے ہوں، وہاں تعلیم کا کیا سوال! سن شعور کو پہنچے، تو بیوہ ماں نے یتیم بیٹے کو محلے کی مسجد کے مکتب میں بھیج دیا۔ وہاں قرآن اور عربی تو پڑھنا ہی تھی، لیکن اس سے کہیں زیادہ انھیں پڑوس میں رہنے والے ایک ایرانی بزرگ سے فیض پہنچا۔ ان سے رفتہ رفتہ فارسی میں وہ مہارت پیدا کر لی، جس نے انھیں بعد کو یگانۂ روزگار بنا دیا۔ دس برس کے تھے، جب قرآن اور دینیات کی بیشتر کتابیں ختم کر چکے تھے۔ لیکن کسب معاش کا مسئلہ اتنا اہم تھا کہ انھیں لازماً کوئی کام کرنے کی ضرورت تھی۔ اس پر انھوں نے رفوگری کا پیشہ اختیار کیا، جس سے اپنا اور ماں کا پیٹ پالنے بھر کی کمائی ہونے لگی۔ رفوگری محنت اور دیدہ ریزی کا ہمہ وقتی کام ہے؛ تاہم اس سے جو وقت بچتا، اس میں مختلف موضوعات کی فارسی اور عربی کی اونچی کتابوں کا مطالعہ بھی جاری رہا۔ لیکن وہ رفوگری سے عاجز آ گئے۔ آخر اسے چھوڑ کر چونگی میں محرر ہو گئے کہ اس میں فراغت اور تعلیم حاصل کرنے کے نسبتاً زیادہ امکانات تھے۔

چونکہ خدا نے دل و دماغ کی صلاحیتیں بدرجۂ وافر ودیعت کی تھیں، بہت جلد، کسی استاد کی مدد کے بغیر، ترقی کی منازل طے کر کے اُردو اور پنجابی میں شعر کہنے لگے۔ جس نے سُنا، اس نے داد دی، دل بڑھایا اور یوں ان کی شہرت پھیلنے لگی۔ اور تو اور مقامی ماہنامے "مسیحا" کے مدیر کی جگہ خالی ہوئی، تو اس پر ان کا تقرر ہو گیا۔ یہ وہ زمانہ ہے، جب کہن سال استاد مولانا احمد حسن شوکت میرٹھی (ف: دسمبر ۱۹۲۲ء) نے "مجدد السنۂ شرقیہ" کے بلند بانگ دعوے کے ساتھ اساتذہ کے کلام پر جرح و قدح کا طوفان بپا کر رکھا تھا۔ فیروز طغرائی نے "مسیحا" میں خود مولانا شوکت میرٹھی کے کلام کا جائزہ لینا شروع کیا؛ اور ستم یہ ہوا کہ اس کی خامیاں دکھا کر اصلاح بھی دے دی۔ شوکت سے کوئی جواب نہ بن پڑا، تو چپ سادھ لی۔ اس پر فیروز طغرائی نے ایک اور چٹکی لی اور اپنے پرچے میں اعلان کر دیا کہ چونکہ مولانا شوکت نے ہمارے اعتراضات پر خاموشی اختیار کر لی ہے، اس سے ہم یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہیں کہ انھوں نے "کل اعتراضات اور اصلاحوں کو تسلیم کر لیا ہے اور اس میں انھیں کوئی کلام نہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا، تو وہ ضرور مدلل تردید کر کے ہمیں قائل کرتے"۔ مولانا شوکت نے دیکھا کہ پانی سر سے گذر رہا ہے۔ لہٰذا وہ امرتسر پہنچے اور مقامی مشہور عالم مولوی ثناء اللہ امرتسری کو بیچ میں ڈال کر فیروز طغرائی سے مصالحت کر لی۔ یہ واقعہ ۱۹۰۴ء کا ہے، جب فیروز طغرائی بمشکل ۲۲ برس کے تھے۔

"مسیحا" بند ہو گیا، تو فیروز طغرائی نے اپنا ذاتی ماہنامہ "ایشیا"، جاری کیا۔ لیکن اس کے لیے جتنا سرمایہ درکار تھا، اس کا فراہم کرنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ کاروباری تجربہ بھی برائے نام تھا۔ اس لیے پرچہ جلد ہی بند ہو گیا۔ اس دور میں "وکیل" اخبار کا ملک بھر میں غلغلہ تھا۔ مولانا ابو الکلام آزاد (ف: فروری ۱۹۵۸ء) اس کے مدیر اور مولانا عبداللہ عمادی (ف: اگست ۱۹۴۷ء) مترجم تھے۔ فیروز طغرائی ان کے معاون مقرر ہو گئے۔ ان کا کلام نظم و نثر بھی وکیل میں چھپنے لگا۔ لیکن جب ۱۹۰۶ء میں مولانا آزاد وکیل سے الگ ہو گئے تو فیروز طغرائی نے بھی یہ تعلق منقطع کر لیا۔

شمس الاطبا حکیم غلام جیلانی لاہوری (ف: فروری ۱۹۲۶ء) کو اپنے تصنیفی کام کے لیے ایک معاون کی ضرورت تھی، جو عربی اور فارسی میں مہارتِ نامہ کا حامل ہو۔ انھوں نے سنا، تو فرد زطغرائی کو لاہور بلا لیا۔ یہ ساڑھے تین برس وہاں رہے۔ حکیم غلام جیلانی کے نام سے جو عربی کی کئی کتابوں کے تراجم شائع ہوئے ہیں، ان میں سے بعض فرد زطغرائی ہی کا کارنامہ ہے، بقیہ کچھ اور اصحاب کی کاوشِ طبع کا نتیجہ ہیں۔ حکیم غلام جیلانی ایک ماہنامہ "رفیق الاطبا" بھی شائع کرتے تھے۔ اس زمانے میں فرد زطغرائی کے کئی مضمون (مستقل اور تراجم) اس میں بھی چھپے تھے۔ حکیم غلام جیلانی کا تصنیفی پروگرام مکمل ہوگیا، تو فرد زطغرائی واپس امرتسر چلے آئے اور یہاں اپنا مطب کھول لیا۔ اس سے شہر کے اصحابِ علم و فن کو ضرور فائدہ پہنچا کہ بلا ناغہ آتے، ان کے پاس بیٹھتے اور استفادہ کرتے البتہ جہاں تک مطب کے ان کا ذریعۂ معاش بننے کا تعلق ہے، وہ مقصد پورا نہ ہوا۔ اب انھوں نے کوئی اور روزگار اختیار کرنے کی کوشش کی۔ بالآخر ٹھہری کہ فارسی وغیرہ پڑھانے پر محکمۂ تعلیم میں شامل ہو جائیں۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ انھوں نے کسی مدرسے میں باقاعدہ تعلیم نہیں پائی تھی، نہ کوئی سند ہی ان کے پاس تھی؛ اور محکمۂ تعلیم میں نوکری کے لیے یہ لابُدّ۔ لہذا اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ اس پر انھوں نے دوستوں کے کہنے سے پنجاب یونیورسٹی کا منشی فاضل کا امتحان پاس کر لیا۔ اس کے بعد آسانی سے اسلامیہ اسکول امرتسر میں فارسی کے مدرس مقرر ہو گئے۔ پھر اسی حیثیت سے جموں تبادلہ ہو گیا اور دو ڈھائی برس وہاں رہنے کے بعد واپس چلے آئے۔

اب کے امرتسر پہنچے، تو "وکیل" کے مدیرِ اعلیٰ مقرر ہو گئے۔ لیکن یہ اس اخبار کا گویا سنبھالا تھا۔ جلد ہی اس کے مالکوں میں باہمی اختلاف پیدا ہو گیا۔ جب معاملات کسی طرح نہ سلجھے، تو ان لوگوں نے پرچہ ہی بند کر دیا۔ فرد زطغرائی پھر بیروزگار ہو گئے۔ جلد بعد انجمن حمایت الاسلام، لاہور نے انھیں اپنے شعبۂ تالیف و تصنیف میں مصحح کی اسامی پیش کی، جو انھوں نے قبول کر لی۔ انجمن کے پاس جتنے مسوّدے آتے تھے، ان کی زبان کی تصحیح وغیرہ ان کے فرائض میں داخل تھی۔ لیکن اب انھیں لاہور کی آب و ہوا اس

نہیں آئی، مسلسل بیمار رہنے لگے۔ اس لیے مستعفی ہو کر امرتسر واپس آ گئے۔ اس کے تھوڑے ہی دن بعد ۸ فروری ۱۹۳۱ء کو اللہ کو پیارے ہو گئے۔ عمر پچاس کی بھی نہیں تھی۔ ان کے شاگردِ رشید حکیم محمد حسین عرشی نے تاریخ کہی،

تربتِ فیروز طغرائی کہ باد جلوہ افگن اندرو نورِ خدا

جستمش سالِ وفات از عارفے بے تأمل گفت: "مغفورِ خدا"

آمدم برسرِ مطلب: فاصرؔ صاحب بھی ۱۹۱۲ء میں ان کے تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ وہ استاد کے عاشق تھے۔ ان کی تحریروں میں جہاں کہیں ان کا نام آیا ہے، ان کے علم و فضل، قابلیت و صلاحیت، متانت و ثقاہت، شفقت و عظمت کے اعتراف اور تعریف میں ان کی زبان سوکھتی ہے۔

ان کی شادی ۱۹۰۵ء میں پنڈ دادن خان (ضلع جہلم) کے شری دھنپت رائے حقیرؔ کی صاحبزادی (دیران دیوی) سے ہوئی تھی۔ جناب دھنپت رائے بڑے متمول اور خاندانی آدمی تھے اور ان کی بہت وسیع جاداد تھی۔ وہ ریاست جھالاواڑ میں تحصیلدار کے عہدے پر فائز تھے لیکن مہاراجا کی کسی حرکت سے دل برداشتہ ہو کر استعفیٰ دے دیا اور وطن واپس چلے آئے۔

فاصرؔ صاحب کے دو بیٹیاں (شانتی اور شکلا) اور ایک بیٹا (وشوا ناتھ دتّا) ہوئے بیوی کا ۱۹۲۷ء میں انتقال ہو گیا، جب فاصرؔ صاحب کی عمر محض ۳۶ برس کی تھی۔ گھر میں خدا کا دیا سب کچھ تھا، صحت اور صورت شکل میں بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ سب نے دوسری شادی کا مشورہ دیا، بلکہ اصرار کیا۔ لیکن اس مردِ خدا نے سب کو جواب دے دیا۔ وشوا ناتھ اس وقت صرف سال بھر کے تھے (ولادت: ۲۰ مارچ ۱۹۲۶ء)۔ فاصرؔ صاحب نے کہا کہ میں ان بچوں کے لیے ماں اور باپ بن کر ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت کروں گا۔ مجھے کسی اور چیز کی ضرورت ہے نہ آرزو۔ اور یہ انھوں نے کر دکھایا۔ اس کے بعد وہ عمر بھر مجرّد رہے۔

تقسیمِ وطن کے بعد بیشتر زمانہ امرتسر ہی میں گزرا۔ وفات سے کوئی نو دس مہینے پہلے اپنے بیٹے وشوا ناتھ دتّا کے پاس کورو کشیتر میں رہنے لگے تھے۔ وشوا ناتھ صاحب گورنمنٹ کالج، لاہور میں ایم اے کے طالبعلم تھے کہ ملک تقسیم ہو گیا، اس پر انھوں نے مشرقی پنجاب یونیورسٹی

سے ایم اے کیا اور پھر ۱۹۵۰ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے دوبارہ تاریخ میں ایم اے کیا۔ اس کے بعد ولایت چلے گئے اور وہاں کیمبرج یونیورسٹی سے ایم لٹ کی سند حاصل کی۔ آج کل گورکھپور یونیورسٹی میں صدر شعبۂ تاریخ اور سوشل سائنس فیکلٹی کے ڈین ہیں۔

"قاصر صاحب کا ذیابیطس کا مرض پرانا تھا؛ دل کا عارضہ بھی تھا۔ زندگی کے آخری ۳۵ ۔۴۰ برس کم و بیش علالت ہی میں بسر ہوئے۔ یہی کیا کم تھا کہ کینسر ہو گیا۔ لیکن موت کا بہانہ عارضۂ دل ہوا۔ ۲۵ نومبر ۱۹۷۵ء کو حرکتِ قلب بند ہو جانے سے رہگرائے عالمِ جاودانی ہو گئے۔ انھوں نے موت کا جس خندہ پیشانی سے خیر مقدم کیا اور جیسے آخر تک خاندان کے مختلف افراد اور دوسرے حاضرین سے باتیں کرتے رہے۔ "وہ تبسم برلب اوست" کا حیرتناک نمونہ تھا۔ حقیقتاً ان کی موت سے ایک عظیم انسان ہم سے جدا ہو گیا۔ ایسا خوددار اور نڈر آدمی دیکھنے میں نہیں آیا۔ وہ سیاسی تحریک کے زمانے میں قید رہے تھے؛ جلیانوالہ باغ امرتسر کے المناک سانحے کے وقت وہاں موجود تھے اور اسی کے بعد ان کی گرفتاری عمل میں آئی۔ لیکن اس کے باوجود کہ بعد کے زمانے میں ان کے تمام سیاسی اکابر سے ذاتی تعلقات تھے، انھوں نے انعام یا معاوضہ طلب کرنا تو درکنار، کبھی اس کا ذکر تک نہیں کیا۔

وہ بےحد وسیع المطالعہ شخص تھے۔ چونکہ فارسی اور انگریزی میں دستگاہ کامل تھی، اس لیے مذاہبِ عالم اور فلسفہ اور تاریخ کا خاص طور پر مطالعہ کیا تھا۔ اسی سے ان کی اپنی زندگی بالکل قدیم فلاسفہ اور روحانی پیشواؤں کی سی ہو گئی تھی۔

متعدد کتابیں ان سے یادگار ہیں: (۱) ڈال ڈال، پات پات (مکتوبات، ۱۹۶۰ء)؛ (۲) پرچمِ ضیا (۱۹۶۱ء)؛ (۳) جواہر پارے (۱۹۶۲ء)؛ (۴) گرد باد (کلام اردو، ۱۹۶۳ء)؛ (۵) اہلِ سیف (۱۹۶۴ء)؛ (۶) ہومر (۱۹۶۵ء)؛ (۷) میرا بھائی (۱۹۶۶ء)؛ (۸) ذکر و فکر (کلام، ۱۹۶۷ء) شکرِ مکتوب الیہم، میں وہ خطوط جمع کیے تھے، جو ان کے احباب نے ان کے نام لکھے تھے۔ ان کی نثر ناقل و دل کا نمونہ ہے۔ سلاست اور ایجازِ بیان ان کے جوہرِ خاص تھے۔ چونکہ علم و ادب پر گہری نظر تھی اور حافظہ بہت قوی تھا، اس لیے اپنے نقطۂ نظر کے اثبات کے لیے تحریر میں تاریخی اور مذہبی تلمیحات کثرت سے استعمال

کرتے تھے۔ حکومت ہند نے ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں ۱۹۶۹ء میں "پدم شری" کا اعزاز عطا کیا تھا۔

اب ان کے چند شعر دیکھیے:

وہ قتلگاہ میں ہے خنجر آزما ناصر! — چلو کہ وقت ہے اب قسمت آزمائی کا

کسک کیسی ہے یہ دردِ نہاں کی — سنیں ہم بھی تو، ناصر! آپ کا راز

جینے کا لطف خاک ہے ہمدم! جہان میں — جینا ہے اپنے بس میں نہ موت اختیار میں

ہزار بار بنے ہم، ہزار بار مٹے — جہاں میں نقشِ کفِ پائے رہرواں کی طرح

حرم میں، دیر میں کیا اختلاف ہے ناصر! — یہاں بھی ان کے طلبگار ہیں وہاں کی طرح

بشر کو چاہیے آہستہ رو ہو، اے ناصر! — نہ ہو رکا بھی سرِ راہ دل دکھا کے چلے

بلبل کو دیکھتا ہوں کہیں، گر چمن سے دور — روتا ہوں زار زار کہ خود ہوں وطن سے دور

حسیں ہیں اور بھی دنیا میں لیکن — محبت ہو گئی ہے کچھ تمھیں سے

کسی کے گیسو و رخ کی یہ دھن ہے — غرض ہے کفر سے ہم کو، نہ دیں سے

بتاؤ، دل دیا ہے کس کو، ناصر! — نظر آتے ہو کچھ اندوہگیں سے

یہ سادگی بھی عجب سادگی ہے، اے ناصر! — کسی نے وعدہ کیا، تم نے اعتبار کیا

کیا کہوں خود کو مٹا دینے کے ناصر فائدے — دانۂ خرمن بن گیا، مٹی میں مل جانے کے بعد

شورشِ سر موسمِ گل پر نہیں ہے منحصر — جوشِ وحشت ہو رہا ہے بار بار اب کے برس

کیسے دن آئے ہیں، ناصر! گردشِ تقدیر سے — دل ہے کچھ حد سے زیادہ بیقرار اب کے برس

لے جا کے اس گلی میں، یہ دل نے کہا مجھے — پہنچا دیا یہاں تجھے، آگے ترا نصیب!

ساتھ ہی اس کے نکل آئے گا دل — میرے سینے سے نہ ظالم! تیر کھینچ

آخرِ شب، وقت ہے تاثیر کا — دل سے ناصر! نالۂ شبگیر کھینچ

ہوتی ہے ان کی ہاں میں، "نہیں" بھی ملی ہوئی — اقرار بھی وہ کرتے ہیں، انکار کی طرح

اپنے ہی پہلو میں دشمن ہو، تو کوئی کیا کرے!

دل ہمارا آشنا کا، نا آشنا کا ہو گیا

ہوائے باغ کی ہے، ہمصفیرو! کس کو آگاہی

یہاں کنجِ قفس ہی میں ہوئے ہیں بال و پر پیدا

حال پوچھو نہ زندگانی کا

ہے کرم مرگِ ناگہانی کا

آلامِ عشق، راحتِ پیہم سے کم نہیں
اے بوالہوس! یہ زخم بھی مرہم سے کم نہیں

منحصر دیکھا کرم کو جرم پر، تو حشر میں
بیگناہ بھی بول اٹھے، میں بھی گنہگاروں میں ہوں

مجھ سے سود و زیاں کے اس تجارت میں نہیں
میں دل و جاں سے محبت کے خریداروں میں ہوں

نہیں آتا کبھی نالہ لبوں تک
ہمارا ضبطِ غم ہے کیا فغاں سوز

نہ ترے دل میں جگہ ہے، نہ تری محفل میں
اب وہ اخلاص کہاں، دور کے نظارے میں

آنکھیں مری کھلی ہیں، اسیری میں ہمصفیر!
کنجِ قفس میں خاک کہوں ماجرائے دل

زندگی کا کوئی مقصد نہیں، قاصر! معلوم
خواب دلچسپ ہے، پر حاصلِ تعبیر نہیں

سر پھوڑنے کو سنگِ سرِ راہ کم نہیں
دیوانگی میں کیا ہے در و بام سے غرض

رسوائیاں کسی کی محبت میں ہیں، تو ہوں
مطلب ہے ننگ سے، نہ ہمیں نام سے غرض

قاصر! ہو ان پہ حالِ دلِ زار منکشف
اتنی ہی بس ہے شکوۂ ایام سے غرض

نارسا آہ، عدو چرخ، زمانہ دشمن
اپنی بگڑی ہوئی تقدیر بنائیں کیونکر!

کیا رسوا محبت میں مجھے فریاد و شیون نے

اگر تابِ تحمل ہو، تو دنیا راز داں کیوں ہو!

سراغ ان کا اگر پاؤں، تو ان سے اس قدر پوچھوں

نہاں ہو کر عیاں کیوں ہو، عیاں ہو کر نہاں کیوں ہو!

یہ جانتا ہوں کہ اچھی نہیں ہے بیتابی

ہو ضبط خاک، اگر دل کو تاب ہی نہ رہے

ابوالکلام آزاد

اک جہانِ علم و فضل، اک کائناتِ عقل و ہوش
عرشِ اعلیٰ سے زمیں کے نام پیغامِ سروش

ایک کوہِ استقامت، پیکرِ عزم و ثبات
ایک بحرِ بیکران رازہائے کائنات

ایک دل، دانندۂ اسرارِ خلوت گاہ ذات
اک نظر بینندۂ نظارۂ حسنِ صفات

تھے صفات اس کے فقط شرحِ فروغِ حسنِ ذات
ذات تھی اس کی فقط نظارۂ حسنِ صفات

اس کی شخصیت میں پنہاں ایک ملّت، اک جہاں
ایک برگِ گل میں رقصاں رنگ و بوئے گلستاں

وارثِ عہدِ قدیم و خالقِ عصرِ جدید
مصدرِ فکرِ سلیم و مخزنِ خُلقِ حمید

مرجعِ اہلِ سیاست، مرشدِ اصحابِ دیں
مطلعِ انوارِ عرفاں، مشرقِ مہرِ یقیں

رزم میں تیغ و سناں، اور بزم میں باغ و بہار
ایک رُخ آتش فشاں، اور دوسرا رُخ لالہ بار

صورتِ مسحور کن سے، یوسفِ مصرِ جمال
نطقِ دلکش سے، کلیمِ طورِ عرفان و کمال

زندگی افزا، حیات افروز، اس کا ہر سخن
بہرِ تخلیقِ مقاصد عزم اس کا حرفِ "کن"

اس کے ہر ہر لفظ میں صد رمزِ علم و آگہی
اس کی درویشی کے سر پر سرنگوں شاہنشہی

شرع و ملت کا امیں، فقہ و سیاست کا امام
وہ فصاحت کا، بلاغت کا، صحافت کا امام
جس نے دیکھا اور سمجھا طرز و طور ربو الکلام
اس پہ ثابت ہے کہ ہے یہ دور دور ربو الکلام

فرنہا باید کہ "تا ریک مردِ حُر گرد دعیاں
عبدہٗ در ملکِ مصر، آزاد در ہندوستاں

جس کے اک اک لفظ میں پنہاں تھی جانِ زندگی
بزم میں جس کا "تکلّم" تھا نشانِ زندگی
جس کا نطقِ سحر انگن سر بسر تسخیر تھا
جس کا ذکرِ عرش پیما دہر کی تفسیر تھا

ملک ہے محروم آج اُس عظمتِ کردار سے
تشنہ ہے ذوقِ ادب اُس ندرتِ افکار سے

سرزمینِ ہند دقفِ یاس بے اندازہ ہے
دفترِ علم و بصیرت آج بے شیرازہ ہے

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں
بر وفاتِ حضرتِ آزاد، امیرِ ملک و دیں

سیّد مسعود حسن رضوی ادیب، پروفیسر

جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے، مسعود صاحب نسباً سیّد تھے۔ ان کے مورثِ اعلیٰ خاندانِ مغلیہ کے زمانۂ زوال میں نیشاپور سے ہندستان آئے۔ یہاں ان کی مناسب آؤبھگت ہوئی اور وہ نسلاً بعد نسلٍ حکومت میں مختلف عہدوں پر متمکن رہے، جاگیریں بھی عطا ہوئیں، اور منصب بھی۔

مسعود حسن ۱۵ محرّم ۱۳۱۱ھ (مطابق ۲۹ جولائی ۱۸۹۳ء) کو بہرائچ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سیّد مرتضیٰ حسین صاحبِ علم بزرگ، اور پیشے کے لحاظ سے طبیب تھے۔ وہ دراصل نیوتنی (ضلع اناؤ) کے رہنے والے تھے، لیکن لکھنؤ میں تعلیم کی تکمیل کے بعد انھوں نے بہرائچ میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی۔ ان کے ملنے والے ان کی حذاقتِ فن اور استغنائے طبع کے معترف تھے۔ ان کا ۸ شوال ۱۳۲۹ھ (۲۸ دسمبر ۱۹۰۳ء) کو انتقال ہوا۔ انھوں نے اپنے پیچھے تین خردسال بچے چھوڑے: سیّد مسعود حسن؛ اور ان کے چھوٹے بھائی سیّد آفاق حسین رضوی (یہ پیشے کے لحاظ سے ہومیو پیتھک ڈاکٹر ہیں؛ ولادت: ۱۹۰۱ء)؛ اور ایک بہن سیّدہ بیگم، جو مسعود حسن صاحب سے صرف ڈھائی سال چھوٹی تھیں؛ یہ اپنے خاندان کے ساتھ ہجرت کرکے لاہور میں مقیم ہوگئی تھیں؛ وہیں انتقال ہوا۔

سیّد مسعود حسن صاحب نے خود لکھا ہے کہ چار برس، چار مہینے، چار دن کی عمر میں میری بسم اللہ ہوئی۔ ان کے والد انھیں بھی اپنی طرح "طبِ یونانی کا ماہر اور علومِ اسلامی کا عالم"

بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ ان کی تعلیم اسی نہج پر شروع ہوئی۔ لیکن والد کی بیوقت وفات نے اس کا رُخ بدل دیا۔ حالات بجیدہ ناساز گار تھے، اور گردستگیروں اور ہمدردوں سے دشمن اور بدخواہ زیادہ۔ ایسے میں بھی اس دُرِّ یتیم نے ہمت نہیں ہاری اور مالی مشکلات اور مناسب مشورے کے فقدان کے باوجود اپنا تعلیمی دَور نہایت شاندار طریقے پر بسر کیا۔ ابتدائی تعلیم نجی طور پر بہرائچ میں ہوئی۔ یہاں زیادہ تر اُردو سے مزاولت رہی۔ اس کے بعد لکھنؤ آئے اور حسین آباد ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا، چھٹے درجے میں لیے گئے۔ بہرحال اس کے بعد تعلیمی زمانہ بہت کامیاب رہا۔ اسکول کے زمانے میں ہر درجے میں اوّل آئے اور ہر مضمون میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرتے رہے۔ بالآخر ۱۹۱۷ء کیننگ کالج، لکھنؤ سے بی، اے کی سند لی۔ اگلے برس (۱۹۱۸ء) ایم اے میں داخلہ لے لیا تھا، لیکن تندرستی خراب ہوجانے کے باعث امتحان میں شامل نہ ہوسکے۔

اسی زمانے میں صوبۂ متحدہ شمال و غرب (حال اتر پردیش) میں ایک نئی اسامی نکلی۔ کام یہ تھا کہ صوبے میں جو کتاب چھپے اس کے ضروری کوائف سرکاری گزٹ میں شائع ہوں۔ اپریل ۱۹۱۸ء میں سیّد مسعود حسن کا اس اسامی پر تقرر ہوگیا۔ وہ یہاں ساڑھے تین سال رہے۔ انھوں نے خود کسی جگہ لکھا ہے کہ میں نے اس دوران میں مختلف علوم کی چھوٹی بڑی تقریباً دس ہزار کتابیں مطالعہ کیں۔ ظاہر ہے کہ ان میں ہر طرح کی ضخامت کی کتابیں ہونگی۔ کچھ بھی ہو، روزانہ اوسطاً آٹھ کتابوں کے مجموعی صفحات ۲۵۰۰ سے کم کیا ہونگے! اور یہ مطالعہ مسلسل تین برس تک جاری رہا۔ صرف یہی نہیں وہ ان مطبوعات کی فہرست بناتے، ہر ایک کا خلاصہ تیار کرتے، اور اس پر تبصرہ لکھتے۔ یہ کوائف یو پی کے سرکاری گزٹ میں ہر تیسرے مہینے چھپتے تھے۔ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس متنوع مطالعے کا ان کے دل و دماغ کی تشکیل اور علم و عرفان کی تکمیل پر کیا اثر ہوا ہوگا! یہ حقیقت ہے کہ بعد کی زندگی میں ان کی محنت کی عادت اور تصنیفی فتوحات کی بنیاد اسی زمانے میں پڑی۔

٭ کاش! کوئی اللہ کا بندہ ان مضامین کا کھوج لگا کر انھیں جمع کر دیتا۔

۱۹۲۲ء میں انھوں نے الہ آباد یونیورسٹی سے "ایل ٹی" (یعنی پڑھانے کی سند) حاصل کی اور اس کے بعد گورنمنٹ ہائی اسکول، فتح گڑھ میں مدرس مقرر ہو گئے۔ لیکن اس کے چھ سات ہفتے بعد ہی انھیں لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو کے جونیر لیکچرر کے عہدے کی پیشکش ہوئی۔ حال آنکہ اس نئے عہدے کی تنخواہ اور مستقبل کی توقعات فتح گڑھ کی مدرسی سے کہیں کم تھیں، انھوں نے فتح گڑھ کو خیرباد کہا؛ اور اپنے وطن ثانی لکھنؤ چلے آئے، جہاں اردو کی خدمت کے مواقع زیادہ تھے۔ یہیں سے انھوں نے اثنائے ملازمت میں ایم، اے (فارسی) کی سند درجۂ اول میں حاصل کی (۱۹۲۴ء) اس نمایاں کامیابی پر انھیں یونیورسٹی کی طرف سے طلائی تمغہ بھی عطا ہوا تھا۔

وہ درجہ بدرجہ اردو کے سینیر لیکچرر (۱۹۲۷ء)، فارسی ریڈر (۱۹۳۰ء) اور صدر شعبۂ اردو و فارسی (۱۹۳۰ء) مقرر ہوئے۔ آخرکار طویل انتظار کے بعد ۱۹۵۳ء میں پروفیسر مقرر ہوئے؛ اور ۳۲ سالہ کامیاب ملازمت کے بعد یہیں سے جون ۱۹۵۴ء میں سبکدوش ہوئے۔ ان کے زمانۂ تدریس میں لکھنؤ یونیورسٹی میں علم و تحقیق کی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ سچ ہے شمع لاکھ اندھیرے میں کیوں نہ رکھ دی جائے، اس کا اردگرد منوّر ہو جاتے ہیں۔ ان کی بدولت یونیورسٹی کتابخانے کے مشرقی شعبے میں بھی بہت ترقی اور توسیع ہوئی۔

وہ ابھی تعلیم کے ابتدائی مراحل بھی طے نہیں کر سکے تھے کہ ۱۹۱۰ء میں انھیں دردِ سر کا موذی عارضہ لاحق ہو گیا اور اس کے بعد وہ سات آٹھ برس تک مسلسل اس کا شکار رہے۔ بدقسمتی سے بعد کے زمانے میں اس پر تبخیر کی شکایت مستزاد ہو گئی۔ قوام شروع سے کچھ کمزور تھا، ان عوارض نے اور بھی نڈھال کر دیا۔ کوئی اور ہوتا، تو ہتھیار ڈال دیتا۔ لیکن آفریں ہے ان کی ہمت پر کہ انھوں نے نہ تعلیم سے ہاتھ اٹھایا، نہ کبھی محنت سے جی چرایا۔ خدا نے بھی مدد کی اور وہ ان تمام مشکلات کے باوجود ترقی کے منازل طے کرتے چلے گئے۔ اردو سے انھیں دلچسپی ہی نہیں، عشق تھا۔ ان کی دوسری دلچسپی فارسی سے تھی۔ اسی شوق کی تسکین کے لیے انھوں نے ۱۹۳۳ء میں فارسی کے گہوارے اور ہندستان کی تاریخ و تمدن کے منبع ایران کی سیاحت کی۔ واپسی پر عراق گئے اور وہاں مقاماتِ مقدسہ

کی زیارت کرتے ہوئے وطن واپس آئے۔ یہ سفر خالص علمی ذوق و شوق کا نتیجہ تھا، اور مولانا محمد حسین آزاد کے سفر ایران کے بعد اپنی نوعیت کا غالباً دوسرا سفر تھا۔

مسعود صاحب ۵۵ برس تصنیف و تالیف میں مصروف رہے۔ ان کی سب سے پہلی کتاب ۱۹۲۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ ذیل میں ان کی نصف صدی کی مطبوعہ کتابوں کی فہرست ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ امتحانِ وفا (۱۹۲۰ء) انگلستان کے ملک الشعرا ٹینی سن کی طویل نظم اینک آرڈن کا نثری ترجمہ، دیباچے اور حواشی کے ساتھ۔

۲۔ دبستانِ اُردو (۱۹۲۵ء) بچوں کے لیے نظم و نثر کے اسباق۔

۳۔ ہماری شاعری (۱۹۲۷ء) اس میں اُردو شاعری پر جو اعتراض کیے جاتے ہیں ان کا مدلل جواب دیا ہے۔ اسے حالی کے "مقدمہ شعر و شاعری" کا تتمہ خیال کرنا چاہیے۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی۔ ۱۹۷۱ء تک اس کے گیارہ ایڈیشن خود مصنف نے شائع کیے۔ ان کے علاوہ چور ناشروں نے اسے تین مرتبہ ان کی اجازت کے بغیر چھاپ لیا۔

۴۔ فرہنگِ امثال (۱۹۲۸ء) اس میں فارسی عربی کے تقریباً ۱۲۵۰ امثال کا ترجمہ اور محلِ استعمال بتایا ہے۔ اس کے مزید دو ایڈیشن ۱۹۳۸ء اور ۱۹۵۸ء میں چھپے۔

۵۔ مجالسِ رنگین (۱۹۲۹ء) سعادت یار خان رنگین کی قابلِ قدر کتاب مقدمے اور اشاریے اور رجال و بلاد کی وضاحت کے ساتھ۔

۶۔ فیضِ میر (۱۹۲۹ء) میر نے یہ کتاب فارسی میں لکھی تھی۔ رضوی صاحب نے فارسی متن پر تلخیص اردو ترجمے اور حواشی و فرہنگ کا اضافہ کیا۔ یہ دوسری مرتبہ ۱۹۶۴ء میں چھپی۔

۷۔ نظامِ اردو (۱۹۳۱ء) آرزو لکھنوی کی کتاب ہے اس میں تفریق کلمات اور اسرار قافیہ کے وصول وغیرہ سے بحث ہے۔ مسعود صاحب نے اس پر مفصل تشریحی حواشی کا

اضافہ کیا ہے۔

۸۔ روحِ انیس (۱۹۳۱ء) اس میں انیس کے سات مرثیوں کا انتخاب، کچھ سلام اور رباعیاں، فرہنگ اور حواشی کے ساتھ شامل ہے۔ یہ کتاب مزید چار مرتب (۱۹۵۰، ۱۹۶۴، ۱۹۶۸ء، ۱۹۷۲ء) میں شائع ہوئی۔

۹۔ جواہرِ سخن (۲) (۱۹۵۳) ہندستانی اکاڈمی، الہ آباد نے اردو شاعری کا انتخاب چار جلدوں میں شائع کیا تھا؛ اس کی دوسری جلد محمد مبین جریاکوٹی نے مرتب کی تھی، مسعود صاحب نے اس کی تصحیح کی تھی۔ یہ جلد عہد میر کے شعرا کے انتخاب پر مشتمل ہے۔ شروع میں ہر ایک شاعر کے مختصر حالات بھی دیے گئے ہیں، جس سے اس کی شکل تذکرے کی ہوگئی ہے۔

۱۰۔ شاہکارِ انیس (۱۹۴۴ء) میں انیس کا مشہور مرثیہ "جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے" صحتِ متن اور فرہنگ کے ساتھ چھاپا گیا ہے۔ اس کی کتابت لکھنؤ کے مشہور خطاط مرزا جواد مرحوم نے کی تھی اور اس کے ساتھ کچھ تصویریں بھی تھیں۔ یہ نظامی پریس لکھنؤ سے پوری آب و تاب کے ساتھ چھپا تھا۔ اس کی قیمت ۲ روپے فی نسخہ تھی۔ مذہبی حلقوں نے ان تصویروں کی سخت مخالفت کی تھی جس پر بعد کو انھیں نکال دینا پڑا۔

۱۱۔ فائز دہلوی اور دیوانِ فائز (۱۹۴۶ء) اس کی اشاعت کے بعد جلد ہی ملک تقسیم ہو گیا اور اسی کے ساتھ کتاب کے بیشتر نسخے بھی ضائع ہو گئے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا۔ مسعود مرحوم نے جس محنت سے متن کی تصحیح کی ہے اور فائز کے حالات جمع کیے ہیں، اس کی تمام دیدہ ور نقادوں نے داد دی ہے۔

۱۲۔ متفرقاتِ غالب (۱۹۴۷ء) مسعود صاحب کے پاس ایک بیاض تھی جس میں غالب کے ۴۹ فارسی خطوط اور کچھ متفرق اردو فارسی منظوم کلام شامل تھا۔ اس کو انھوں نے ایک مبسوط مقدمے اور ضروری حواشی کے ساتھ شائع کیا تھا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن غالب صد سالہ برسی کے موقع پر ۱۹۶۹ء میں چھپا۔

۱۳۔ اردو زبان اور اس کا رسم خط (۱۹۴۸ء) یہ بھی دوسری مرتبہ ۱۹۶۱ء میں چھپی۔

۱۱۔ آب حیات کا تنقیدی مطالعہ (۱۹۵۴ء) مرحوم کا مولانا محمد حسین آزاد کی انشاء اور تحقیق، دونوں پر ایمان تھا۔ اس مختصر کتاب میں انھوں نے ان اعتراضوں کا جواب دینے کی کوشش کی ہے، جو آب حیات پر کیے گئے ہیں۔ حذف و اضافہ کے بعد یہ کتاب دوسری مرتبہ ۱۹۶۴ء میں چھپی تھی۔

۱۵۔ روزنامہ انیس (۱۹۵۷ء) انیس کے متعدد مرثیوں کا انتخاب ایک لڑی میں پرو کر مسلسل داستان واقعات کربلا مرتب کی ہے۔ کہیں کہیں ربط قائم کرنے کی خاطر اپنی طرف سے کوئی شعر یا مصرع بھی اضافہ کیا ہے، جس کا اعتراف دیباچہ کتاب میں موجود ہے، لیکن افسوس کہ متن کتاب میں کسی جگہ حاشیے میں نشاندہی نہیں ملتی کہ یہ اضافہ کہاں ہے تاکہ قاری کو التباس نہ ہو کہ کونسا کلام انیس کا ہے اور کونسا مرتب کی طرف سے اضافہ۔ اس کتاب پر اتر پردیش حکومت نے ایک ہزار کا انعام عطا کیا تھا۔

۱۶۔ تذکرۂ نادر (۱۹۵۷ء) از مرزا کلب حسین نادر۔ اس میں ۵۲۵ شعرا کے حالات ہیں۔

۱۷۔ فسانۂ عبرت (۱۹۵۷ء) فسانۂ عجائب کے مصنف رجب علی بیگ سرور کی یہ نسبتاً کم مشہور کتاب ہے۔ اسی کو حسب معمول عمدگی سے مرتب کر کے شائع کیا تھا۔

۱۸۔ لکھنؤ کا شاہی اسٹیج (۱۹۵۷ء) اس کتاب پر یوپی حکومت کی طرف سے ایک ہزار روپیہ کا انعام ملا تھا۔

۱۹۔ لکھنؤ کا عوامی اسٹیج (۱۹۵۸ء) اس پر بھی اتر پردیش حکومت نے ایک ہزار انعام دیا تھا۔

۲۰۔ اردو ڈراما اور اسٹیج (۱۹۵۹ء) یہ دراصل (۱۸) اور (۱۹) کا مجموعہ ہے۔ اسی کتاب پر مرحوم کو ۱۹۶۰ء میں ساہتیہ اکاڈمی کا پانچ ہزار کا انعام ملا تھا۔ ان تینوں کتابوں میں انھوں نے خوب داد تحقیق دی ہے۔ امانت کی اندر سبھا کا صحیح متن پیش کیا ہے اور اس کی حیثیت متعین کی ہے۔ یہ تینوں کتابیں دوسری مرتبہ ۱۹۶۸ء میں

شائع ہوئی تھیں ۔

۲۱۔ آئینۂ سخن فہمی (۱۹۵۹ء) سید محمد احمد بیخود موہانی نے ادیب صاحب کی کتاب "ہماری شاعری" پر اپنے دو رسالوں جوہر آئینہ اور منظر آئینہ میں اعتراض کیے تھے، یہاں انھیں کا رد کیا گیا ہے ۔

۲۲۔ گلشن سخن (۱۹۶۵ء) مردان علی خان مبتلا کا تذکرۂ شعرائے اردو ۔

۲۳۔ ایرانیوں کا مقدس ڈراما (۱۹۶۶ء) ایران میں زمانۂ محرم میں تعزیہ شبیہ گردانی کا رواج ہے۔ اس موقع پر جو رسوم ادا کی جاتی ہیں، ان کی شکل مذہبی ڈرامے کی سی ہے، یہاں اسی کا بیان ہے ۔

۲۴۔ قواعد کلیۂ بھاکا (۱۹۶۸ء) کتاب تحفۃ الہند کا پہلا باب

۲۵۔ اندر سبھا (۱۹۶۸ء) امانت کی مشہور نظم

۲۶۔ ناٹک "بزم سلیمان" (۱۹۶۸ء)

۲۷۔ شاعر اعظم انیس: مختصر تعارف (۱۹۶۹ء) اس میں منتخب کلام بھی شامل ہے ۔

۲۸۔ نگارشات ادیب (۱۹۶۹ء) مجموعۂ مضامین

۲۹۔ اسلاف میر انیس (۱۹۷۰ء) میر انیس کے اجداد کے حالات اور کلام کا نمونہ ۔ اس پر اتر پردیش اردو اکاڈمی نے ۱۹۷۲ء میں دو ہزار روپے انعام دیا تھا ۔

۳۰۔ شرح طباطبائی اور تنقید کلام غالب

۳۱۔ مراثی دبیر (مقدمہ) (۱۹۷۱ء)

۳۲۔ انیسیات (۱۹۷۶ء) یہ ان کی وفات کے بعد اتر پردیش اردو اکاڈمی کے زیر اہتمام شائع ہوئی ۔ اس میں ان کے چھوٹے بڑے مضامین شامل ہیں، جو اس سے پہلے مختلف رسالوں میں شائع ہو چکے تھے ۔

ان کے علاوہ یہ کتابیں ان کی زندگی میں طبع نہیں ہو سکی تھیں، اگرچہ ان کا مسودہ مکمل ہو گیا تھا ۔

۱۔ سلطان عالم واجد علی شاہ ۲۔ دلی میں مرثیہ گوئی ۔

۴۔ ایران میں مرثیہ گوئی: ایک تاریخی جائزہ۔ یہ سلطان عالم واجد علی شاہ کو ان کی وفات کے بعد، ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی۔ اس سے معلوم ہوگا کہ اگرچہ وہ کہنہ مرثیہ میں بھی بند نہیں تھے، لیکن ان کے خاص موضوع یہ ہیں:

۱۔ مرثیہ؛ ۲۔ انیس؛ ۳۔ اودھ کی شاہی زمانے کی تاریخ، بالخصوص عہد واجد علی شاہ۔ انھوں نے ان موضوعات پر گرانقدر اور بے مثل ذاتی کتابخانہ جمع کر لیا تھا، جس کا بیشتر حصّہ انھوں نے آخری ایام میں الگ کر دیا تھا؛ اس کا کچھ حصّہ مختلف یونیورسٹیوں میں پہنچ گیا ہے۔

لکھنے کے معاملے میں وہ سُست رو تھے۔ بات دراصل یہ ہے کہ وہ بے حد محتاط تھے؛ جب تک موضوع کے ایک ایک جزو تک کے بارے میں انھیں اطمینان نہ ہو جاتا، وہ نہ تو اپنے نتائجِ فکر کو آخری شکل دیتے، نہ اس کا کوئی حصّہ شائع کرتے۔ یہی باعث ہے کہ ان کی مطبوعات کی تعداد زیادہ نہیں۔ کاتا اور لے دوڑی کا معاملہ ہوتا، اور محض سستی شہرت حاصل کرنا ہی ان کا مطمحِ نظر ہوتا، تو یہ فہرست بہت طویل ہو سکتی تھی۔ لیکن بحالتِ موجودہ یہ اتنی مختصر بھی نہیں کہ کوئی سنجیدہ مورخِ ادب اس سے صرفِ نظر کر سکے۔ اپنے تنوع اور معیار کے لحاظ سے یہ بے حد قابلِ قدر اور مستند علمیہ ذخیرہ ہے اور یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ مدّتوں اس پر آسانی سے اضافہ نہیں ہو سکیگا۔

ان مستقل کتابوں کے علاوہ، ان کے مضامین اور شذرات کی بھی خاصی بڑی تعداد مختلف رسائل و جرائد میں منتشر پڑی ہے۔ اگر انھیں جمع کیا جائے، تو ان سے کئی مجلّد تیار ہو سکتے ہیں۔

ان کی مسلسل علمی اور ادبی خدمات کا اعتراف حکومت نے بھی کیا، اور اردو داں حلقے نے بھی؛ متعدد کتابوں پر انعام ملے؛ جن کا اوپر ذکر ہوا۔ اپریل ۱۹۷۰ء میں صدرِ جمہوریۂ ہند نے انھیں فارسی کے فاضل کی حیثیت سے اپنا خاص اعزاز عطا کیا، جو ایک سند، شال اور حینِ حیات تین ہزار روپیہ سالانہ وظیفے پر مشتمل ہے۔ اپریل ۱۹۷۰ء میں حکومت نے "پدم شری" کا خطاب بھی دیا۔ پھر ۱۹۷۲ء میں حکومتِ اترپردیش نے ان کی تصنیفی

کاوشوں کے لیے انھیں پانچ ہزار کا "خاص انعام" یک مشت دیا اور ایک سند بھی عطا کی۔

۱۹۲۶ء میں اُن کی شادی ٹیکا پور (کانپور) کے مشہور طبیب حکیم سیّد محمد اصغر جعفری نعمت الٰہی عرف پیارے صاحب کی صاحبزادی حسن جہاں بیگم سے ہوئی۔ سیّد محمد اصغر جعفری کا سلسلہ حضرت شاہ نعمت اللہ ولی کرمانی سے ملتا تھا، جن کا آیندہ کی پیشگوئیوں پر مشتمل قصیدہ شہرۂ آفاق ہے؛ اسی لیے انھوں نے اپنے نام کے ساتھ "نعمت الٰہی" کا اضافہ کر لیا تھا۔

بیگم مسعود مرحومہ کو علم سے شغف اپنے والد سے ملا تھا۔ وہ انگریزی بھی جانتی تھیں، اُردو میں شعر بھی کہتی تھیں، حزیں تخلص تھا۔ انیس کی عاشق تھیں، بلکہ حافظ تھیں۔ ان کا انیس کا مطالعہ کس درجے کا تھا، اس کا کچھ اندازہ اس سے لگایئے، کہ جب بھی مسعود صاحب کو انیس کے کسی بند کے بارے میں معلوم کرنا ہوتا کہ وہ کس مرثیے میں ہے، تو وہ ان سے دریافت کرتے۔ مرحومہ نہ صرف نشاندہی کرتیں، بلکہ متعلقہ جلد لا کر پیش کر دیتیں۔ موت سے کچھ پہلے وہ اُردو ضرب الامثال جمع کر رہی تھیں، لیکن یہ کام نامکمل رہ گیا۔ ان کا ۲۳ اکتوبر ۱۹۷۱ء کو بعارضۂ قلب انتقال ہوا۔

ان بیگم سے مسعود صاحب کی سات اولادیں ہوئیں: (۱) سب سے بڑی صاحبزادی ارجمند بانو یہ ڈاکٹر مسیح الزماں (الٰہ آباد یونیورسٹی) (ف: فروری ۱۹۷۵ء) کے عقدِ نکاح میں آئیں۔ (۲) مسعود صاحب کے سب سے بڑے بیٹے ڈاکٹر سیّد اختر مسعود، پشاور یونیورسٹی (پاکستان) میں فارسی کے استاد ہیں۔ (۳) ان سے چھوٹی صاحبزادی برجیس بانو ایم اے (اُردو) کراچی کے ایک تعلیمی ادارے سے وابستہ ہیں۔ (۴) تیسری بیٹی انیس بانو اپنے شوہر کے ساتھ امریکا کے شہر کیلی فورنیا (لاس انجلیس) میں مقیم ہیں۔ (۵) ڈاکٹر نیّر مسعود دوسرے بیٹے لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں مدرس ہیں (۶) ان سے چھوٹے بیٹے سیّد انور مسعود رضوی نیشنل ہومیوپیتھک کالج، لکھنؤ میں پڑھاتے ہیں۔ (۷) سب سے چھوٹے صاحبزادے اظہر مسعود رضوی، یو پی اردو اکادمی، لکھنؤ میں مہتمم نشر و اشاعت ہیں۔

ادیب مرحوم کے قائم کردہ اشاعتی ادارے "کتاب نگر" کی نگرانی بھی انھیں کے ذمے ہے۔

کبرسنی کے ساتھ تندرستی جواب دینے لگی تھی۔ اکتوبر ۱۹۶۹ء میں بیگم کے انتقال کا انھیں قدرتاً بہت صدمہ ہوا، اور اس کے بعد بہت افسردہ رہنے لگے تھے۔ حافظہ بھی بہت کمزور ہو گیا تھا؛ بات جلدی بھول جاتے تھے۔ اس کے باوجود تھوڑا بہت لکھنے کا شغل جاری رہا۔ لیکن جولائی ۱۹۷۵ء میں طبیعت زیادہ خراب ہو گئی اور بیشتر وقت خود رفتگی سی طاری رہنے لگی تھی۔ ۲۹ جولائی کو خاموشی اور شدید افسردگی کا دورہ پڑا، اور کھانا پینا بالکل چھوٹ گیا۔ اس کے بعد دوا دوش سے کچھ افاقہ ضرور ہوا، لیکن بستر سے اٹھنے کی سکت سلب ہو گئی۔ پورے چار ماہ اسی حالت میں گزرے۔ ۲۹ نومبر ۱۹۷۵ء (شب ۲۵ ذیقعدہ ۱۳۹۵ھ) رات کے پونے نو بجے خالق حقیقی کے بلاوے پر لبیک کہی۔ انّا للہ و انّا الیہ راجعون۔

جنازہ اگلے دن (۳۰ نومبر) اٹھا۔ اہلِ سنت اور اہلِ تشیع نے الگ الگ نمازِ جنازہ پڑھی۔ شیعی جماعت کی امامت سیّد العلما مولانا سیّد علی نقی صاحب مجتہد (عرف نقّن صاحب) نے اور اہلِ سنت کی مولانا محمد ہاشم انصاری فرنگی محلی (بن مولانا صبغۃ اللہ شہید انصاری) نے کی۔ بعض اصحاب نے دونوں نمازوں میں شرکت کی۔ انھیں کربلائے منشی فضل حسین میں اپنی مرحومہ بیگم کے پہلو میں سپردِ خاک کیا گیا۔ یرحمہما اللہ تعالیٰ

کئی اصحاب نے تاریخ وفات کہی۔ ڈاکٹر رفیق حسین رفیق لکھنوی کی علیسوی میں ہے:

شیدائے انیس، افسوس اب ہم سے ہوئے رخصت	مہماں ہوئے جنّت کے مسعود حسن رضوی
بیساختہ نکلا ہے منھ سے یہ رفیق اپنے	"آگاہِ حقائق تھے مسعود حسن رضوی"

(۱۹۷۵ء)

ہجری مصرع حکیم عزیز قدوسی کا موتی کا ہے:

آہ، صد حیف مسعود حسن رضوی (۱۳۹۵ھ)

پروفیسر مسعود حسن رضوی مرحوم نے کسی زمانے میں شاعری بھی کی تھی؛ ادیب تخلّص کیا بعد کو

جب نثر نگاری سے مزاولت بڑھی، تو یہ شغل ترک ہو گیا۔ لیکن اس زمانے کا جو کلام تھا، اس کا ایک مختصر انتخاب انھوں نے "ہماری شاعری" کے دیباچے میں درج کر دیا تھا۔ میں نے جب ایک مرتبہ ان سے دریافت کیا کہ کچھ اور کلام بھی عنایت فرمائیں، تو کہا کہ بس، اب اسی کو سارا کلام سمجھیے! لہٰذا میں وہی اشعار یہاں درج کر رہا ہوں۔ کلام کے تیور بتا رہے ہیں کہ اگر وہ یہ شوق جاری رکھتے، تو آج اُن کا ممتاز شعرا میں شمار ہوتا۔

جذبِ دامانِ بے نیازی سے اثر بڑھتا گیا — میں ہٹا جس جس طرف، عالم اُدھر بڑھتا گیا
کچھ عجب عالم ہے، راہِ منزلِ مقصود کی — جتنا جتنا میں بڑھا، میرا سفر بڑھتا گیا

فرطِ خود بینی سے دنیا بن گئی آئینہ دار — ایک ہی صورت نظر آتی ہے ہر تصویر میں
کیا کہوں، دیوانگیِ عشق کی رُسوائیاں — زلف کے پابند بھی باندھے گئے زنجیر میں
اک نژادِ تمنا، اک بہارستانِ شوق — کیا بتائیں، ہم نے کیا دیکھا، تری تصویر میں

ہے اک نقشہ دلِ مجبور کی اٹھتی امنگوں کا — لبِ ساحل حبابوں کا ابھرنا اور مٹ جانا

دردِ دل ہنس ہنس کے کہنے دے ذرا، اے مشقِ ضبط!
اک دلِ ناآشنا کا امتحاں لینا ہے آج

آج کی چشمِ کرم نازِ مسیحائی ہے — ابھی کچھ مُردہ تمناؤں میں جان آئی ہے

پاؤں میں ہوتی ہے بیڑی کی گرانی محسوس — دھیان جب یہ نہیں رہتا کہ اب آزاد ہوں میں

جلا جن سے نشیمن، جب وہ شعلے دل سے اٹھتے ہیں
تو دادِ آنسو بہا آتا ہوں میں خاکِ نشیمن پر

یہ سعیِ پردہ داری ہو، اور رائگاں ہو — وہ حالِ دل جو پوچھیں، ہر موئے تن زباں ہو

سمجھے تھے طوفانِ ہستی میں جسے جائے پناہ — ایک موجِ کوہ پیکر، وہ بھی کشتی، ساحل نہ تھا

اب خبر دیکھیے بیمار کی کیا آتی ہے — ہر طرف سے مجھے رونے کی صدا آتی ہے

اس کی چشمِ مست سے ہشیاریوں کے در کھلے — دل کی دنیا کے بہت سے راز اب ہم پر کھلے

ان دنوں کیوں جی نہیں لگتا ہے گلشن میں کہیں — برق کو شاید ہے پھر میرے نشیمن کی تلاش

خوفِ رسوائی نہیں، تو ضبطِ غم سے کام کیا — پختہ کارانِ جنوں کو ہوشِ ننگ و نام کیا

خط سے کیا مطلب مجھے، قاصد سے مجھ کو کام کیا
دل میں جو رہتا ہے، اس کو نامہ و پیغام کیا

مجھے قاسم ازل سے کبھی کچھ گلا نہ ہوتا جو یہ تم ملے تھے مجھ کو، تو یہ دل ملا نہ ہوتا

وہ سیر دشت وحشت، اور وہ میرے دل کی ویرانی
اُدھر تھا میں بیاباں میں، ادھر مجھ میں بیاباں تھا

گریۂ غم پہ بھی آ گئے جسے آتی تھی ہنسی وہی دل خندۂ شادی سے بھی دلگیر ہے اب

تھے ہم آزاد، جب آباد تھی دنیائے خیال حلقۂ حدِ نظر، حلقۂ زنجیر ہے اب

صفحۂ دل کے سوا، جو کہیں دنیا میں نہ تھی ذرّے ذرّے میں جہاں کے وہی تصویر ہے اب

اب کہاں ہیں وہ کہ جس کے بس کا ہو اخفائے
دل میں طاقت چاہیے، ضبط و فغاں کے واسطے

بس اک یہی حسرت ہے اب، اے طولِ جدائی!
تجھ سے جو ملیں وہ، تو میں جی کھول کے رو لوں

ہم سخن لاکھوں ہیں، لیکن ہمزباں کوئی نہیں
مجھ کو دنیا کی بھری محفل بھی خلوت خانہ ہے

خوشی میں رنج! کہیں کیا مآل کے غم کو خزاں کا خوف ہے جوشِ بہار میں ہم کو

اپنی تدبیروں پہ، اے غافل! نظر تو نے نہ کی
ورنہ پڑھ لینا خطِ تقدیر کچھ مشکل نہ تھا

غم شکستِ عہدِ ضبط و صبر کا سہنا پڑا اپنے ہمدردوں سے آخر دردِ دل کہنا پڑا

ہر تبسم میں وہاں پنہاں تھی برقِ عقل سوز میں سمجھا تھا کہ اندازِ جفا کچھ اور ہے

ہم خاک کو سمجھا کیے اکسیر ابھی تک تدبیر رہی تابعِ تقدیر ابھی تک

پھر ظلم پہ مائل ہیں، تو اتنا بھی سمجھ لیں باقی ہے مری آہ میں تاثیر ابھی تک

شکوہ کیا، مجھ کو جو بزمِ ناز سے اٹھوائے ہے
حال کس بسمل کا اس نازک سے دیکھا جائے ہے!

دیکھیں نگاہِ شوق کی گستاخیاں ادیبؔ | تیور بدل گئے مرے نازک مزاج کے
پیری آیینے سے خودبیں کو یہ دیتی ہے صدا | "اب یہ را جانوں کہ ترے ناز اٹھائے کوئی"
دنیا کو کیا خبر مرے حالِ تباہ کی | فرصت کہاں ہجومِ مصائب میں آہ کی
دیکھیے قسمت کی محرومی کہ مثلِ سنگِ راہ | جس کے قدموں سے لگا میں اس نے ٹھکرا یا مجھے
طاقتِ پرواز بھی ہے، ہمتِ پرواز بھی | کش پر ہوتے، نکلتی حسرتِ پرواز بھی
دیا یہ شوقِ پرواز اک قفس کے رہنے والے کو | مجھے تجھ سے بس اتنا، میرے فطرت ساز کہنا ہے

تمکین سرمست، سید محمد قادر الدین خان

حیدر آباد دکن کے ایک معزز اور صاحب علم گھرانے میں ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد نواب سید مسیح الدین خان ریاست نظام کے منصبدار تھے۔ وہ عوام میں "بڑے بخشی" کے عرف سے مشہور تھے۔ حیدر آباد کے محلّہ مغلپورہ میں "مسیح الدین خان کی ڈیوڑھی" انھیں سے منسوب ہے۔ نواب معین الدولہ ان کے حقیقی بھانجے تھے۔ جب معین الدولہ کی کم عمری میں ان کے والد کا انتقال ہوگیا تو جاگیر کورٹ آف وارڈ کی تحویل میں چلی گئی۔ اور حضور نظام نے نواب مسیح الدین خان کو معین الدولہ کا ولی اور نگران مقرر کر دیا۔ مسیح الدین خان کا ۱۹۱۱ء میں انتقال ہوا۔ اس وقت ۵۵ سال کی عمر تھی۔

نواب مسیح الدین خان کے پانچ بیٹے ہوئے (۱) ہدایت محی الدین؛ (۲) عبد القادر؛ (۳) دستگیر الدین خان؛ (۴) قادر الدین؛ (۵) سلطان محی الدین؛ اور تین بیٹیاں: لاڈلی بیگم، قادری بیگم اور جیلانی بیگم۔

سید قادر الدین خان کو بچپن سے ادبی ماحول ملا۔ والد اگرچہ شعر نہیں کہتے تھے، لیکن ان کا ادبی ذوق بہت بلند تھا، جیسا اس عہد کے اکثر رؤسا کے یہاں ملتا ہے۔ قادر الدین کے تین بھائی شعر کہتے تھے۔ سید عبد القادر کا تخلص ناصر تھا۔ ان سے چھوٹے سید دستگیر الدین نادر تخلص کرتے تھے، ڈراما نویسی سے بھی دلچسپی تھی۔ ان کے بعض غیر مطبوعہ ڈرامے ان کے خاندان میں محفوظ ہیں۔ سید قادر الدین سے چھوٹے بھائی سلطان

محی الدین بھی شعر کہتے تھے اور قاسمی تخلص کرتے تھے۔
سید قادرالدین کی پوری تعلیم گھر پر ہوئی؛ کسی مدرسے نہیں گئے۔ فارسی میں پوری دستگاہ تھی؛ انگریزی بھی بقدرِ ضرورت حاصل کر لی تھی۔ مطالعہ بہت وسیع تھا۔ ان کے والد کا خاصا بڑا کتب خانہ تھا۔ انھوں نے اس سے پورا استفادہ کیا۔ خود بھی کتابوں کا ذخیرہ جمع کر لیا تھا۔ اپنے ماحول کے زیرِ اثر جلد ہی شعر کہنے لگے۔ تمکین تخلص تھا، "سرمست" کا اضافہ اپنے کسی صوفی بزرگ کے لقب سے کر لیا تھا۔ آغازِ شعرگوئی میں کچھ دن غلام محمد عرف ترک علی شاہ ترکی (ف: مارچ ۱۹۱۹ء) سے اصلاح لی۔ بعد کو مدتوں نظم طباطبائی (ف: مئی ۱۹۳۲ء) سے مشورہ کرتے رہے۔ وہ نظم طباطبائی کی فنی اور علمی قابلیت اور مہارت کے بہت قائل اور ثناخوان تھے؛ اور کہا کرتے تھے کہ مجھے ان سے بہت فیض حاصل ہوا۔
ان کا کلام اپنے عہد کے مؤقر جرائد میں شائع ہوتا رہا۔ لیکن وارستہ مزاجی کا یہ عالم تھا کہ کبھی اسے مرتب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ لہٰذا آج تک ان کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہو سکا۔ اندیشہ ہے کہ اگر فوری توجہ نہ کی گئی، تو اس باکمال شاعر کی کوئی یادگار نہیں رہیگی۔ اگرچہ بنیادی طور پر غزل سے مزاولت تھی، لیکن انھوں نے بعض معرکے کی نظمیں بھی کہی ہیں۔
ساری عمر کہیں جم کر کام نہیں کیا۔ بعض اعزہ و احباب نے سبیل پیدا کی بھی، لیکن ان کے لاابالی پن نے یہ تعلق زیادہ دن تک قائم نہ رکھا۔ نواب معین الدولہ ان کے پھپھیرے بھائی تھے۔ جب وہ مدارالمہام مقرر ہوئے، تو انھوں نے بلدے میں ان کا بحیثیت مددگار پولیس تقرر کر دیا۔ لیکن یہ ٹریننگ کے دوران ہی میں مستعفی ہو کر گھر چلے آئے۔ اسی طرح تعلقہ دار درجۂ اول نواب کاظم جنگ نے (جو شعر کہتے اور کبھی کبھی ان سے مشورہ بھی کر لیتے تھے) ان کے لیے نوڈ آفیسر کے عہدے کا انتظام کر دیا۔ مشاہرہ معقول تھا، اور اس پر کام اور ذمہ داری برائے نام۔ لیکن یہ شاید ایک سال سے زیادہ نباہ نہ کر سکے۔ غرض تھوڑا، بہت جو کچھ اپنی خاندانی جاگیر اور منصب سے مل جاتا، صبر شکر سے اسی پر قانع رہے۔ لیکن پولیس ایکشن

اور اس کے بعد انضمام ریاست پر یہ آمدنی بھی ختم ہوگئی۔ لطف یہ کہ اس پر بھی ان کی پیشانی پر بل نہیں آیا۔ وہی وضعداری اور آن بان اور ٹھاٹ، جو سادی عمران کا شعار رہا تھا، اس کے بعد بھی قائم رہا۔

آخری زمانے میں اکثر بیمار رہنے لگے تھے۔ غذا بالکل ترک ہوگئی تھی۔ بہت مجبور کرنے پر دو چار لقمے کھا لیتے یا دودھ پی لیتے۔ کمزوری ہونا ہی چاہیے تھی۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۷۵ء کو فجر کے وقت آنکھ کھلی، تو طبیعت کی خرابی کی شکایت کی۔ بیگم نے خیال کیا کہ کمزوری کے باعث یہ تکلیف ہے۔ وہ گئیں کہ گرم دودھ لا کے انھیں پلائیں۔ واپس آئیں، تو روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ اِنّا لِلّٰہ وَ اِنّا اِلیہِ رَاجِعون۔ اسی دن بعد نمازِ عصر تجہیز و تکفین عمل میں آئی؛ اور درگاہ شاہ خاموش کے احاطے میں سپردِ خاک ہوئے۔

ان کی شادی صدیق علی شاہ (سابق تحصیلدار سہارنپور) کی صاحبزادی بدرالنسا بیگم سے ہوئی۔ وہ اُردو فارسی بہت اچھی جانتی ہیں۔ شعر بھی کہتی ہیں؛ بیبن تخلص ہے۔ مرحوم سے دو بیٹے (سید یوسف شرف الدین (عرف یوسف سرمست) اور سید قیصر صلاح الدین (عرف قیصر سرمست) اور ایک بیٹی جمیلہ حامدۃ النسا بیگم یادگار ہیں ——۔ یوسف سرمست عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں لیکچرر ہیں۔ ان کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ "بیسویں صدی میں اُردو ناول" شائع ہو چکا ہے۔ چھوٹے بیٹے قیصر سرمست معروف آرٹسٹ ہیں؛ سرورق کا ڈیزائن بنانے میں ان کی خاصی شہرت ہے۔ تینوں شادی شدہ اور ماشاءاللہ صاحبِ اولاد ہیں۔

کلام بہت پختہ اور جاندار ہے۔ افسوس کہ مجموعۂ کلام شائع نہیں ہوا۔ ذیل میں غزلیات سے مختصر انتخاب اور ان کی ایک نظم بطورِ نمونہ دے رہا ہوں جو ان کی بیگم اور صاحبزادے قیصر سرمست کی مہربانی سے مہیا ہوئی ہیں۔ ان کے حالات بھی انھیں سے ملے ہیں:

ہم یاد کر رہے ہیں انھیں کس امید پر — اب تو غمِ فراق کا بھی آسرا نہیں
حال آں کہ تم نے کب کا بھلا بھی دیا، مگر — تم مجھ کو بھول جاؤ گے، دل مانتا نہیں
کہنے کو اب بھی زندہ ہوں، لیکن ترے بغیر — کب زندگی پہ موت کا دھوکا ہوا نہیں

وصل و فراق کھیل ہیں نیرنگِ شوق کے
ورنہ جنونِ عشق کا کچھ مدّعا نہیں

تمکین! جفائے یار کو معلوم ہو تو ہو
اپنی وفا کا مجھ پہ تو عقدہ کھلا نہیں

اک لمحۂ فریبِ اجل کے سوا مجھے
کس وقت انتظار تمھارا رہا نہیں

دنیا و دیں لٹا کے اسے دیکھ تو لیا
یہ اور بات ہے کہ کہیں کا رہا نہیں

مقامِ ہوش میں پوچھو کہ دیوانوں پہ کیا گزری
جب آئی شمع محفل میں، تو پروانوں پہ کیا گزری

خزاں میں جو گلستانوں پہ گزری سب پہ ظاہر ہے
کسی کو کیا خبر لیکن، بیابانوں پہ کیا گزری

ذرا جوشِ جنوں، دردِ محبت! اور بڑھنے دو
یہ داماں خود بتا دینگے، گریبانوں پہ کیا گزری

جو کچھ بیتی، سو بیتی مجھ پہ لیکن کیا کہوں تمکیں!
مرے ضبطِ مسلسل سے ستم رانوں پہ کیا گزری

کہاں کی روشنی، ہم لطف تاریکی بھی کھو بیٹھے
شبِ غم اپنی آنکھوں پر بھروسا کر کے پچھتائے

نہ امیدوں کا طوفاں ہے، نہ اب طغیانِ نومیدی
کچھ ایسا درد ہے دل میں کہ جس سے جی نہ گھبرائے

حقیقت میں وہی رُودادِ حسن و عشق ہے، تمکیں!
کہ لب تک بھی نہ آنے پائے، اور دل میں اتر جائے

اسی کو یاد کہتے ہیں، یہی تو یاد آنا ہے
وہ اپنے زعم میں جس کو بھلا دینا سمجھتے ہیں

اب اس میں کیا کسی کو، میں ہوں کس کا، کون ہے میرا
بظاہر میں ہوں ان کا جو مجھے اپنا سمجھتے ہیں

عجب چیستاں ہے یہ کیفیتِ دل
نہ رونے میں داخل، نہ ہنسنے میں داخل

کمی کیا ہے منزل کی راہِ طلب میں
کہ راہِ طلب میں نہیں کوئی منزل

محبت میں مشکل ہے مشکل بھی آساں
محبت میں آساں ہے آساں بھی مشکل

گو تم بھی پاس ہو، اور حاصل ہے ہر خوشی بھی
پھر بھی میں کچھ کمی سی ہر شے میں پا رہا ہوں

ہر ذرّہ کائنات کا اک آفتاب تھا / وہ بھی تھی، اور یہ بھی شبِ ماہتاب ہے
جو تجھ کو چاہتے ہیں، تجھے چاہتے رہے / یہ مان کر بھی اس کا نتیجہ خراب ہے

مت پوچھ، وہ تیری فرقت میں کس دل سے گزارا کرتے ہیں
جو تیری تمنا ہیں، تیری دوری بھی گوارا کرتے ہیں
ہے فتح و شکستِ اہلِ وفا و اہلِ جفا میں فرق یہی
یہ ہار کے جیتا کرتے ہیں، وہ جیت کے ہارا کرتے ہیں
روتوں کو ہنسانا تو سیکھو، تم دل کا لگانا تو سیکھو
اے دوست! ڈبو سکتے ہیں وہی، جو پار اتارا کرتے ہیں
کیا بات ہے، کیوں ہر کھٹکے تیرا ہی نام زباں پر آتا ہے
ہم نے تو سنا تھا، مشکل میں اپنوں کو پکارا کرتے ہیں
رو رو کے بھی اہلِ دانش سے دم بھر نہ گزاری جائیگی
جو زندگی تیرے دیوانے ہنس ہنس کے گزارا کرتے ہیں

جاں کس کو نہیں عزیز، مگر / پھر بھی ترکِ وفا کریں کیونکر

ہر قوتِ دل کو آزما کر دیکھا / اک اک بُت کو خدا بنا کر دیکھا
تمکین! مگر بھولنے والا میرا / بھولا نہ گیا لاکھ بھلا کر دیکھا

بھولا ہوا راستہ دکھایا مجھ کو / میرا اپنا پتا بتایا مجھ کو
دشمن کو میں کیوں نہ دوست رکھوں تمکیں! / دشمن نے تو آدمی بنایا مجھ کو

مایوس نہ ہو، دوریٔ منزل پہ نہ رو
رہبر کا کوئی غم نہ کر، اوسان نہ کھو
بھٹکے ہوؤں کا بھی اک وسیلہ ہے یہاں
خود راستہ مل رہیگا، گمراہ تو ہو

مفلس کی دنیا

قضا را ایسی دنیا میں ہوا اک دن گزر میرا
کہ جس کی یاد میں مجروح اب تک ہے جگر میرا

جہاں کی سرزمیں ذلّت، جہاں کا آسماں پستی
جہاں کے وادی و کہسار، افلاس و تہی دستی

جہاں چاروں طرف مایوسیوں کی حکمرانی ہے
جہاں ہر صورتِ امید، نومیدی کی بانی ہے

جہاں حدِّ نظر تک رنج و غم کے پُرخطر بن ہیں
جہاں کے طائروں کی بولیاں بس آہ و شیون ہیں

جہاں کا ذرّہ ذرہ دعوتِ آلام دیتا ہے
جہاں کا چپّہ چپّہ دوزخوں کا کام دیتا ہے

جہاں کی صبح حزن و یاس کی تمہید ہوتی ہے
جہاں کی شام بحرِ دشمنِ امید ہوتی ہے

جہاں کی چاندنی تاریک اور مغموم ہوتی ہے
جہاں کی دھوپ ہمّت سوز اور مسموم ہوتی ہے

جہاں ہے ایک ہی مفہوم مرگ و زندگانی کا
جہاں دن دوپہر ڈھل جاتا ہے سورج زندگانی کا

جہاں دن رات سر پکڑے ہوئے تقدیر روتی ہے
جہاں آٹھوں پہر آرام سے تقدیر سوتی ہے

جہاں ہر شوق ہو جاتا ہے صرفِ فاقہ بدمستی
جہاں ہر ولولہ ہو جاتا ہے رہنِ تہی دستی

جہاں جوش اولوالعزمی کی سانسیں ٹوٹ جاتی ہیں
جہاں احساسِ خودداری کی نبضیں چھوٹ جاتی ہیں

جہاں صدق و صفا کا خون پی لیتی ہے ناداری
جہاں صبر و رضا ہو جاتے ہیں مجبورِ غدّاری

جہاں بے جرمیاں بھی جرم کا قالب بدلتی ہیں
جہاں آزادیاں بھی قید کے سانچے میں ڈھلتی ہیں

جہاں نشو و نما پاتے ہیں چوری، جھوٹ، عیّاری
جہاں پروان چڑھتے ہیں خیانت، جرم، مکّاری

جہاں ہر ہر قدم پر پائے ایماں ڈگمگاتے ہیں
جہاں کے خوف سے نبیوں کے دل بھی تھرتھراتے ہیں

یہیں بستے ہیں ننگِ زندگی، وہ پیٹ کے مارے
جنھیں ہر وقت دن کو بھی دکھائی دیتے ہیں تارے

زمانے بھر کے دھتکارے، خدائی بھر کے ٹھکرائے
ذلیل و خوار اپنی ہستیوں سے آپ شرمائے

مجسّم آہ، سرتا پا زبانِ حال کے نالے
فلک کی آنکھ کے ناسور، قلبِ دہر کے چھالے

غلامی کی حیاتِ تیرہ کی تابندہ تصویریں
فنائے عزم و مرگِ ارتقا کی زندہ تصویریں

قتیلِ جہل و پستی، کشتۂ اوہام و نادانی
امیروں کے رگِ ایوان، مگر از قسمِ انسانی

تموّل جن کو یکسر پیکرِ بیجاں سمجھتا ہے
تمدّن جن کو اک انساں نما حیواں سمجھتا ہے

فقط اک خشک روٹی جن کے جسم و جاں کی قیمت ہے
مشیت کھیلتی ہے رات دن جذبات سے جن کے
ہوا کرتی ہیں سامانِ تفرّج عصمتیں جن کی
ارادوں پر بھی غالب جن کے غیروں کا ارادہ ہے
دبے ہیں جن کے جوہر اس قدر زنگِ مذلّت میں
ہے بس رے دیکھے جن کی کائناتِ زندگی ساری
جنھیں انسان کہتے آدمیّت ہچکچاتی ہے
فضائے بحر و بر، کون و مکاں کو عار ہے جن سے

فقط اک حکم جن کے مذہب و ایماں کی قیمت ہے
مسخر کرتی ہے تقدیر احساسات سے جن کے
رہا کرتی ہیں برگشتہ ہمیشہ قسمتیں جن کی
نہ جن کی اپنی مرضی ہے، نہ جن کا اپنا منشا ہے
کہ شک ہونے لگا ہے خود انھیں اپنی شرافت میں
غلامی، مفلسی، فاقہ، مصیبت، بھیک، بیماری
جنھیں زندہ سمجھتے، زندگی کو شرم آتی ہے
اجل کو جن سے نفرت، زندگی بیزار ہے جن سے

کوئی غمخوار ہے جن کا، نہ کوئی پوچھنے والا
خداوندا! الٰہا! داورا! اے دادرس مولا!

محمود بیگ، میرزا

مغلوں کے ایک معزز اور پرانے خاندان کے نام لیوا تھے۔ ان کے مورثِ اعلیٰ داداب بیگ عہدِ عالمگیری میں وسط ایشیا کے شہر فرغانہ (حال تاجکستان) سے ہندستان آئے اور دلّی میں بس گئے۔ یہاں انھوں نے اور ان کی اولاد نے بسراوقات کے لیے مختلف پیشے اختیار کیے۔ پہلے کے حالات کچھ یقین سے نہیں کہے جاسکتے، لیکن جب ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ہوا ہے، تو ان کے دادا میرزا افضل بیگ کا شہر کے متموّل لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ کئی دوسرے گھرانوں کی طرح یہ لوگ بھی ڈر کے مارے شہر سے نکل گئے۔ یہی خیال تھا کہ جب امن قائم ہوگیا، واپس آجائیںگے۔ لیکن ستمبر ۱۸۵۷ء میں انگریز کا دلّی پر دوبارہ قبضہ ہوگیا، تو دارو گیر کا دہ بازار گرم ہوا، اور سربرآوردہ مسلمانوں کی جاداد پر اس طرح مسمار کی گئی یا نیلام ہوگئی، کہ ان غریبوں کو بڑی مشکل سے محلّہ رودگرداں (فراشخانہ) دلّی میں سر چھپانے کو جگہ ملی۔ اس کے بعد خاندان کی مالی حالت بھی بہت کمزور ہوگئی، اور مشکل سے گزر بسر ہونے لگی۔

میرزا افضل بیگ کے پانچ بیٹے تھے: **میرزا منوّر بیگ**، میرزا امجد بیگ، میرزا اسحاق بیگ، میرزا یعقوب بیگ، میرزا شہباز بیگ۔ تبدیل شدہ حالات کے باعث سب کی مناسب تعلیم و تربیت کا انتظام بہت مشکل تھا۔ اس لیے والدین نے بڑے تینوں بیٹوں کو ہوش سنبھالتے ہی روزی کمانے کو چھوٹے موٹے کام پر لگا دیا؛ صرف چھوٹے دو لڑکے تعلیم

حاصل کر سکے۔ اس طرح میرزا یعقوب بیگ، کسی نہ کسی طرح آٹھویں درجے تک
پڑھے، اور اس کے بعد میونسپل کمیٹی میں ملازم ہو گئے۔ سب سے چھوٹے میرزا شہباز بیگ
سب سے زیادہ خوش قسمت رہے۔ مڈل تک وہ سرکی والان کے عربک اسکول میں پڑھے۔
(یہاں انھوں نے مولانا حالی سے پڑھا تھا)، اور اس کے بعد جون ۱۸۹۴ء میں دسویں
درجے کی سند پنجاب یونیورسٹی سے حاصل کی۔ ان کا ۲ جنوری ۱۹۶۸ء (یوم عید الفطر)
انتقال ہوا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قبرستان میں دفن ہوئے۔
یہی میرزا شہباز بیگ ہمارے میرزا محمود بیگ کے والد بزرگوار تھے۔
میرزا شہباز بیگ دسویں درجے کا امتحان پاس کرنے کے بعد ہی (۱۸۹۴ء میں) نہر جمن
(غربی) کے دفتر میں بطور کلرک بھرتی ہو گئے تھے۔ لیکن وہ نہ اس پر مطمئن ہو کر بیٹھ گئے،
نہ مستقبل سے متعلق غافل رہے۔ ملازمت کے دوران میں بھی وہ مختلف امتحانوں میں
بیٹھے اور کامیاب ہوتے رہے جس سے بتدریج عہدے میں بھی ترقی ہوئی، اور تنخواہ میں بھی۔
۱۹۳۲ء میں جب وہ ملازمت سے سبکدوش ہوئے ہیں، تو کنسٹرل پی، ڈبلیو، ڈی کے
دفتر میں اسسٹنٹ اکاؤنٹ افسر تھے۔
پہلی بیوی کی وفات کے بعد ۱۹۰۰ء میں شہباز بیگ کی دوسری شادی میرزا محمود حسین
بیگ وکیل ریاست جاورہ کی صاحبزادی نذیر بیگم سے ہوئی۔ میرزا محمود حسین بیگ
بھی ان کے یک جدی اور میرزا اراب بیگ ہی کی ایک دوسری شاخ کے چشم و چراغ
تھے۔ اس بیگم سے میرزا شہباز بیگ کے ماشاء اللہ دس لڑکے اور چار لڑکیاں ہوئیں۔
ان میں سے دو لڑکے صغر سنی میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ چونکہ انھوں نے تعلیم کے
فوائد کا اپنی زندگی میں تجربہ کیا تھا اور یہ انھوں نے خود اپنے زور بازو سے حاصل
کی تھی، اس لیے میرزا شہباز بیگ نے اپنے سب بچوں کی تعلیم پر خاص توجہ کی۔
میرزا محمود بیگ بیٹوں میں تیسرے تھے، ان سے دو بڑے بھائی میرزا داؤد بیگ اور
میرزا مسعود بیگ تھے۔ میرزا محمود بیگ ۲۰ اگست ۱۹۰۸ء کو دلی میں پیدا ہوئے۔
چونکہ وہ اپنے والد کے ساتھ رہے، اس لیے ان کی تعلیم انھیں شہروں میں ہوئی،

جہاں وہ مختلف اوقات میں تعینات رہے۔ چنانچہ انھوں نے دسویں درجے کا امتحان ۱۹۲۳ء میں ہزنگ ہائی اسکول، لاہور سے پاس کیا، جہاں اس زمانے میں ان کے والد کاؤنٹنٹ جنرل کے دفتر میں ملازم تھے۔ اس امتحان میں وہ پہلے درجے میں پاس ہوئے اور اپنے اسکول میں اوّل آئے۔ اس کے بعد اگرچہ انھوں نے لاہور کے فورمین کرسچین کالج میں داخلہ لے لیا تھا، لیکن سال بھر بعد والد کا تبادلہ دلّی ہو گیا، لہٰذا یہاں آ کر وہ اینگلو عربک کالج کے انٹر (سال دوم) میں داخل ہو گئے۔ لیکن اس اول بدلی اور یہاں سائنس کے مضمون کی پڑھائی کا انتظام نہ ہونے کے باعث فیل ہو گئے۔ یہ ناکامی "تازیانہ ثابت ہوئی، اس کے بعد انھوں نے خوب محنت کی اور ۱۹۲۷ء میں انٹر کا امتحان اس امتیاز سے پاس کیا کہ پوری یونیورسٹی میں اوّل آئے۔ اب انھوں نے دلّی کے پرانے کالج سان سٹیفنس میں داخلہ لے لیا اور یہاں سے ۱۹۲۹ء میں بی، اے اور ۱۹۳۱ء میں ایم اے (فلاسفی) کی اسناد حاصل کیں؛ ان دونوں میں بھی پہلا درجہ حاصل کیا، اور یونیورسٹی بھر میں کامیاب طلبہ میں اوّل آئے۔

تعلیمی ریکارڈ اتنا اچھا رہنے کے بعد ملازمت ملنے میں کیا مشکل ہو سکتی تھی! کوئی سال سوا سال حکومت ہند کے محکمۂ تعلیم میں ملازمت کرنے کے بعد اکتوبر ۱۹۳۲ء میں جگہ نکلنے پر اپنے (اینگلو عربک) کالج ہی میں فلاسفی کے مدرّس مقرر ہو گئے اور پندرہ برس یعنی ستمبر ۱۹۴۷ء تک اس عہدے پر متمکن رہے۔

تقسیمِ ملک کے بعد کالج کا نام بدل کر "دلّی کالج" رکھ دیا گیا۔ چنانچہ ستمبر ۱۹۴۷ء میں بیگ صاحب اس کے نئے پرنسپل مقرر ہوئے اور یوں سترہ برس، یعنی ستمبر ۱۹۶۴ء تک کالج کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں رہی۔

دلّی کالج کو ان کے زمانے میں بہت ترقی ہوئی، کیا بلحاظ نظم و نسق کے، اور کیا بلحاظ تعداد طلبہ اور نتائج کے؛ یہ دلّی یونیورسٹی کے ممتاز کالجوں میں شمار ہونے لگا۔ اس کامیابی کا سہرا بجا طور پر بیگ صاحب کے سر تھا۔ وہ خود بھی اب ہر جگہ تعلیمی مسائل میں معتبر اور ذی قدر خیال کیے جانے لگے۔ چنانچہ مدتوں دلّی یونیورسٹی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ

کے انتظامی اداروں کے رکن رہے۔ دلّی کے باہر اجمیر، بھوپال اور بھوبنیشور کے تعلیمی اداروں کی انتظامیہ کے بھی رکن تھے۔

اکتوبر ۱۹۶۲ء میں حکومتِ ہند نے ایک تعلیمی وفد مصر بھیجا تھا۔ میرزا محمود بیگ اس وفد کے سربراہ تھے۔ مصر کے بعد یہ وفد مشرقِ وسطیٰ کے دوسرے ممالک، سوڈان، عربیہ السعودیہ، اُردن، لبنان، شام، عراق، ایران بھی گیا تھا۔

۱۹۶۴ء سے ۱۹۶۶ء تک وہ ریاست جموّں و کشمیر کے تعلیمی مشیر رہے، اور پھر جموّں کشمیر یونیورسٹی کے بہرۂ کشمیر کے پرو وائس چانسلر کے عہدے پر بھی فائز رہے (۱۹۶۶-۱۹۶۸ء) سب سے آخر میں وہ دلّی یونیورسٹی کے مراسلاتی نصاب اسکول کے پرنسپل مقرر ہو گئے تھے۔

دل کا پہلا دورہ ۱۹۷۲ء میں پڑا۔ بہت دن زیرِ علاج رہے اور بفضلہٖ بچ نکلے۔ اس کے بعد کچھ احتیاط تو کرتے رہے، لیکن ان کی زندگی کے معمولات میں بہت کم فرق آیا۔ ۱۴ دسمبر ۱۹۷۵ء کو عید الاضحیہ تھی۔ اس دن صبح سے شام تک عید ملنے والوں کا ہجوم رہا۔ حسبِ معمول دوستوں کی آؤ بھگت اور خاطر مدارات میں مشغول رہے۔ یوں تمام دن آرام کا ایک لمحہ نہ نصیب ہوا۔ رات گئے جب بستر پر لیٹے ہیں، تو تکان کے مارے بالکل نڈھال ہو چکے تھے۔ اگلی صبح ۱۵ دسمبر ۱۹۷۵ء ساڑھے سات بجے صبح کے قریب دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ روح سوتے میں قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی ہے۔ اِنّا لِلّٰہ وَ اِنّا الیہ راجعون جنازہ اگلے دن ۱۶ دسمبر کو اٹھا اور انھیں جامعۂ ملّیہ اسلامیہ، جامعہ نگر کے قبرستان میں اپنے والد کے پہلو میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ ساری عمر شادی نہیں کی، لاولد فوت ہوئے۔ رہے نام اللہ کا۔

ان کے دوست غلام احمد علمی نے قطعۂ تاریخِ وفات کہا:-

بلبلِ دلّی پرواز کرد از چمن ہمچو بوئے گل و یاسمین و سمن
گشت بادِ اجل شمعِ علم و ادب کرد بے نور ہر محفل و انجمن
رفت یوسف ز کنعاں بباغِ ارم گشت دلّی ہمہ بیت الحزن

زیست محمود، محمود رفت از جہاں برروانش بود رحمت ذوالمنن

سال فوتش بگفت علمی نکتہ سنج

"اہلِ بینش، نکوکار، شیریں سخن"

(۱۹۷۵)

شرف، دلّی کی کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی زبان اور لب و لہجے پر جیسی قدرت انہیں حاصل تھی، اور بےتکلف احباب کی مجلس میں جس طرح وہ چہکتے تھے، وہ بیان کرنے کی نہیں دیکھنے اور سننے کی چیز تھی۔ سچ مچ "وہ کہیں اور سنا کرے کوئی"، کا سماں بندھ جاتا تھا۔ انھوں نے تصنیف و تالیف کو اپنا پیشہ نہیں بنایا۔ اور اس سے ادب اور تاریخ دونوں کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ دلّی کی پرانی تہذیب، یہاں کے رسم و رواج، رہن سہن سمجھنا علم انھیں تھا، کاش کہ وہ اسے محفوظ کرجاتے۔ وہ برسوں ان موضوعات پر آل انڈیا ریڈیو سے چھوٹی چھوٹی تقریریں نشر کرتے رہے۔ جن لوگوں نے یہ تقریریں سنی ہیں، وہی کچھ ان کا لطف جانتے ہیں۔ ان کی زبان کا لوچ اور اُتار چڑھاؤ، روزمرّہ کی چاشنی، گھریلو اندازِ بیان، ہلکا سا مزاح کا رنگ۔ بھولنے کی چیز نہیں۔ ان کی ۱۴ تقریروں کا ایک بہت ہی مختصر مجموعہ "بڑی حویلی" کے عنوان سے چھپا تھا (دلّی ۱۹۶۹ء) جو صحیح معنوں میں بقامت کہتر و بقیمت بہتر کا مصداق ہے۔ وفات کے بعد ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بارے میں ۱۳ ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ "دلّی اٹھارہ سو ستاون کی" کے عنوان سے چھپا (دلّی ۱۹۷۶ء)۔ یقیناً ابھی اور بہت سی تقریریں ہونگی۔

نجم آفندی، میرزا تجمّل حسین

مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ میرزا جعفر علی فصیح اپنے عہد کے چار نامی مرثیہ گو شعرا میں سے تھے۔ بقیہ تین تھے: خلیق اور ضمیر اور دلگیر۔
فصیح کے والد مرزا مہدی علی فیض آباد کے محلہ "مغلپورہ" میں رہتے تھے۔ فصیح کے علاوہ ان کے دو اور بیٹے تھے: بلیغ اور جلیس۔ فصیح ۱۷۸۰ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ آخر عمر میں ہجرت کر کے مکۂ معظمہ چلے گئے تھے؛ وہیں وفات پائی۔
بفیض فصیح کے برادر خرد میرزا نجف علی بلیغ اور بلیغ کے بیٹے میرزا ملیح بھی شاعر اور مرثیہ گو تھے۔ میرزا ملیح کے بڑے بیٹے میرزا عاشق حسین مرحوم بزم آفندی ہوئے، جو اس سلسلۃ الذہب کے لیے بھی باعث فخر تھے۔
بزم ۱۸۶۰ء میں کٹرۂ حاجی حسن، آگرے میں پیدا ہوئے۔ شاعری گویا ان کی گھٹی میں پڑی تھی، بہت کم عمری میں شعر کہنے لگے۔ جب نیک و بد کی تمیز ہوئی، تو اپنے حقیقی ماموں سید اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی (ف: اگست ۱۸۸۰ء) سے مشورہ کرنے لگے۔ منیر خود فنِ مرثیہ میں دبیر کے شاگرد تھے، اور غزل میں ناسخ کے۔
بزم نے اپنی زندگی میں بہت کچھ کہا، لیکن افسوس کہ اس میں سے بہت کم شائع ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ غزلیات کے سات دیوان تھے، لیکن ان میں سے صرف دو، چراغِ بزم اور دیاغِ بزم، منصۂ شہود پر آئے۔ سیکڑوں مرثیے کہے تھے، سلام، قصائد، رباعیات، ان کے

علاوہ، رباعیات کا ایک مختصر انتخاب کسی زمانے میں دلّی سے شائع ہوا تھا۔ بزم نے ایک "مولودِ معراج" خواجہ حسن نظامی (ف: جولائی ۱۹۵۵ء) کی فرمائش پر کہا اور ایک مختصر اجتماع میں درگاہ حضرت نظام الدین اولیا میں سنایا۔ خواجہ صاحب مرحوم نے اسی مجلس میں بزم کو "معراج الشعرا" کا خطاب عطا کر دیا۔ بزم کا ۲۳ مارچ ۱۹۵۲ء کو ۹۳ برس کی عمر میں آگرے میں انتقال ہوا۔

میرزا اجمل حسین نجم آفندی انھیں بزم آفندی کے بیٹے تھے۔ رمضان ۱۳۱۰ھ (مارچ/ اپریل ۱۸۹۳ء) میں آگرے میں پیدا ہوئے۔ اردو، فارسی، عربی کی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اور ان زبانوں میں اچھی استعداد پیدا کرلی۔ چندے مفید عام اسکول، آگرہ میں حاضری دی، اور یہاں سے مڈل (آٹھویں) کی سند لی، جس سے انگریزی میں بھی کچھ شُد بد ہوگئی تھی۔

جس ماحول میں ان کی پرورش اور نشوونما ہوئی، اس میں شعر گوئی لابد تھی۔ چنانچہ دس بارہ برس کے سن میں شعر کہنے لگے۔ مشورہ اپنے والد بزم آفندی سے رہا، اور ان کے سوائے کسی سے اصلاح نہیں لی۔ روزگار کا مسئلہ پیش آیا، تو ریلوے کے محکمے میں ملازمت مل گئی، اور ۱۹۱۲ء میں دلّی میں تعینات ہوگئے۔ یہاں سائل اور بیخود اور رام نانھو ساحر کی صحبت میسّر آئی۔ تینوں اہلِ زبان اور صاحبِ علم و فن بزرگ تھے؛ نجم نے ان سے بہت کچھ سیکھا اور خود استادی کا درجہ حاصل کرلیا۔ دلّی کے چند سالہ قیام کے بعد ان کا تبادلہ غازی پور ہوگیا۔ یہاں نجم نے ایک مجلس" انجمن شبابِ سخن" کے نام سے قائم کی۔ اس انجمن نے ان اطراف میں اردو کی اچھی خدمت سرانجام دی؛ اس کے زیرِ اہتمام برسوں ہر مہینے مشاعرہ ہوتا رہا۔

آل انڈیا شیعہ کانفرنس ان دنوں عروج پر تھی۔ ہر سال اس کے سالانہ اجلاس بڑے بڑے شہروں میں ہوتے اور صفی لکھنوی مرحوم (ف: جون ۱۹۵۰ء) ان میں اپنی تاریخی نظمیں پڑھا کرتے تھے۔ کانفرنس کا ۱۹۱۵ء کا اجلاس (۱۵ تا ۱۷ اکتوبر) الٰہ آباد میں ہوا تھا۔ اس اجلاس کی صدارت آنریبل سید ابوجعفر (راجا پنڈراول) نے کی تھی۔ اس جلسے میں

نجم آفندی نے اپنی نظم "درِ یتیم" پڑھی۔ نظم بہت کامیاب رہی اور اس کے ایک ایک مصرع کو بار بار پڑھوایا گیا۔ نظم ختم ہونے پر کئی حضرات نے انھیں گود میں اٹھالیا۔ حضرت عزیز لکھنوی اور محشر لکھنوی کے نے جو جلسے میں موجود تھے، انھیں ایک ایک طلائی تمغہ دینے کا اعلان کیا؛ ایک طالب علم سید صابر حسین نے اپنی طرف سے نجم آفندی کو ایک گھڑی پیش کرنے کا وعدہ کیا۔ غرض بہت جوش وخروش تھا۔ فیصلہ ہوا کہ نظم نیلام کی جائے۔ مختلف احباب نے بولی دی اور آخری بولی (۱۸۰۰ روپے) صاحب صدر راجا سید ابو جعفر پر ختم ہوئی۔ بعد کو چونکہ یہ روپیہ داخل یتیم خانہ کرنے کی رائے ہوئی لہذا حسب تجویز جناب صدر قرار پایا کہ ہر شخص جو بولی بولا ہے، وہ اپنا روپیہ ضرور داخل کرے۔ اس طرح سے اس نظم کی قیمت (۵۶۵۰) روپیہ وصول ہوئی، جو یتیم خانہ (قائم شدہ ۱۹۱۲ء) کو دے دی گئی۔ (یہ نظم نجم آفندی کے پہلے مجموعۂ کلام "پھولوں کا ہار" میں شامل ہے)

یہ ملک میں سیاسی تحریک کے شباب کا زمانہ تھا۔ انگریزوں سے ترک موالات کا غلغلہ بلند ہوا۔ نجم آفندی شروع سے انگریز دشمن اور وطن دوست رہے تھے۔ دفتر میں ان کا افسر ایک انگریز بنو من تھا۔ ایک دن وہ ان کی کھدر پوشی پر معترض ہوا۔ نجم نے دوبدو جواب دیا، تو بطور سزا ان کا تبادلہ آسنسول کر دیا گیا۔ اسی زمانے کی ایک غزل کا مقطع ہے:

جینا ہے حصار سحر و شام میں اے نجم!
بنگالے میں گھر ہو کہ دو آبے میں بسر ہو

بعد کو جب سرکاری ملازمتوں کے ترک کرنے کا سوال اٹھا، تو انھوں نے بھی ریلوے کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اور ردولی چلے گئے۔ یہاں ان کا تین سال قیام رہا۔ (شیخ جعفر مہدی ارزم ردولوی، مشہور شاعر اور مرثیہ گو، اسی زمانے میں ان کے شاگرد ہوئے تھے) ردولی سے وہ آگرے آگئے؛ یہاں وقت بہت پریشانی میں گزرا۔ کسب معاش کے لیے انھوں نے ہر طرح کے پاپڑ بیلے۔ ایک ماہنامہ "مشورہ" جاری کیا، تجارت کی؛

زراعت بھی کی۔ لیکن ہر جگہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ آخر تنگ آکر انھوں نے دکن کی راہ لی، اور حیدرآباد میں رخت سفر کھول دیا۔ بارے، نصیبا یاور تھا۔ نظام سابع میر عثمان علی خان مرحوم کے چھوٹے بیٹے شاہزادہ معظّم جاہ شجیع کے دربار سے وابستہ ہو گئے، اور منجملہ اور اصحاب کے وہ ان سے بھی مشورہ کرنے لگے۔ اس کے بعد ہر زہ گردی ختم ہو گئی۔ حیدرآباد میں ۳۰ برس قیام رہا۔ ۱۹۷۱ء میں اپنے چھوٹے بھائی سلیمان میرزا ا کوکب آفندی سے ملنے کراچی چلے گئے۔ جب واپسی کا عزم کیا تو عزیز و اقارب اور عقید تمند احباب نے اصرار کیا کہ اب یہیں قیام کیجیے، حیدرآباد جا کے کیا کیجیے گا۔ در اصل وہاں کی مٹی نصیب میں لکھی تھی۔ وہیں اتوار ۲۲ دسمبر ۱۹۷۵ء ۱۷ ذی الحجہ ۱۳۹۵ھ) بوقت ساڑھے نو بجے صبح انتقال ہوا۔ اسی دن قبرستان سخی حسن دربار (نارتھ ناظم آباد) میں دفن ہوئے۔

نجم آفندی نے بہت بڑا ذخیرہ اپنی یادگار چھوڑا ہے؛ ۲۵-۲۶ مطبوعہ کتابیں موجود ہیں، اور جو غیر مطبوعہ رہ گیا، وہ بھی کچھ کم نہیں ہوگا؛ انھیں میں غزلیات کا دیوان بھی ہے۔ ان کے دو مرثیے "معراج فکر" اور "فتح مبیں" بڑے معرکے کے ہیں؛ ان میں انھوں نے بکا کے پہلو سے زیادہ فلسفۂ شہادت اور حضرت امام حسین اور ان کے رفقائے عالیمقام کے کردار کی عظمت اور ان کے پیغام پر زور دیا ہے۔ ان کے سلام بھی بہت بلند پایہ ہیں۔ یہی حال رباعیات (تہذیب موّدت) کا ہے، جن میں ان کے حکیمانہ اور متفکرانہ اور فلسفیانہ انداز کا بہترین امتزاج ملتا ہے۔ ذیل میں چند شعر ان کی غزلوں کے ملاحظہ ہوں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نجم کا اصلی میدان مرثیہ، رباعی اور سلام ہے۔ انھوں نے ہندی میں بھی کہا ہے۔ غزل میں شاید انھیں مورخ ادب کوئی مقام نہ دے سکے۔

ہر اک زبان پہ چرچا ہے سرفروشوں کا
اجل کے سایے میں کیا زندگی نکھر آئی

عذاب ہو گئی راہِ ثواب، ارے توبہ!
ہزار بار طبیعت گناہ پر آئی

کسے اب اعتبارِ گردشِ ایام آتا ہے
تمھارے بعد دیکھیں کس کے لب تک جام آتا ہے

گزرتی ہے حیات، اک جادۂ مرگِ مسلسل سے
بڑی مشکل سے اربابِ وفا میں نام آتا ہے

بدل دیتی ہے دنیا، مختلف مفہوم و معنی ہیں

جب آتا ہے اُدھر سے، ایک ہی پیغام آتا ہے

یہ موت ہوگئی، اے دوست! زندگی نہ رہی

جو دل میں کوئی تمنا بری بھلی نہ رہی

حقیقتوں کی کسی وقت بھی کمی نہ رہی

تصورِ فکر و نظر ہے، جو تشنگی نہ رہی

پڑا رہا ہے عداوت پہ عمر بھر پردہ

مگر نگاہِ محبت کبھی چھپی نہ رہی

وہ گھڑی، عیش مصلا چھوڑ دے اُٹھ کوئی ٹوٹا ہوا دل جوڑ دے

تا کُجا محراب و منبر کی پناہ دستِ باطل، حق کا دامن چھوڑ دے

یوں نہ جی، اُو ناشناسِ زندگی! گو دمیں انسانیت دم توڑ دے

موت برحق ہے، تو بن جا حق پرست موت سے پہلے ہی کیوں جی چھوڑ دے

نجم! کچھ لفظی تکلف چاہیے بات وہ کیا، جو کلیجا توڑ دے

بھری بہار تھی، پھولوں میں آشیانا تھا

میں سوچتا ہوں، حقیقت تھی یا فسانا تھا

ملال کس کو ہے، دشمن نہیں، وہ دوست سہی

مجھے کسی نہ کسی سے فریب کھانا تھا

ساری دنیا اک فریبِ جلوۂ جانانہ ہے

یہ حرم ہے دُور سے، نزدیک سے تبخانہ ہے

وقت کا میری طرح، ان کو بھی شکوہ ہے، مگر

میرے شکوہ کا ذرا انداز بیباکانہ ہے

پرسشِ احوال پر جز شکر کچھ کہتے نہیں

بوریے پر بھی مزاجِ اہلِ دل شاہانہ ہے

یہ منزل ہے حسابِ دوستاں کی کہونگا کچھ نہ قلبِ دوستاں کی
لٹا دیتے جو دولت آشیاں کی چمن کی آبرو محفوظ رہتی

میکدے میں مرے ساتھی تھے، ہمدرد بھی تھے
جب سے مسجد میں ٹھکانا ہے، اکیلا ہوں میں

ہر جادہ و منزل میں ہے سجدے کی ادا اور
معبد کی فضا اور ہے، مقتل کی فضا اور
اللہ گلا کر کے میں پچھتا رہا ہوں کیا کیا
جب ختم ہوئی بات کہیں، اس نے کہا: "اور"

طالب رزّاقی، محمد قطب الدین حسن قادری

ان کا خاندان یوپی کے مردم خیز مقام دریا باد (ضلع بارہ بنکی) کا رہنے والا تھا، جہاں سے ان کے والد جناب الحاج محمد یوسف قادری ہجرت کر کے حیدر آباد (دکن) چلے گئے تھے۔ محمد یوسف قادری مرحوم، مولانا عبدالماجد دریا بادی (ف ۶ جنوری ۱۹۷۷ء) کی سگی پھوپی (محبوبن) کے بیٹے تھے، ان کے والد کا نام فضل رب تھا۔ اس طرح گویا رشتے میں طالب رزّاقی مرحوم مولانا عبدالماجد دریا بادی کے بھتیجے تھے۔

الحاج محمد یوسف قادری صوفی منش بزرگ تھے۔ اردو، فارسی کا اچھا ذوق تھا۔ حیدر آباد میں انھوں نے اولاً حکومت وقت کے محکمۂ مال میں ملازمت اختیار کی۔ بعد کو راجہ شیو راج بہادر کی جاگیر کے انتظامیہ میں اچھے خاصے ذمّہ دار عہدے پر تقرر ہو گیا۔ ان کا اس صدی کے پانچویں دہے میں انتقال ہوا ہے۔ درگاہ حضرت شاہ خاموش (حیدر آباد) کے ملحقہ قبرستان میں مدفون ہیں۔ خود بھی کچھ پیری مریدی کا سلسلہ قائم کر لیا تھا۔

طالب رزّاقی یکم جولائی ۱۹۲۱ء کو حیدر آباد ہی میں پیدا ہوئے۔ افسوس کہ تعلیم کی تکمیل نہ کر سکے۔ بسنو زبائی اسکول کے درجوں میں تھے کہ خدا معلوم کیوں وہاں سے بھاگ نکلے۔ اس کے بعد جو کچھ بھی حاصل کیا، اپنے نجی مطالعے سے، اور یوں خاصی استعداد مہیا کر لی تھی۔

شاعری کا شوق اسکول کے زمانے ہی میں پیدا ہوا۔ ان کے بزرگوں میں حضرت شاہ عبدالرزاق ہوئے ہیں، جن کا مزار بانسہ شریف (ضلع بارہ بنکی) میں موجود ہے اسی سے اپنے نام کے ساتھ "رزاقی" لاحقہ کا اضافہ کیا۔ ابتدا میں فانی بدایونی (ف: اگست ۱۹۴۱ء) کی شاگردی اختیار کی۔ ان کے انتقال کے بعد پانچ برس تک حضرت حیرت بدایونی (ف: فروری ۱۹۷۵ء) سے کلام پر اصلاح لیتے رہے آخر میں استاد نے فارغ التحصیل قرار دے دیا، اس کے بعد خود ان کے تلامذہ کا حلقہ خاصا وسیع ہو گیا تھا۔ افسوس، کہ ان کا مجموعۂ کلام ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا۔

طالب کی پوری زندگی پریشان حالی میں گزری۔ حیدرآباد ہی میں مختلف جگہ ملازمت کا ڈول بنا، لیکن کہیں مستقل انتظام نہ ہو سکا۔ چندے عثمانیہ یونیورسٹی کے کتابخانے میں بھی ملازم رہے۔ طبیعت کے بہت حسّاس تھے اور حالات سے سمجھوتا کرنا گویا جانتے ہی نہیں تھے۔ ذمّہ داریاں بھی بہت تھیں۔ ان کی شادی حیدرآباد کے ایک خاندانِ مشائخ میں جناب سیّد مومن علی کی صاحبزادی (افضل بیگم) سے ہوئی تھی۔ ان کے بطن سے ماشاء اللہ سات بچّے ہوئے: چار لڑکے اور تین لڑکیاں، انھیں پریشانیوں کے باعث کسی جگہ جم کر کام نہ کر سکے۔ تجارت تک کا تجربہ کیا، لیکن اس میں بھی ناکام رہے۔ ان کے کلام میں حزن اور سوز کا سرچشمہ بھی ان کی مادّی بے اطمینان صورتِ حال میں دیکھا جا سکتا ہے۔

موت موذی مرض کینسر سے ہوئی۔ اس کی تشخیص اس وقت ہوئی، جب معاملہ ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ مقامی کینسر اسپتال میں زیرِ علاج رہے، لیکن بے سود۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۷۵ء کو دوپہر کے وقت اپنے مکان (دبیر پورہ) میں داعیِ اجل کو لبّیک کہی تدفین اگلے دن (یکم جنوری ۱۹۷۶ء) عمل میں آئی اور انھیں بعد نمازِ عصر یاقوت پورہ بشیخ فیض کی کمان بیتغہ کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔ اِنّا لِلّٰہ و اِنّا الیہ راجعون۔

کئی اصحاب نے تاریخِ وفات کہی ۔ خورشید جنیدی کا قطعہ ہے :

ہائے، کیا لٹ گئی بہارِ غزل — سب کی آنکھیں ہیں سوگوارِ غزل
لوگ منھ دیکھتے رہے، خورشید! — "چل بسا شاعر نگارِ غزل"

(۱۹۷۵ء)

ایک قطعے میں عیسوی اور ہجری تاریخ جناب نادری ملتانی نے کہی ۔ ہر ایک مصرعے سے تاریخ برآمد ہوتی ہے :

اٹھ گئے دنیا سے طالب، فکر کرد دل تشنہ کام
ہائے فانی ہو چکا، کیفیتِ حیرت کا جام (۱۹۷۵)
پاک، عالم، قطب رزاقی کی ہے تاریخ وصل (۱۳۹۵)
جنت الفردوسِ رحماں اب ہے طالب کا مقام (۱۹۷۵)

۱۳۹۵

ذیل میں کلام کا مختصر انتخاب بطورِ نمونہ دے رہا ہوں، جو ان کی بیگم کی مرسلہ غزلوں سے کیا گیا ہے :

عاشقی ہے منزلِ شکر و شکایت سے بلند — دوست کام آیا تو کیا، دشمن کام آیا تو کیا

ٹھہر اِدھا، تو فکرِ رہِ پیچ و خم رہی — جب چل پڑا، تو راستہ مشکل نہیں رہا

یہ صبح وصل، یہ تم بے نقاب و زلف بدوش — کبھی تمھیں، کبھی حسن سحر کو دیکھتے ہیں
بہار آئی ہے گلشن میں جب سے، اے طالب! — کبھی قفس کو، کبھی بال و پر کو دیکھتے ہیں

نشاطِ گل نہ سہی، خارِ غم اثر ہی سہی — چمن میں کوئی تو اپنا مزاج داں ہوتا

مآلِ گل تو سے واقف اگر ہو — کلی سے تبسم کیا جائے نا
نہیں عشقِ معصوم، ہر اک کے بس کا — بہ ہر آدمی سے کیا جائے نا

یہ دل ہے، ہر اک کو دیا جائے نا — جسے دے دیا، پھر لیا جائے نا
بغیر اذنِ ساقی، پیا جائے نا — گنہ بے تکلف کیا جائے نا
وہ میکش ہوں، نیت سبو در سبو ہے — پیالا پیالا پیا جائے نا

محبت میں ہے فرض، مر مر کے جینا — وہ مر جائے، جس سے جیا جائے نا
جو ہونا ہے، وہ خود بخود ہو رہا ہے — جیسے جا رہے ہیں، جیا جائے نا
وہ دل اک نظر کے عوض دے دیا ہے — جو دو جگ کے بدلے دیا جائے نا

یہ کہتی ہے، طالب! مرے دل کی دھڑکن
ترا نام مجھ سے لیا جائے نا

دل طالبِ غم ہو کہ نظر طالبِ جلوہ — مفہومِ طلب، عشق میں دریوزہ گری ہے

ناراض جہاں، بخت خفا، آپ بھی ناخوش — سانسوں کا تسلسل، کوئی جینا تو نہیں ہے

ترا غم جان کے، ہر غم کو دیا دل کا لہو — میں محبت ہوں، مجھے دادِ وفا دی جائے

نہ پوچھو جلوۂ باطل میں ہے کتنی کشش، طالب! — حقیقت اتنی مبہم ہے کہ پہچانی نہیں جاتی

وہ ایک یاس کہ جس سے ڈر رہے ہو مجھے — وہ ایک یاس بھی راس آ گئی، تو کیا ہوگا!

نہ ہر درد و غم سے ہم کب کے مر گئے ہوتے — وہ تو آبردِ دل اعتبار فرد لائے

میکدہ ہے یہ، طالب! کھل کے گفتگو کیجے — اجنبی نہیں کوئی، سب ہیں جانے پہچانے

کیسی بہار، کیسی خزاں، کیا غم و نشاط — اف رے فریب، زندگی مستعار کا
میں اختیار پا کے بھی، بے اختیار ہوں — کتنا حسین جبر ہے پروردگار کا
تم بے نیازِ درد ہو، دل آشنائے درد — تم اختیار کے ہو، نہ دل اختیار کا

جذبۂ چارہ گری ہے، نہ مروت نہ خلوص — پرسشِ حالِ دلِ زار سے ہوتا کیا ہے!

جو دردِ وفا سے عاری ہو، احساس کی دولت جس میں نہ ہو
اس دل کو کہے کیا دل کوئی، وہ آدمی انساں کیا ہوگا!

دل میں تپش، جگر میں خلش، آنکھ میں سرشک — یہ نعمتیں ملی ہیں مجھے، زندگی کے ساتھ
جب اس جہاں میں رنج و خوشی کو نہیں قیام — یہ زندگی گزار دے، زندہ دلی کے ساتھ

اشاریہ

۱۔ اشخاص

(کسی عدد کے نیچے خط یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس صفحے پر وہ نام ایک سے زیادہ مرتبہ آیا ہے)

ش

ص

ض

ط

ظ

ع

ق

ک

گ

مطبوعات
(کتب و رسائل)

الف مقصورہ

ش

ص

ط

ع

غ

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس دریا گنج دہلی 11eC02